سلسلۂ تجدید دین (۴)

تجدیدِ معاشیات

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ

خلیفۂ اقدس

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمہما اللہ تعالیٰ

المکتبۃ الاشرفیۃ
جامعہ اشرفیہ
فیروز پور روڈ لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

دیباچہ

سلسلۂ تجدید سے متعلق مستقل تالیفات کی اصل تجویز میں چوتھی آخری کتاب "تجدید سیاسیات" تھی لیکن یکایک خیال آیا کہ انقلاب روس کے بعد سے دین کے حق میں معاشیات کا فتنہ سیاسیات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہو رہا ہے بلکہ خود سیاسیات معاشی نعروں کا ضمیمہ بن کر رہ گئی ہیں اس لئے تجدید کے صلاحی و اصلاحی مقصد کے مدّ نظر معاشیات کا معاملہ اہم و اقدم ہو گیا ہے۔

اپنی مشکل دہری تھی ایک طرف معاشیات کو اس "بطنی عہد" نے مستقل عظیم الشان علم و فن بنا دیا ہے جس پر اردو انگریزی دو چار کتابیں اِدھر اُدھر سے پڑھ لینے کے آگے کوئی خاص علمی درک و مطالعہ نہیں دوسری طرف علم دین میں بھی اپنی بضاعت نہ ہونے ہی کے برابر، بس فہم قرآن سے کچھ ٹوٹی پھوٹی مناسبت البتہ اللہ تعالیٰ نے بخش رکھی ہے، جب کوئی خالص علمی و دینی ہی نہیں عملی و دنیوی مشکل بھی پیش آتی ہے تو "ارنا الحق حقًا" کی دعا کے ساتھ راہِ حق پہلے براہِ راست کلامِ حق ہی میں تلاش کرتا ہوں اور الحمد للہ اکثر کامل شرح صدر کے ساتھ دیر سویر مل جاتی ہے۔ پھر اسی سہارے تکمیل مدعا کی غرض سے دینی و علمی معلومات کچھ اور فراہم کر لئے جاتے ہیں۔ خصوصًا اگر حضرت مجدد وقت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کی بھی کوئی تحقیق اس باب میں ہاتھ آجاتی ہے تو پھر تو شفاء

تام کے لئے سونے میں سہاگہ ہو جاتا ہے۔

تلاوت کے پہلے ہی دورہ اور پہلی ہی سورۃ (البقرہ) میں علم وظن کے بالکل خلاف بڑا عظیم واساسی انکشاف یہ ہوا کہ معاشیات اسلام کی بنیاد کسب معاش یا "پیدائش دولت" کے بجائے "استعمال دولت" یا انفاق پر ہے اور یہی تمام معاشی مسائل ومشکلات کا اصولی وقرآنی بے خطا اسلامی حل ہے پھر کیا تھا گاڑی چل پڑی اور حدیث وفقہ وغیرہ سب سے تائیدی مواد بے تکلف ملنے لگا۔ کسر ایک ہی نظر آئی۔ خصوصاً سلسلۂ تجدید کے نقطۂ نظر سے کہ اس بالکل نو پیدا بیسویں صدی کے ربع ثانی کے فتنہ پر ایک قصباتی مسجد وخانقاہ کے معتکف کی نظر کیا گئی ہو گی۔ چنانچہ تمہیدی ابواب کی تحریر اسی غلط فہمی کے ساتھ شروع بھی کر دی۔ بعد کو خیال آیا کہ "یہی خوش فہمی" تو ابتداءً گو کم درجہ میں سہی، سیاسیات کے باب میں بھی تھی کہ ایک زاویہ نشین جو کہنا چاہئے کہ ایک اخبار تک نہیں پڑھتا، "لاکھ مجدد وقت" ہو سیاسیات حاضرہ کی خرافات پر ایسی کیا نظر ہو گی کہ کوئی تجدیدی واصلاحی رہنمائی مل سکے۔ تاہم چونکہ خلافتِ کانگریس، لیگ وغیرہ کے معاملات میں حضرت کا ایک خاص مسلک تھا۔ اول اول اس کو سمجھنے کیلئے۔ وہ بھی فی الجملہ بے اعتقادی کے ساتھ۔ حضرت کی کچھ چیزیں پڑھیں تو آنکھیں کھل گئیں کہ بالکلیہ جہل مرکب کا شکار تھا۔ خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اور بالآخر معارفؔ[1] کی کئی قسطوں کا لمبا چوڑا "مقالہ قومیات وسیاسیات حاضرہ" کے نام سے اور تمامتر خاص تجدیدی واصلاحی نقطۂ نظر سے حضرت ہی کی تجدیدات پر مبنی تیار وشائع ہو گیا۔

---

[1] دسمبر ۱۹۴۶ء وجنوری وفروری ۱۹۴۷ء

تجدید معاشیات کے تمہیدی ابواب ابھی الفرقان میں نکل ہی رہے تھے کہ اس گذشتہ "خوش فہمی" پر متنبہ ہو کر حضرت کی چیزیں پڑھنا شروع کیں تو کیا عرض کروں کہ جہل مرکب پر ندامت ہی نہیں بار بار غصہ آرہا تھا کہ اتنا بھی نہ خیال آیا کہ "مجدد وقت" کو جو علیم و خبیر خاص کر اپنے دین کی تجدید و اصلاح ہی کے لئے مبعوث فرماتا ہے وہ وقت کے اتنے بڑے فتنہ کے معاملے میں خود اپنے علم و خبر کی تائید سے اس کی کیسے مدد نہ فرماتا۔ پھر کیا ہوا کہ الحمد للہ کتاب کا سب سے بڑا اور عملی و اصلاحی اعتبار سے سب سے اہم باب۔ معاشیاتِ ایمان۔ کم و بیش بالکلیہ وقت کے مجدد اور امت کے حکیم کی حکیمانہ تجدیدی اصلاحات ہی پر لکھ گیا۔ جو انشاء اللہ اہل ایمان کے حق میں "عمل صالح" کی معاشی زندگی گذارنے کے لئے قدم قدم پر مشعل راہ ثابت ہوگا شرط بس عمل ہی ہے۔

اس دولت کے بعد معاشیاتِ جدیدہ میں اپنی علمی فنی ناداری کا بھی چنداں غم نہ رہا کہ اسلام اور اسلام کی کتابِ ہدایت کا اصل مقصود علمی و فنی تحقیقات اور نظریات بازی نہیں بلکہ ہدایت و رہنمائی ہے اور معاشی علم بھی سچ پوچھئے تو کام کا وہی ہے جو معاشی عمل میں قدم قدم پر کام آئے اور فقر و غناء ہر حال میں دل کا سکھ چین بخشے۔

البتہ راقم عاجز کے نجی حالات شامت اعمال کی بدولت عرصہ سے کچھ ایسے ناہموار و ناسازگار چل رہے ہیں کہ جو کتاب بہت سے بہت ایک سال کی تھی وہ سالوں میں بڑے لمبے لمبے وقفوں اور بڑے انتشار طبع کے ساتھ پوری ہوئی کیا زبردستی کی گئی، تاہم اصولی و معنوی اعتبار سے از ابتداء تا انتہاء پورا راستہ "ذلک الکتاب" ہی کی لاریب ہدایت بخشی" میں اس طرح پورے شرح صدر کے ساتھ طے ہوا کہ کہیں کسی خار و خلش سے دامن الجھا نہیں۔ فللہ الحمد

فی الآخرۃ والاولیٰ۔

لیکن مبیضۂ کتاب پر جب نظر کی تو صوری لحاظ سے طبیعت کے مسلسل انتشار کا اثر نمایاں نظر آیا۔ محب قدیم و مخدوم جدید مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سلمہٗ ماشاء اللہ ہمہ گیر رنگ کے پختہ کار و انشا پرداز مصنف ہی نہیں بلکہ تصنیف و تالیف کے خصوصًا جدید اصول و آداب کے بھی بڑے رمز شناس ہیں مگر ہیں بقول خود ،، یک انار و صد بیمار،، ورنہ جی تو اب یہ چاہا کرتا ہے کہ اپنی ہر ہر سطر ان کی نظر سے گذر جایا کرے۔ پھر بھی قریبًا نصف صدی کی نیازمندیوں کا ٹیکس کچھ نہ کچھ وصول ہی کرتا رہتا ہوں۔

بالخصوص یہ کتاب جیسے ذہنی عدم اطمینان کے عالم میں پوری ہوئی اس کی بناء پر تمہید و تتمہ کے چند ابواب کے سوا پورا مبیضہ بھیج دیا تھا۔ معنوی حیثیت سے تو کہنا چاہئے کہ پورا ہی اتفاق فرمایا۔ یعنی ستر ۷۰ اسی ۸۰ فیصد جو سچ پوچھئے صد فی صد سے بھی زائد ہی ہے۔ اس لئے کہ آج کل کی سرتاسر بے خدا و بے آخرت کی لادینی معاشیات کی الٹی گنگا میں دین کے بڑے بڑے اہل علم و فہم اس طرح بہے چلے جارہے ہیں کہ بہتوں سے تو تیسرے درجہ کے ۳۳ فیصد نمبروں کی بھی توقع نہیں رکھتا صورت یا انشاء عبارت کی کچھ خامیوں کے علاوہ جو اس ان گڑھ میں ہونی ہی چاہئیں تکرار کے ایک عیب کی خصوصیت سے نشاندہی فرمائی مگر اتنی اور ایسی جو ان کی رائے میں پڑھنے والوں کو محسوس نہ ہوگی۔ تاہم کاپی دیروف دیکھتے وقت عبارت و معنی دونوں میں خود راقم کو اتنی کھلی تکرار نظر آئی کہ دوسرے بھی توجہ سے پڑھنے والے ضرور محسوس فرمائیں گے۔ لیکن کوئی تکرار اپنے سیاق میں تکرار نفع اور بنیادی مطالب کے افادہ و رسوخ سے بحمداللہ خالی نہیں ملی۔ نیز تعداد بھی پانچسو صفحے سے زائد کی کتاب میں اس تکرار کی شاید پانچ چھ باتوں سے

زائد کی نہ ہوگی۔

اصلی مدعا پورے سلسلۂ تجدید کی طرح اس پیشکش چوتھی کڑی کا بھی نظری سے زیادہ خالص کتاب و سنت کی روشنی میں معاشی زندگی کی عملی رہنمائی ہے انفرادی بھی اجتماعی بھی، حکومت کی بھی شہریوں کی بھی اور اگر اسلام کا نام مانع نہ ہو تو مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی بہت کچھ مستفید ہو سکتے ہیں۔ شرط ظاہر ہے کہ سب کے لئے عمل و آزمائش ہی ہے۔ تھوڑا بہت جتنا بھی عمل ہوگا انشاء اللہ اسی کے بقدر ظاہر و باطن دونوں کی معاشی برکت و راحت سے خالی نہ ہوگا۔

ایک ضروری بات سلسلہ ہذا کی نشر و اشاعت کے متعلق ۔۔۔ مؤلف ہذا نہ کوئی مشہور و انشا پرداز صاحب قلم نہ سلسلہ کی کتابیں ناول و افسانہ نہ تاریخ و فلسفہ، نہ کوئی اور عام پسند نظری و علمی موضوع خالص دینی وہ بھی دین کا خالی نظری و کلامی یا باتونی فلسفہ نہیں۔ زیادہ تر عملی و اصلاحی تعلیمات و تجدیدات ان کا بھی رابطہ و رشتہ کسی اجتماعی دعوت و ادارہ سے نہیں۔ غرض دینی کتابوں کی بھی تھوڑی بہت مقبولیت و اشاعت کی جو باتیں ہوتی ہیں ۔۔ سوا خود صاحب سلسلہ کی نسبت و برکت کے۔ کہنا چاہیئے کہ سب ہی ندارد تاہم کتابیں نکلیں توقع سے زیادہ ہی۔ ایک آدھ کے سوا کسی تاجر و ناشر کے پاس، باقی ایک کتاب بھی نہیں رہی۔ لیکن دو چار مستثنیات کو چھوڑ کر حسن معاملت کے جیسے جیسے تجربات اور جیسے حضرات و ادارات سے ہوئے کیا عرض کیا جائے کہ مسلسل تقاضوں کی بے لطفیوں پر بھی غریب مکتبہ تجدید کو مجموعی طور پر اس لاگت سے مشکل ہی کچھ زیادہ پہونچا ہوگا۔

حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کو معاملات و اخلاق اور معاشرت کی تجدید و اصلاح کا جتنا اہتمام اور اس پر جتنا اصرار تھا۔ اس کی قدر ایسے تجربات ہی ہیں قدم

قدم پر ہوتی ہے، بیشمار دینی مدرسوں، طرح طرح کے اسلامی اداروں، دعوتی جماعتوں کا میاب سے کامیاب متکلمانہ انشا پردازیوں اور انشا گفتاریوں کے باوجود ہمارا دین اسلام بیجان نماز روزہ یا اوراد و وظائف سے آگے مشکل ہی سے تجاوز کرتا ہے۔ بےجان اس لئے کہ نہ اس طرح قلبی و باطنی یا اخلاقی تزکیہ و پاکیزگی حاصل ہوتے دیکھی اور نہ ظاہری معاملات یا باہمی حقوق عباد کو درست ہوتے پایا۔ بلکہ "باتونی دین" کی ہر طرف سے بہتات و افراط نے بھی شاید ذوق کچھ ایسا بگاڑ دیا کہ عملی باتوں اور کتابوں کے سننے پڑھنے میں جی ہی نہیں لگتا۔ خود اس سلسلۂ تجدید کی کتابوں میں سب سے زیادہ داد "تجدید تصوف" کی ملی۔ اور اشاعت بھی نسبتاً زیادہ اسی کی ہوئی کہ اس میں نظریاتی چٹخارہ نسبتاً و قدرتاً زیادہ تھا۔

احقر العباد عبدالباری

شبستان قدم رسول ہارڈنگ روڈ

لکھنؤ۔ ۱۳ر صفر ۱۳۷۵ھ و ۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

اگر دمشق کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھی مجھ کو دوکان لگانے کا موقع ملے (جہاں جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کی طرح دوکان خوب چلتی ہوگی) اور روزانہ پچاس دینار کی آمدنی ہو اور سب کی سب (اپنی ذات یا عیش پر نہیں) اللہ کی راہ میں خیرات کر دیا کروں ساتھ ہی کوئی نماز جماعت بھی فوت نہ ہوتی ہو نہ کسی ایسی چیز کو حرام جانتا ہوں جس کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے پھر بھی اس بات کو سخت ناپسند کروں گا کہ ایسے لوگوں میں سے نہ ہوں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیتہ میں ذکر فرمایا ہے کہ :-

رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ط

"وہ ایسے لوگ جن کو فکر معاش یا پیدائش دولت کے مشاغل اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتے"

یہ بیان حدیث کے مشہور راوی حضرت ابو درداء صحابی رضی اللہ تعالیٰ کا ہے اور اسلام سے زمانی و مکانی علمی و عملی ہر طرح کا سب سے بڑھ کر قرب رکھنے والے حضرات صحابہ رضی سے بڑھ کر یہ سمجھنے سمجھانے کا حق کس کو حاصل ہے کہ انسان فکرِ معاش یا پیدائش دولت کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنے پیدا کرنے والے کی یاد و عبدیت کے لئے پیدا کیا گیا ہے (ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون ما ارید منہم من رزق الآیۃ)

معاشیات یا اسی کے تابع سیاسیات کی فنی و اصلاحی تعریف و تحقیق میں نکتہ آفرینیاں جو کچھ بھی کی جاتی ہوں مدعا معاشی فلاح و فراغ کا بہرحال اتنا ہی ہے کہ آدمی کی مادی یا جسمانی زندگی کی ضرورتیں تھوڑی بہت سہولت و راحت کے ساتھ پوری ہوتی رہیں۔ سیاست و حکومت کا مطلب بھی اسی قدر ہے کہ ان ضرورتوں کی تکمیل انفرادی و اجتماعی، قومی و بین الاقوامی امن و عافیت اور عدل و انصاف کے ساتھ ہوتی رہے، یعنی معاشیات و سیاسیات کے سارے مسائل و مباحث کا تعلق ہیر پھیر کہ ہماری جسمانی یا حیوانی زندگی کے بقاء و تحفظ یا آرام و آسائش سے ہے جس کا حاصل دوسرے لفظوں میں یہی ہوا کہ یہ زندگی کے وسائل ہیں مقاصد نہیں۔

اب اگر اس زندگی کا کوئی اور مقصد یا مستقبل نہیں تو لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ "خوردن برائے زیستن" کی منطق الٹ کر "زیستن برائے خوردن" ہو جاتے، انسانی بستیوں کا چپہ چپہ جس روز افزوں انفرادی و اجتماعی قومی اور بین الاقوامی شور و شر اور فتنہ و فساد، جنگ و جدال سے دوچار اور باہم دست و گریبان ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہی الٹی منطق ہے کہ وسائل کو وسائل کے درجہ سے بڑھا کر مقاصد کا مقام دے دیا گیا ہے۔

یہ کوئی بڑی باریک نہیں بالکل موٹی بات ہے کہ اس زندگی کا خالی جینے کے علاوہ کوئی بھی اور مقصود قرار دیا جائے اور خواہ وہ اسی مادی و دنیاوی زندگی تک ہی محدود ہو پھر بھی خود یہ زندگی یا اس کی حفاظت و راحت کے اسباب اصل مقصود کے وسائل ہی قرار پائیں گے چہ جائیکہ جب مستقبل کی ایک غیر فانی۔ خیر و ابقیٰ۔ مستقل زندگی کا یقین و ایمان ہو تو پھر اس کے مقابلہ میں اس فانی زندگی کی تھوڑی بہت سانسوں کی کیا حیثیت رہ جاتی

ہے اور اس کے بقاء و تحفظ کے معاشی یا سیاسی وسائل کی نوعیت وسائل در وسائل سے زیادہ کیا ہوتی ہے دنیوی معاشیات وسیاسیات کیا، اسلام کی نگاہ میں جب یہ دنیا اور اس کی زندگی خود ہی سرے سے مقصود نہیں بلکہ ایک بے انتہا وسیع و نامحدود زندگی کا محض راستہ ہے تو راستہ کے ساتھ وہ منزل کا معاملہ کیسے گوارا کر سکتا ہے۔

بس یہی دوراہہ ہے جہاں سے اسلامی یا دینی اور لادینی معاشیات وسیاسیات سب کی راہیں پھٹ کر بالکل الگ الگ ہو جاتی ہیں۔

انقلاب فرانس کے بعد یورپ جس سراسر مادی تمدن و تعیش کی راہ پر پڑ چکا تھا اس کا بالکل منطقی و نفسیاتی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ انقلاب روس تک آتے آتے عملاً ہی نہیں قولاً بھی انسان کا ماضی و حال و مستقبل و مآل سب کچھ پیٹ ہی پیٹ ہو کر رہ گیا اور اب تو سیاسیات کے بھی سارے دعوے بطنیات ہی کی گوناگوں دعوتوں (آئیڈیالوجیز) اشتراکیت و اشتمالیت وغیرہ پر مبنی کئے جانے لگے ہیں۔ یورپ کی حاکمانہ گرفت و غلبہ کی بدولت معاشی وسیاسی تصور کا یہی بطنی ہیضہ ساری دنیا میں پھیل گیا۔ دل کی آواز دب کر ہر جگہ اور ہر طرف شکم ہی کا بول بالا ہو رہا ہے

جو پوچھا دل نے اس جینے کا کچھ حاصل بھی ہے
شکم بولا کہ اس کی فکر کیا بندہ تو حاضر ہے

جن لوگوں کی نظر میں اس زندگی کا نہ کوئی آگا پیچھا ہے نہ انبیائی دین اور اس کے آخری پیغام کے لائے اور بتائے ہوئے انسانی زندگی کے تصور کو انہوں نے قبول کیا ہے وہ اپنی زندگی کو بے معنی و بے مآل بنا کر حیوانی معاشیات وسیاسیات کی جن وادیوں، نام نہاد آئیڈیالوجیوں میں چاہیں بھٹک بھٹک

کر مرجائیں۔ وہ کھاپی کر یا بہت سے عیش و عشرت یا حکومت و سلطنت
کے ساتھ کھاپی کر مرجانے کے آگے آخر اور سوچ ہی کیا سکتے ہیں۔

سوال ان سے ہے جنہوں نے حیوانیت و بطنیت سے اونچے ہو کر
نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ کی روحانیت اور اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ
خَلِیْفَةً [1] کی خلافت کے مقام کو اپنے لئے پسند کیا ہے اور اس ناسوتی یا
مادی زندگی کو ایک اعلیٰ و ابدی منزلِ حیات کا مسافرانہ و امتحانی راستہ ہونا
وحی و نبوت کی روشنی میں دیکھ لیا ہے ان کو راستہ کے ساتھ منزل یا وسائل
کے ساتھ مقاصد کا معاملہ کرنے کا حق کیا حاصل ہے؟

مسافر بہرحال مسافر ہی ہے، تھرڈ کلاس کے مسافر خانہ میں پڑا ہے تب بھی
جی منزل ہی میں دہرا ہے اور فرسٹ کلاس کے انتظار خانہ (ویٹنگ روم) میں ٹھہرا
ہے جب بھی منزل ہی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا ہے غنی ہے تو بھی مسافر، فقیر
ہے تو بھی مسافر، حاکم ہے جب بھی مسافر، محکوم ہے جب بھی مسافر، سرائے کے
ساتھ وطن کا، راستہ کے ساتھ منزل کا، یا وسیلہ کے ساتھ مقصد کا برتاؤ
کرنے میں اپنی ساری جانی و مالی، جسمی و ذہنی توانائیوں کو وہی رائیگاں کرے گا
جس کے دماغ میں خلل ہو۔

سرائے میں کوئی یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ و فانوس سب لگا دیئے جائیں
اور پھر اپنی کمائی سے بھی لگا دیئے تو کتنی بڑی حماقت ہے۔ خاص کر جب یہ حکم
بھی ہو کہ مثلاً چار دن سے زیادہ کوئی اس سرائے میں قیام نہیں کر سکے گا اس

---

[1] انسان و کائنات کے خود خالق کی اطلاع ہے کہ "انسان میں خود اپنی روح میں نے
پھونکی ہے" اور زمین پر اس کو خود اپنا جانشین بنا رہا ہوں۔

وقت تو اپنی کمائی وہاں کی آرائش میں لگانا پورا خلل دماغ ہے، دنیا ایسی ہی محدود قیام کی سرائے ہے جس کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا اول تو سرائے کا قیام اگر اختیاری بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیاری بھی نہ ہو تب تو ہرگز بھی اس سے دل نہ لگانا چاہئے" (مجدد تھانوی)

مسافرانہ و مقیمانہ ذہنیت کا یہ فرق دینی و لادینی یا اسلامی و غیر اسلامی معاشیات و سیاسیات ہی میں نہیں مادی یا دنیوی زندگی کے چھوٹے بڑے تمام معاملات میں ہو گا۔ اور عقلاً و نقلاً ہر طرح ہونا ہی چاہئے، نہیں تو دین اسلام کا دعویٰ نرا زبانی جمع خرچ ہو گا۔

فرض کرو کسی مسلمان فرد یا جماعت کو سیاسی یا معاشی دونوں اعتبار سے حاکمانہ اقتدار و سطوت اور امیرانہ عیش و عشرت، آرائش و زینت کے سارے سامان حاصل ہیں لیکن اسلامیت کا دعویٰ زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں نہ مسلمانوں کی شکل و صورت، نہ نماز روزہ کی عبادات نہ معاشرت و معاملات نہ اخلاق و عادات دوسری طرف سیاسی اعتبار سے محکوم اور معاشی لحاظ سے مفلس کوئی مسلمان فرد یا جماعت ہے مگر آخرت کے ابدی مستقبل سے غافل نہیں مقدور بھر ظاہری و باطنی زندگی کتاب و سنت کے اعمال صالحہ سے معمور رہنے، خود ہی فیصلہ کرو کہ اسلامی نقطۂ نظر سے کونسی حالت زیادہ کامل اور قابل ترجیح ہو گی؟

بلاشبہ ایمان و عمل صالح کے ساتھ ساتھ اگر سیاسی و حاکمانہ اقتدار اور معاشی وسعت و فراغ بھی میسر ہو تو مقاصد دین کی حفاظت اور افلاس کی کمزوریوں

۱؎ تجدید تصوف (جو اس سلسلہ تجدید دین کا دوسرا نمبر ہے ص ۵۲/۳۵۱)

سے بچنے میں اعانت وسہولت ضرور ہو گی اس وسائلی یا ثانوی درجہ میں معاشیات یا سیاسیات کی اہمیت سے نہ انکار نہ دین و شریعت ہی کی صحیح وجائز راہوں سے ان کے حصول کی جدوجہد کے مطلوب ومحمود ہونے میں کلام، بلکہ ایمان وعمل صالح کی اختیارہ بھرا اسلامی زندگی خود ہی سیاسی اقتدار اور معاشی فلاح سب کی سب سے بڑی ضمانت وتدبیر ہے۔ لہٰذا مسلمان کا مسلمان ہونے کی حیثیت سے سیاسی برتری اور معاشی خوشحالی سے پہلے اور بعد جہاں اور جس حال میں بھی ہو مقدم کام انفرادی واجتماعی ہر لحاظ سے بقدر استطاعت "مومن صالح" بننا ہے۔

کامل دین کی طرف سے ایسا ہی کامل نظامِ حیات عطا ہوا ہے جو حاکم ومحکوم غنی وفقیر سب کو کمال انسانیت کی منزل پالینے کی یکساں ضمانت دیتا ہے یعنی اخروی زندگی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب کو جس طرح مالی وسعت کے ساتھ اور حکومت کے تخت پر بیٹھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے، اسی طرح تنگ دستی اور محکومی کی خاک پہ لوٹ کر بھی بلکہ اکثر صورتوں میں زیادہ سہولت وسرعت کے ساتھ، دین کامل کا یہ بڑا کمال ہے کہ دینی یا انسانی کمالات کے اونچے سے اونچے مقامات کی راہیں شاہ وگدا، حاکم ومحکوم، تونگر وتنگ دست سب پر بلا تفریق وتمیز یکساں کھلی ہیں۔

اگر کوئی دین، دنیا کے جاہ ومال، حکومت وثروت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کو بھی نفس دین کے مقاصد یا اجزاء کا درجہ دے دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ پوری انسانیت کے پورے حالات کو محیط وکامل دین ہی سرے سے نہیں کہ اس نے ایسی غیر اختیاری چیزوں کو دین کا جز یا مقصود قرار دیدیا جن کا حاصل کرنا نہ ہر وقت ہر فرد کے انفرادی طور پر قبضہ واختیار میں ہے نہ ہر جماعت کے اجتماعی طور پر۔

پھر اسلام نے تو اپنی ساری تشریعی تکلیفات کا اساسی اصول ہی یہ منصوص فرما دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا استثناء کسی کو بھی کوئی ایسی تکلیف نہیں دیتا جو اس کی

اختیاری وسعت وطاقت سے باہر ہو۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا

غرض زندگی کی ایک راہ تو وہ ہے جسمیں سیاسیات ومعاشیات یا دوسرے لفظوں میں جاہ ومال ہی کو زندگی کا سارا مدعا ومآل ٹھہرا لیا گیا ہے اور جس کی دعوت کا خلاصہ تمامتر "جینا کھانے کے لئے"، نہ کہ "کھانا جینے کے لئے"، اور زندگی کی انفرادی واجتماعی ساری طاقتوں کو اس طرح اسی الٹا گنگا میں بہا دیا گیا ہے کہ اس سوال کا سرے سے ہوش ہی نہیں رہ گیا کہ

اس جینے کا کچھ حاصل بھی ہے

اس سوال کے گم کر دینے نے خود انسانیت کو گم کر دیا ہے نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ اور سکھ چین امن وعافیت کے ساتھ مقصد انسانیت کی تکمیل میں معین وکارآمد ہونے کی جگہ موجودہ معاشیات وسیاسیات کی "ترکستانی راہ" نے بالآخر عصر حاضر کی پوری دنیا کو جہاں سوز وجہانگیر جنگ کے ایسے مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے کہ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" امن وامان صلح وآشتی کی راہ ڈھونڈے نہیں ملتی۔ ابھی پرسوں (۲۹ رجولائی ۱۹۵۱ء) کسی صاحب فکر فلسفی کا "جوہری عہد کی حیرانیوں" کے عنوان سے ایک مضمون نکلا ہے جس کی ابتداء میں ہے کہ

"ایسا وقت آپڑا ہے کہ آدمی اپنے کو بڑی بے بسی کے مخمصہ میں پا رہا ہے ہم اپنے کو ایسی جنگ کے منہ میں جاتا دیکھ رہے ہیں جس کو پسند مشکل سے کوئی ایک شخص بھی کرتا ہوگا۔ جس کی نسبت ہم جانتے ہیں کہ نوع انسان کے بڑے حصہ پر مصیبت نازل کر کے رہے گی، مگر ہمارا حال اس خرگوش کا سا ہو رہا ہے جس کو سانپ نے مسحور کر رکھا ہو کہ گو یہ بھیانک منظر ہم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں مگر گریز کی راہ نہیں پاتے، ایک دوسرے سے ہم ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے دہشت ناک قصے بیان کرتے ہیں کہ شہر کے شہر نیست ونابود ہو جائیں گے ہر جگہ درندگی کا

دور دورہ ہوگا۔ اور گو ہماری عقل کہتی ہے کہ ایسے منظر سے ہم کو لرزنا چاہئے لیکن خود ہمارے نفس ہی کے اندر ایک ایسا حصہ بھی ہے جو اس سے مزے لیتا ہے اور مصیبت سے نکلنے کا عزم پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اس طرح خود ہمارے اندر ہی صحیح العقل اور فاتر العقل کی ایک گہری تقسیم موجود ہے [1]

یعنی ہم بوقت واحد پاگل بھی ہیں اور ہوشیار بھی۔

غرض اسلام کا مطلوب آج کل کی مادی راہوں کی معاشیات و سیاسیات قطعی نہیں نہ حکومت و ثروت نفس دین کا کوئی ایسا مقصدی یا داخلی و عنصری رکن ہے جس کے بغیر آدمی زمان و مکان کے کسی حال و مقام میں دین و انسانیت کے حقیقی کمالات کے حصول سے کسی درجہ میں بھی محروم رہ سکے، ہر حال و ماحول میں انسان صرف اپنی اختیاری وسعت و طاقت بھر مسئول و مکلف ہے اسی وسعت و طاقت کے اندر رہ کر وہ انسانی یا دینی کمالات کے بلند سے بلند مطالب و مقاصد کو پا سکتا ہے۔ مطلب وہی ہے کہ نفس دینی کمال و مقصد کی تکمیل کیلئے جاہ و مال و ثروت و سلطنت کے خارج از وسعت و اختیار امور کو فرد و جماعت کسی کے لئے بھی دین کا جزء کیا اس طرح کی شرط بھی نہیں ٹھہرائی ہے جیسی کہ وضو یا تیمم نماز کیلئے۔

اور یہی راز معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا اصلی رُخ سیاسیات و معاشیات کی کسی خاص دعوت کے بجائے ہمیشہ معادیات کی طرف بلانے کا رہا۔ کوئی سیاسی و معاشی آئیڈیالوجی بالذات یا براہ راست کبھی انبیائی پیغام نہیں بنی۔ ضمناً وذیلاً جو کچھ معاشی و سیاسی ہدایات و احکام ملتے ہیں وہ بھی اصلاً

---

[1] (PERPLEXTIES OF ATOMIC AGE) پانیر سنڈے ایڈیشن۔

معادی مصالح کے تحت اور وسائل کی حیثیت سے۔

اب آگے معاشیات و سیاسیات کا الگ الگ کچھ تفصیلی معروضات سے پہلے ایک بات کا اور خیال میں رہنا ضروری ہے کہ معاشیات و سیاسیات ہی پر موقوف نہیں اسلام کسی علم و فن کی بھی خالص علمی و فنی حیثیت سے تعلیم و تربیت دینے نہیں آیا۔ سارے ایسے علوم و فنون جو بواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح ہماری مادی و ناسوتی زندگی کے بقاء و تحفظ اور اس کے اسباب و تدابیر سے بحث کرتے ہیں ان کی تحقیق و تکمیل کے لئے ہم کو ایک خاص درجہ کی شعوری عقل و فہم اسی طرح خلقۃً عطا کر دی گئی ہے جس طرح ادنیٰ سے ادنیٰ حیوانات کیڑوں مکوڑوں تک کو اپنے بقاء و تحفظ کی غیر شعوری جبلتیں (INSTINCTS) مذہب خصوصاً اسلام کا موضوع بحث براہ راست نہ اس ناسوتی زندگی کا بقا و تحفظ ہے نہ اس کے اسباب و وسائل کی تعلیم و تکمیل مادی زندگی کی احتیاجات و تدابیر سے اسلامی احکام و ہدایات کو فقط اسی حد تک سروکار ہے جس حد تک ان کا دین۔ یعنی انسان کی اصلی انسانیت یا انسانی زندگی کے بناؤ بگاڑ سے تعلق ہے۔

جو لوگ دینداری کے زعم میں اسلامی معاشیات و سیاسیات پر اس رنگ میں مضامین یا کتابیں لکھتے ہیں کہ آجکل کی خالص دنیا دارانہ معاشیات و سیاسیات کے مباحث و مسائل سے نفیاً یا اثباتاً ملا دینا چاہتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ دین کو بھی دنیا ہی بنا کر اسلام کے حق میں صرف نادان دوست کی دوستی کا حق ادا فرماتے ہیں۔ اچھے اچھے اہل علم و نیک نیت حضرات تک کی تحریریں اس غلو سے بمشکل پاک ہوتی ہیں۔ انتہا یہ کہ سر تا سر دنیاوی یا لادینی معاشیات و سیاسیات ہی کی رنگ برنگ دعوتوں (آئیڈیالوجیوں) کے مقابلہ میں دینی یا اسلامی معاشیات و سیاسیات کی بھی مستقل دعوتیں گھڑ گھڑ کر پیش کی جا رہی ہیں اور ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم معادیات کے دوش بدوش معاشیات وسیاسیات کی بھی کوئی خاص ومستقل دعوت حضرات انبیاء خصوصاً نبی الاسلام علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے مقاصد میں داخل ہے حالانکہ مقصد کے درجہ میں دینی یا انبیائی دعوت کا رُخ تمام تر معادیات یا آخرت کی ابدی زندگی کے بناؤ بگاڑ کی طرف ہوتا ہے قرآن نے اپنے نزول کی اصلی غرض وغایت اسی ابدی زندگی کے بگاڑ سے ڈرانے اور اسی کے بناؤ کی بشارت کو بتلایا ہے[1] کہ اس کتاب میں حیات آخرت کے بناؤ، بگاڑ کے اعتبار سے جو راہ متعین فرمادی گئی ہے وہی بالکل صاف سیدھی ہر طرح کی کجی (عوج) سے پاک راہ ہے اس سے ذرہ برابر اِدھر اُدھر بھٹکنا گمراہی میں پڑنا ہے۔

البتہ آخرت کا یہ راستہ چونکہ دنیا ہی سے ہو کر گیا ہے اس لئے بقدر ضرورت ایسی ہدایات دینا ضروری تھا کہ منزل کھوٹی ہوئے بغیر جہاں تک ہو سکے راستہ امن وراحت کے ساتھ طے ہو، نہ یہ کہ راستہ کے تماشوں اور دلچسپیوں میں کھو کر منزل ہی کھو جاتے، عہد جدید کے یورپ کی لائی اور سکھلائی ہوئی جدید معاشیات و سیاسیات کی بنیاد بالکلیہ اسی آخرت فراموشی بلکہ آخرت بیزاری پر ہے اور یہی رجحان ساری دنیا پر ایسا چھا گیا ہے کہ ان اصلاحات میں معیشت وسیاست کی ضمنی وذیلی یا وسائلی اہمیت سے زیادہ ہی نہیں بالکلیہ مقصدی اہمیت ومعنویت پیدا ہو گئی ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ تعبیرات واصلاحات جنہوں نے چلائی ہیں اور ان کو مستقل علم وفن اور دعوت (آئیڈیالوجی) کا درجہ دیا ہے ان کی نظر میں یہ ضمنی

---

[1] اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا مّٰکِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا۔

و ذیلی وسائل ہی نہیں اعلیٰ مقاصد ہی ہیں، جو تہذیب و تمدن بھی آخرت سے اپنا رشتہ کاٹ لے لازماً اس کی دنیوی زندگی اور اس کے مسائل ہی زندگی کا محور و مرکز بن کر رہ جائیں گے۔

انسان کے حیوانی یا مادی خمیر کا سب سے کمزور پہلو قدرۃً اس کے پیٹ یا معاش کا معاملہ ہے اصول و اخلاق، علم و ہنر، عزت و شرافت، غیرت و حمیت، مروت و محبت غرض انسانیت کے ہر چھوٹے بڑے جوہر کو بھینٹ چڑھا دینے کے لئے اس کمزوری کو آمادہ کر لیا جاتا ہے۔

مذہب و مذہبیت کا کبھی ذکر خود انسان اور اس کی نفس انسانیت کے حق میں شاید ہی تاریخ کی کسی شخصیت و تحریک نے انسان کی اس حیوانی یا بطنی کمزوری سے اتنا مفسدانہ فائدہ اُٹھایا ہو جتنا کارل مارکس اور اس کے مادہ پرستانہ فلسفۂ معیشت نے۔ کہاں بھولی بسری یہ انسانی غیرت کہ آج بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بندۂ شکم کہدو تو وہ اس کو اپنی آدمیت یا انسانیت کی انتہائی توہین بلکہ گالی ہی جانے گا۔ اور کہاں یہ دعوتِ شکم کہ انسان کی اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی و اخلاقی، علمی و فکری تہذیبی و تمدنی سیاسی و سماجی قدریں سب کی سب ایک معاش ہی معاش کے مسئلہ یا پیٹ ہی پیٹ کا چکر ٹھہرا دی گئیں۔ چہ جائیکہ اسلام کی رزقی و معاشی تعلیمات جن کا دامن اصلاً معادی فلاح اور خدا کی ایسی رزقی ضمانت و مشیت سے بندھا ہوا ہے کہ پوری کتابِ اسلام میں۔ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ کی سی بیشمار آیات میں ایک آیت بھی ایسی نکلنا مشکل ہو گی جس میں رزق و معاش کو معبودِ اعظم کیا کسی درجہ میں بذاتِ خود مقصود بھی بتایا گیا ہو، یا انسانی منصوبہ بازیوں کے بجائے انسان ہی نہیں ساری اَن گنت جاندار مخلوق کی رزق رسانی کو بالکلیہ اور دراصل خود

خدا کی مشیت و ضمانت کے حوالہ نہ فرمایا گیا ہو۔

آگے اسلامی معاشیات کے نام سے جو کچھ گفتگو ہوگی اس کا تجدیدی و اسلامی پہلو یہی ہوگا کہ اسلام میں دنیوی یا معاشی مسائل کی حیثیت بذاتِ خود مقاصد کی قطعاً نہیں، تمامتر وسائل کی ہے۔ یعنی معاشی فلاح ورفاہ صرف اسی اعتبار سے اور اسی حد تک مطلوب ہے جس حد تک اس سے معاد یا آخرت و انسانیت کی طلب و تکمیل میں اعانت ہو۔ اور جو نظام معیشت جس درجہ میں اس اسلامی مزاج و فطرت کے منافی و مباین ہوگا اسی درجہ میں اسلام کی نگاہ میں مردود و مطرود ہوگا۔

یہی اسلامی و غیر اسلامی معاشیات کا کتاب کے آئندہ مباحث و ابواب میں جوہر طاری و مابہ الامتیاز ہوگا۔

وباللہ التوفیق وعلیہ التکلان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

معاشیاتِ عبدیّت

وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ۝ مَاۤ اُرِیۡدُ مِنۡہُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ وَّ مَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ یُّطۡعِمُوۡنِ ۝ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الۡقُوَّۃِ الۡمَتِیۡنُ ۝

"نہیں پیدا کیا میں نے جن و انس کو مگر اس لئے کہ میری ہی عبادت میں لگے رہیں۔ میری مراد (ان لوگوں کے پیدا کرنے سے) رزق (کی فکر) میں ان کو کھپانا نہیں، نہ یہ مراد (ہو سکتی) ہے کہ مجھ کو کھلائیں (جیسا کہ بہت سے مشرکین بزعم خود اپنے دیوی دیوتاؤں کو کھلاتے پلاتے ہیں)، یہ تو خود اللہ ہی ہے جو سب کا رزق رساں پختہ قوت والا ہے۔"

معاشیات کی اسلامی اساس

بس یہی آیات اسلامی معاشیات کے سارے اصول و فروع کی اساسی بنیادیں ہیں۔ معاش یا قرآن کی اصطلاح میں رزق بلا شبہ زندگی کی سب سے مقدم اور ناگزیر ضرورت ہے۔ لیکن ہے ذریعہ یا ضرورت ہی، زندگی کا مقصد

بہرحال نہیں۔ لہذا جب تک پہلے خود مقصد معلوم و متعین نہ ہولے اس کے مناسب و موافق کسی ذریعہ یا وسیلہ کا تعین کیسے ہوگا۔ زندگی کا جو مقصد ہوگا اسی کے اعتبار سے تو ذرائع و وسائل کی نوعیت و حیثیت اور اہمیت کا فیصلہ ہوگا اور جہاں کہیں وسیلہ نفس وسیلہ کی حیثیت سے باہر قدم نکالے گا یا اصل مقصد میں معاون ہونے کی جگہ مزاحم ہونے لگے گا وہیں اس کو روک دینا پڑے گا۔

پہلی آیت ۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ میں نفی و استثناء کی انحصاری تعبیر سے دو ٹوک قطعیت کے ساتھ فرما دیا گیا کہ انسان کی پیدائش کا مقصد و مدعا اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت وعبدیت یا پرستش و بندگی میں لگا رہے، کوئی بھی مخلوق ہو اس کا مقصدِ تخلیق خود اسی کی امتیازی خلقت و فطرت یا خصوصیت کی ترقی و تکمیل ہی ہو سکتی ہے۔ آم کا کمال یہی ہوگا کہ بہتر سے بہتر آم کے صفات اس میں نمایاں ہوں نہ انگور یا انار ہو جائے۔ گھوڑے کا کمال اس کی فرسیت یعنی فرسی صفات کی ترقی ہوگی نہ کہ شیر یا ہاتھی بن جانا۔ اسی طرح آدمی کا مقصود بھی صرف آدمی بننا ہی ہو سکتا ہے۔ یعنی آدمیت کی خصوصی و امتیازی فطرت کی ترقی و تکمیل نہ کہ کھانے پینے رہنے سہنے۔ جینے جنانے کی مشترک حیوانی ضروریات میں دوسرے جانوروں سے آگے نکل جانا یا بڑھیا جانور (HIGHYER ANIMAL) بن جانا۔ غرض انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ انسان بننا ہی اس کی انسانیت یا انسانی ذات و شخصیت کا ارتقاء و تحقق (REALIZATION) یعنی اس کے پیدائشی و نوعی مقصد کا کمال ہوگا اس لئے معاشیات ہی کیا زندگی کے کسی چھوٹے بڑے شعبے کو بھی اسلامی سمجھنے سمجھانے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ ذات و شخصیت یا انسان کی خاص و خالص امتیازی خلقت اسلام کی نگاہ میں ہے کیا؟

انسانی فطرت

انسان کی پیدائش کا ملائکہ میں اعلان فرما کر جب ان کو اس کے سجدے کا حکم دیا گیا تو خاص خصوصیت اس کی یہ منصوص فرمائی گئی ہے کہ اس کے اندر میں (خدا) نے خود اپنی روح کی ایک شان پھونکی ہے (نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ) دوسرے عنوان سے کائنات میں اس کے خاص مقام کا یوں تعین فرمایا گیا کہ "زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں" کسی کا خلیفہ یا جانشین صحیح معنی میں وہی ہوگا اور ہو سکتا ہے جو اپنے مستخلف یا خلیفہ بنانے والے کی ذات و صفات سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مماثلت و اقربیت رکھتا ہو۔ حضرات صوفیہ اسی معنی میں انسان کو حق جل و علا کا مظہر اتم کہتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات کے کمالات کو سب سے زیادہ ظہور بخشا ہے۔ ایک اور اعتبار سے اسی حقیقت کو امانت سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

نامحدودیت

خدا کا جوہری مفہوم و تصور، حیات و ارادہ، علم و قدرت، خلق و امر وغیرہ تمام صفات کمال کی جامعیت و نامحدودیت ہے اسی نامحدودیت کی روح یا طلب اور تڑپ انسان کے اندر اس حد تک پھونکی گئی ہے کہ اس دنیا کی محدود و مختصر زندگی کے مطلوبات میں بھی اس کی طلب و تمنا کو کسی حد و نہایت پر قرار و قناعت قطعاً نہیں نہ اس وقت تک ممکن ہے جب تک اس کی خواہش یا چاہ پر سے تمام حد بندیاں ہٹ کر نامحدودیت کے اس مقام کو نہ پالے جہاں جو کچھ چاہے اور مانگے بے روک ٹوک پائے لَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا

تَدَّعُوۡنَ ۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی فطرت کی اعلیٰ مانگ جنت ہے خدا میں نامحدودیت کا تحقق بالذات و بالفعل ہے اور اپنے خلیفہ میں اس نے اسی نامحدودیت کے تحقق یا قوت سے فعل میں لانے کا مطالبہ پھونک کر گویا اس کو "مخلوق خدا" (CREATED GOD) بنا دیا گیا ہے تاکہ اپنے "خالق خدا" کی جانشینی کا سزاوار ہو۔

عبدیت

ایک مقدمہ یہ ہوا۔ دوسرا یہ ہے کہ کسی کی جانشینی یا خلافت کی حقیقت و کمال یہی ہے کہ اپنی خوشی و خواہش کو اپنے جانشین یا خلیفہ بنانے والے کی مرضی ومشیت کے بالکل تابع بلکہ اس میں فنا کر دے۔ یہی مطلب عبادت وعبدیت یا بندگی و سرافگندگی کا ہے خود اسلام کے معنی بھی ایسی کامل سپردگی ہی کے ہیں کہ عبد اپنے رب، بندہ اپنے مالک کے حوالہ اپنے کو اس طرح کر دے کہ اس کی مرضی ومشیت کے ساتھ پورا پورا توافق پیدا ہو کر کوئی تعارض و تصادم باقی نہ رہ جائے۔ عبدیت کی اسی خصوصیت کو حضرت مجدد وقت نے جا بجا ذیل کی اس مثالی حکایت سے واضح فرمایا ہے۔

"ایک شخص نے غلام خریدا۔ خریدنے کے بعد دریافت کیا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ حضور آج سے تو وہی نام ہے جس سے آپ پکاریں، دریافت کیا کہ کھایا کیا کرتے ہو؟ کہا حضور آج سے کھانا بھی وہی ہے جو آپ کھلائیں۔ دریافت کیا پہنا کیا کرتے تھے؟ کہا آج سے پوشاک بھی وہی ہے جو حضور پہنائیں"

اسی طرح حاجی امداد اللہ صاحب کے سامنے آیت وَمَا

خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ٥ پر اشکال کیا گیا کہ اس میں جن
وانس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے خدا تعالیٰ کی عبادت تو ساری مخلوق ہی کرتی ہے
حضرت نے فرمایا کہ ایک مثال سے اس کا فرق سمجھو ایک تو نوکر ہے اور ایک
غلام (عبد)۔ نوکر کا کام تو متعین ہوتا ہے خواہ ایک خواہ متعدد، مثلاً باورچی کہ
اس کے لئے کھانا پکانے کی خدمت معین ہے اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں
ہوتی بلکہ تمام خدمات اس کے ذمہ ہیں جس کا بھی حکم ہو جائے، چنانچہ ایک وقت
اس کو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے اور ایک وقت آقا کی پوشاک پہن کر آقا کا
قائم مقام اور نائب (خلیفہ) بن کر جلسہ یا دربار میں جانا پڑتا ہے، غرض غلام کو
کسی وقت کسی خدمت سے بھی انکار نہ ہوگا،

حاصل یہ کہ جن وانس کے سوا دیگر مخلوقات میں سے ہر ایک کی طاعت و
عبادت کی کوئی نہ کوئی صورت معین ہے، یعنی ہر مخلوق سے کوئی نہ کوئی خاص
کام ہی متعلق ہے جس کے سوا دوسرا کام اس سے نہیں لیا جاتا۔

مگر انسان کی کوئی خدمت معین نہیں ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت
ہے۔ ایک وقت میں پاخانہ پھرنا بھی عبادت ہے مثلاً جماعت تیار ہو اور پاخانہ
پیشاب کا زور ہو تو پاخانہ پیشاب سے فراغت واجب ہے اور نماز پڑھنا حرام۔
اس وقت اس کا پاخانہ جانا ہی عبادت ہے اور ایک وقت انسان کی یہ شان
ہے کہ مظہر حق بنا ہوا ہے اس وقت اس کی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں۔

غرض جو شان غلام کی ہوتی ہے وہی انسان کی ہے، عبدیت دن کے لئے
انسان ہی ہے کہ کسی خاص حالت اور خاص کام کو اپنے لئے تجویز نہیں کر سکتا
بلکہ حضرت حق جس حال میں رکھیں اسی میں اس کو رہنا چاہیئے کمبل اڑھائیں تو کمبل
اوڑھے دوشالہ اڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے، بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے گھی

دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائیے۔ (وعظ صلوٰۃ الحزین ص ۱۴، ۱۵)

کسب و تدبیر

یہ مطلب نہیں کہ رزق و معاش کی اسبابی فکر و تدبیر ترک کردے۔ اپاہجوں کی طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور خود سے فاقہ کو دعوت دے یا آسمان سے خوان اترنے کا انتظار کرنے لگے بلکہ ہمارے اندر کسب و اختیار کی جو صفت ودیعت فرمائی گئی ہے اس کا دہرا مطالبہ جس طرح ایک طرف یہ ہے کہ حصول معاش کے اسبابی مشاغل و تدابیر میں اپنی فہم و بصیرت کے موافق آزادی کے ساتھ اپنے کسبی اختیار کو کما حقہ استعمال کریں۔ اسی طرح اس کی امانتی جہت کا یہ تقاضا ہے کہ طلب رزق کی ساری تدبیروں اور کوششوں میں صاحب امانت (حق تعالیٰ) کی مرضی و منشاء کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔

ایک طرف اگر صنعت و حرفت زراعت و تجارت، مزدوری و ملازمت وغیرہ معاشی اسباب میں ہمارے اختیار کو تکوینی آزادی بخشی گئی ہے تو دوسری طرف ان اسباب کی بعض صورتوں پر حرام و حلال جائز و ناجائز کی کچھ تشریعی پابندیاں خود ہماری خلافتی و روحانی فطرت یا انسانیت کی ترقی و تکمیل کیلئے عائد کردی گئی ہیں۔

فقر و سلطنت

اب ان آزادیوں اور پابندیوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے میں اگر کبھی ہم کو بھوکا رہنا پڑے تو یہ سمجھنا درست ہوگا کہ ہمارا پروردگار (رب) ہی خود ہماری ہی پرورشی مصلحتوں کے تحت اسی طرح بھوکا رکھنا چاہتا ہے جس طرح طبیب کبھی

مریض کو،۔ اور اگر آزادی وپابندی کے اس "سندانِ عشق" اور "جامِ شریعت" کی "بازی" یا ہم آہنگی میں "دودھ گھی"، کیا ہفت اقلیم کی سلطنت ودولت مل جائے تو اس کو بھی اپنے رب ہی کی طرف سے اور اپنی عبدیت ہی کی پرورش وربوبیت کا سامان اور امتحان جاننا چاہیئے۔ کیونکہ

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ۚ

رزق میں فراخی وتنگی کرنے والا تو خود تمہارا رب دیا پالنہار ہی ہے جو اپنے بندوں کو خوب جانتا سمجھتا ہے کہ کس کے حق میں فراخی مناسب ہے، اور کس کے تنگی۔

کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

آدمی کے بچے کو اگر آدمی بننا بنانا ہے یا آدمی ہی کی نمائندگی وخلافت کا حق ادا کرنا کرانا ہے تو اس کی صورت فقط یہی ہے کہ جب آدمی ماں باپ کی صفات لیکر پیدا ہوا ہے تو انہیں کی تربیت وشفقت کی گود میں بے چون وچرا اپنے کو ڈال دے ورنہ اتفاق سے اگر کسی بھیڑیئے کے جنگل میں پڑ گیا تو اس کے بھٹ اور پرورش میں رہ کر تو کھانے پینے رہنے سہنے کی گرگی صفات ہی کا اس کے اندر نشو ونما ہوگا۔ مدت ہوئی لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں ایک ایسا ہی کوئی دس بارہ برس کا بچہ دیکھنے میں آیا جو کسی بھیڑیئے کے بھٹ میں ملا تھا اور جس کو اب از سرِ نو آدمی کی طرح کھانا، پینا، بولنا، چالنا سکھلایا جا رہا تھا[1] کیا عرض کیا جائے کہ آج پوری انسانیت

---

[1] آج کل لکھنؤ ہی کے ایک دوسرے بلرام پور اسپتال میں ایک ایسے ہی انسانی بچہ کو از سرِ نو انسان بنایا جا رہا ہے، جس کو کوئی بھیڑیا، بھیڑیا بنا رہا تھا۔ بالکل یہی معاملہ یورپ کے بھیڑیوں نے پوری انسانی آبادی کے ساتھ

یورپ کے ایسے ہی گرگ صفات نام نہاد انسان کے چنگل میں گرفتار ہے اور اس گرگی معاشیات وسیاسیات ہی کی بدولت سچ پوچھئے تو آدمی آدمیت کی روٹی اور امن وعافیت کی زندگی دونوں سے محروم ہو رہا ہے۔

ربوبیت

غرض اسلام کی کتاب کی رو سے انسان کی انسانیت جب خود اس کے خالق کی پھونکی ہوئی روحانیت اور اسی کی عطا کی ہوئی خلافت میں منحصر ہے تو لازماً اس روحانیت وخلافت کا پروان چڑھنا بھی اسی پروردگار کی بنائی اور بتائی ہوئی راہ معیشت پر چلنے چلانے ہی میں منحصر ہوگا جس نے اس کے اندر خود اپنی روح پھونکی اور اس کے سر پر خود اپنی خلافت کا تاج رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جو خاص صفت عبد کے بالمقابل واقع ہے وہ رب ہی کی ہے اور عبدیت کا مطالبہ براہ راست صفت "ربوبیت" ہی کا لازمہ ٹھہرایا گیا ہے۔ ارشاد ہے کہ اللہ ہی تمہارا سب کا رب یا پروردگار ہے اس لئے اسی کے ساتھ عبدیت یا بندگی کا تعلق پیدا کرو۔ یہی ساری انسانیت کی صلاح وفلاح کی جانب سیدھی شاہراہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ؕ

۔ کسی کا پالنے والا یا مربی صحیح طور پر وہی ہوتا ہے اور سمجھا جاتا ہے جو اس کی امتیازی ونوعی فطرت وصلاحیت کو تربیت کی راہ سے کمال تک پہنچا سکے جیسے باغباں اس معنی میں باغ کا پالنہار ہے کہ ہر پودے ہر درخت کو اس کی خصوصیت کے مطابق پروان چڑھانے کا سامان کرتا ہے۔

زندگی کی ہر راہ کی طرح معاشی زندگی میں بھی ہماری شان عبدیت کا پہلا

مطالبہ یہی ہے کہ اپنے معاشی رب یا رزاق کی ربوبیت و رزاقیت پر بھروسہ کرکے فقر و غنا کے نتائج سے بے پروا ہو کر اس کی طرف سے عطا کی ہوئی رزقی و معاشی آزادیوں اور عائد کی ہوئی پابندیوں کو بے چون و چرا قبول کرلیں۔ عبدیت بلکہ نفس اسلامیت ہی کی معنوی حقیقت یہی بے چون و چرا سپردگی و سرافگندگی کی زندگی ہے۔ باقی معاشی فراغ و فراخی کے اپنے مزعومہ یا خود ساختہ خاص و عام انفرادی و اجتماعی معیار و نتیجہ کو حاصل و پیدا کرلینا نہ ہمارے قبضہ وقدرت میں ہے اور نہ ہم پر اس کی جواب دہی کی ذمہ داری ہے اور نہ انسانی زندگی کے انجام و آخرت کی اصل فلاح و کامیابی کسی خاص و عام معاشی معیار پر موقوف فرمائی گئی ہے، فلاح کا انحصار تو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معاشی تنگی و فراخی کے ہر حال میں بھی سرتاسر بس وہی بندگی کی زندگی گذارنے پر رکھا گیا ہے۔

رزقی غایت

انسان کی پیدائش کا مقصد و مدعا عبادت و عبدیت قرار دینے کے ساتھ ہی ساتھ یہ فرمانا کہ " تمہارے پیدا کرنے کی غرض رزق و معاش کے مسائل حل کرانا نہیں" اس کا مطلب یہی ہے کہ آدمی کو پیدا ہونے اور زندگی ملنے کے بعد زندگی کی حفاظت و بقاء کے لئے سب سے پہلی فکر رزق لگ جاتی ہے اس سے بے فکر فرما دیا جائے تاکہ زندگی کی اصل مراد و غرض بندگی کی تحصیل و تکمیل میں یکسوئی سے لگے رہنے میں پیٹ کا دھندا حائل نہ ہو۔ دنیا میں بھی غلام اور غلامی کا تصور یہی رہا ہے کہ جب آقا غلام کے سارے وقت و قوت کو اپنی غلامی کے لئے گھیر لیتا ہے تو بقائے حیات بھر کی اس کی معاشی حاجتوں کی بجائی خود اپنے ذمہ رکھتا ہے۔ یہی صاف سیدھی بات معلوم ہوتی ہے کہ درج

عنوان پہلی آیت میں ایک طرف انسان سے اگر اپنی پوری کی پوری زندگی کو بندگی بنا دینے کا مطالبہ فرمایا گیا ہے تو دوسری طرف دوسری ہی آیت میں رزقی احتیاجات کی ذمہ دارانہ تگ و دو سے سبکدوش فرما کر خود ہی اس کی ضمانت فرمائی ہے کہ روزی رساں تو دراصل صرف اللہ ہی پکی قوت والا ہے اِنَّ اللّٰہَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ -

اہل و عیال کے نان و نفقہ کی ایک درجہ میں ذمہ دارانہ فکر و تدبیر مامور ہے پھر بھی سورۂ طٰہٰ میں عبدِ کامل بلکہ اکمل العباد صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّلاً خود دن رات کے مختلف اوقات میں تسبیح یا نماز و عبادت کا حکم فرما کر ساتھ ہی آگاہ فرمایا کہ

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى -

کافروں کو دنیوی یا معاشی زندگی میں ہم نے بظاہر جو سرسبزی و شادابی بخشی ہے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا یہ تو ان کے حق میں فتنہ ہے آپ کے لئے تو بس آپ کے پروردگار کا ہی رزق بہتر و پائدار ہے

اس کے بعد ہی اہل و عیال کے معاملہ میں فرمایا کہ :-

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى

جو اپنے اہل و عیال کے متعلق بھی آپ کا اصل فریضہ ان کو عبادت یا نماز کا حکم کرنا اور اس پر جمے رہنا ہے رہا رزق یا معاش کا معاملہ تو ہم اس کا کوئی سوال یا مواخذہ آپ سے نہ کریں گے

رزق تو ہم خود ہی آپ کو دیں گے (اور اس
میں کچھ کمی یا تنگی بھی ہو تو) اعتبار تو
انجام و عافیت یعنی آخرت (کی کامیابی)
کا ہے سو وہ صرف تقویٰ (یعنی عبدیت)
کی زندگی سے وابستہ ہے۔

تدبیر کی غرض

مدعا یہی کہ رزق رساں درحقیقت صرف مسبب الاسباب ہے نہ کہ وہ اسباب جن کو ہم رزق کی سعی و طلب میں اختیار کرتے ہیں طلب و تدبیر کی جو کچھ اجازت یا حکم ہے وہ بھی اس لئے نہیں کہ رزق کا ملنا نہ ملنا اس پر موقوف ہے بلکہ یہ بھی دراصل عبدیت ہی کی تربیت و تمرین کی ایک تدبیر ہے کہ کون اپنی طلب و تدبیر کو بالذات حصول رزق میں مؤثر نہ جان کر اور بالکلیہ مشیت الٰہی پر مبنی جان کر جائز و ناجائز، حلال و حرام کے قائم کئے ہوئے ربوبیتی حدود اللہ پر اپنی معاشی تدبیروں میں استوار رہتا ہے اور کون خود ان تدبیروں کا بندہ بن جاتا ہے ورنہ جس طرح پانی زمین اور ہوا کی گوناگوں ادنیٰ و اعلیٰ حیوانی مخلوقات کو رزقی طلب و تدبیر کے شعوری اختیار و تمیز کے بجائے غیر شعوری جبلت کی خاص خاص بندھی راہوں سے پیٹ پالنے کی رہنمائی کر دی گئی ہے اسی طرح انسان کو بھی اس کی حیوانی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے کسی خاص جبلت کے سپرد کر دیا جاتا۔ یا فرشتوں کی طرح سرے سے پیٹ کے دھندے سے آزاد ہی رکھا گیا ہوتا، شعوری اختیار کی امانت تو اسی لئے عطا ہوئی ہے تاکہ انسان اپنی روحانی و خلافتی فطرت کے کمالات کو تشریعی و تکلیفی عبدیت کی راہوں سے حاصل کر سکے۔ اور اس کے لئے اپنے

بندوں کے حال کی پوری واقفیت و بصیرت رکھنے والے (اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا) حضرتِ حق

جس کو جس حال میں رکھیں اس میں اس کو رہنا چاہئے کمل اوڑھائیں تو کمل اوڑھے۔ اور دوشالہ اوڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے، بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے گھی دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائے

بندگی اور خدائی

بھلا بندگی کی اس معاشیات کو خدا بننے والوں کی اس معاشیات سے کیا سروکار جس کی اندھیر نگری میں نہ کوئی امیر امیر رہ سکتا ہے نہ غریب غریب، نہ مزدور مزدور نہ کارخانہ دار کارخانہ دار، نہ کاشتکار کاشتکار ــــــ، نہ زمیندار زمیندار، سب کو اسم بے مسمیٰ اشتراکیت و اشتمالیت وغیرہ کی ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے، خیر حق کے سامنے نہ اس زندگی کے آگے کوئی زندگی ہے، نہ اپنے ہی وسواسی دماغوں کی نت نئی روز روز بگڑنے والی خرافاتی ازموں کے سوا علم و یقین کا کوئی غیر مشکوک سرچشمہ، وہ غریب اندھے کی لاٹھی چلانے کے سوا آخر کر ہی کیا سکتے ہیں، غم و غصہ تو ان پر ہے جو ایک طرف نامحدود ابدی زندگی پر ایمان کے مدعی ہیں جس کے سامنے اس "پست زندگی" الحیٰوۃ الدنیا، کے رنج و راحت کی بساط خواب کی بھی نہیں، دوسری طرف "لَا رَيْبَ فِيْهِ" والی "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" کی خدائی تعلیمات کے حرف حرف کو ہر شک و شبہ سے پاک جانتے ہیں وہ اسلام کے نام سے سیاسیات و معاشیات پر کتابیں لکھ کر اپنی ہی نہیں اپنے خدا و رسول کی کتاب و سنت کی آوازیں اس طرح ان کی آوازوں میں ملانے کی کیوں کوشش کرتے رہتے ہیں کہ گویا آخرت کی "خیر و ابقیٰ" حیات کی طرف بلانے والی کتاب اور اس کے

لانے والے رسولؐ کے مدنظر بھی صرف اسی پست زندگی کے سیاسی و معاشی منافع ہیں اور ابدی و اعلیٰ زندگی کے مصالح یا تو سرے سے نظر انداز یا محض ضمنی و ذیلی نظر آتے ہیں۔

اسلامی و غیر اسلامی معاشیات

بہر حال اسلامی و غیر اسلامی معاشیات کا سب سے پہلا فرق تو یہی ہے کہ

۱۔ اسلامی معاشیات کا بنیادی تعلق معادیات یا آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی کے بناؤ بگاڑ یا فلاح و خسران سے ہے جس کی طرف اشارہ تمہیدی سطروں ہی میں کیا جاچکا ہے اور تفصیل آئندہ مباحث میں آئیگی

۲۔ دوسرے اسلامی معاشیات کی رو سے انسان کے رزق و معاش کا مدار "ایجاد بندہ" معاشیاتی نظریات پر قطعاً نہیں، بقائے جان کے لئے جس طرح ہر جاندار کے رزق کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے اسی طرح مؤمن و کافر ہر انسان کی بھی۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

کتنے طرح طرح کے جاندار ہیں جو اپنی روزی اپنی پیٹھ پر لادے نہیں پھرتے اللہ ہی تم کو بھی روزی دیتا ہے اور ان کو بھی (معاذ اللہ وہ اندھا بہرہ نہیں کہ جبتک تم داد و فریاد اور احتجاج و ہڑتال کے ہنگامے نہ برپا کرو سماعت ہی نہ کرے) وہ تو سب کا حال خود ہی پوری طرح سننے اور جاننے والا ہے

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ :۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا

کوئی بھی زمین پر چلنے والا جاندار نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی پر ہے وہ جانتا ہے کہ کب تک کس کو زمین پر ٹھہرنا اور کب سپرد خاک ہو جانا ہے ۔

اس وقت کی رزق رسانی کا وہ خود ہی ضامن ہے ۔ حدیث میں تو یہاں تک اور اس قوت کے ساتھ اس ضمانت کی تصریح فرما دی گئی ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک مر ہی نہیں سکتا جب تک اپنا مقررہ رزق پورا نہ کر لے ۔

اِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا

خدائی ضمانت پہ بھروسہ

مسلمان جب مسلمان تھے ان کے معاشی مسائل کا اصلی حل یہی خدائی ضمانت یا خدا کی رزاقیت تھی ، صحابہ اور خیر القرون کا ذکر نہیں ۔ عام مسلمانوں کے بھی عہد عروج انہیں علین زوال کی گذشتہ صدی کے اسی ہندوستان اور اس کے پایۂ تخت دہلی کے ایک بزرگ حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کے متعلق ابھی دو دن ہوئے حضرت مجدد تھانویؒ کے ملفوظات میں پڑھا کہ ان کی تنخواہ بادشاہ کی طرف سے مقرر تھی جب انگریزوں کا دور دورہ ہوا تو بجائے عربی مہینوں کے انگریزی مہینوں سے تنخواہ ملنی شروع ہوئی ۔ جب شاہ صاحب کی تنخواہ آئی تو رسید پر دستخط کرنے اور انگریزی تاریخ لکھنے کے لئے کہا گیا ۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا میں انگریزی تاریخ نہیں لکھوں گا ۔ لانے والے نے عرض کیا کہ اب انگریزی تاریخ ہی لکھنے کا حکم ہے ورنہ تنخواہ بند ہو جائے گی آپ نے فرمایا میں کافروں

کی عادت پر عمل نہیں کروں گا چاہے تنخواہ بند ہو جائے، خدا رزاق ہے، انگریز رزاق نہیں۔ (الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۱۳۱)

بظاہر کیسی چھوٹی بات پر یہ ضد تھی، بات چھوٹی ہو یا بڑی، اصلی بات وہی ہے کہ ان کی نظر میں بس جو رزاق تھا، تھا۔ غیر پر ان کی نظر پڑتی ہی نہ تھی

یہ تو پھر بھی گئی صدی کے ایک گئے بزرگ کا واقعہ تھا راقم احقر کے خود اپنے والد مرحوم کا رزق و معیشت کے معاملہ میں بارہا خالی ہاتھ ہونے پر بھی ایسی بے فکری اور اطمینان کا رنگ تھا جو اس ناخلف کو بنک میں ہزاروں کا کھاتہ رکھ کر بھی نصیب نہ ہوا

آج بھی اللہ تعالیٰ سے ذرا گہرا تعلق رکھنے والے ایسے ایک نہیں کئی صالح جوانوں کو جاننے کی سعادت حاصل ہے جو رزقی بے فکری کا کوئی خاص یا معتدبہ سامان نہ رکھنے پر بھی ایسے بے فکری سے اللہ کے کاموں میں لگے ہیں کہ معاش و معیشت کا مسئلہ گویا زندگی کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اسی طرح اور بھی مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ کی کئی مثالیں وطن و دکن دونوں جگہ کی آنکھوں دیکھی سامنے ہیں۔

رزقی تنگی و فراخی

(۳) نفس رزق کی ضمانت کے بعد رزقی بسط و قدر یا معاشی تنگی و فراخی کا مسئلہ ہے اس پر مفصل گفتگو تو آگے کے باب میں آتی ہے لیکن اوپر عبدیتی معاشیات کی جو تفصیل گذری اس کا ماحصل بھی یہی ہے کہ آجکل معاشی

ؔ اس سلسلہ کے کچھ معروضات تجدید تعلیم و تبلیغ میں بھی قابل ملاحظہ ہیں خصوصاً دینی خادموں اور علماء کی معاش سے متعلق۔

نیچ اور پنچ کو مٹانے کے فتنوں نے جس طرح آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے اس نا برابری کا مٹانا نہ صرف اسلامی معاشیات کا پیش نہاد نہیں بلکہ عبدیت یا بندہ پروری کے مصالح اور خدائی معیشت کے بالکل منافی ہے، مسلمان جو اپنی خدائی سے دستبردار ہو کر جو خدا ہے اس کی بندگی کا بُرا بھلا تھوڑا بہت اقرار کر چکے ہیں ان کے ساتھ تو تنگی و فراخی یا بسطی و قدری رزق کا معاملہ خصوصًا ان کی بندہ پروری کے مصالح پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ گذشتہ ہفتہ اقوال اشرف کے نام سے حضرت حکیم الامۃ علیہ الرحمۃ کے ملفوظات کا ایک بہت مختصر کتابچہ ناشر کی عنایت سے موصول ہوا جس میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ کی تفسیر سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ:۔

"بہت سے مسلمان ایسے ہیں کہ ان کا ایمان افلاس ہی سے باقی ہے اگر اللہ تعالیٰ ان کو غنی کر دیتا تو اس قدر طغیانی اختیار کریں کہ کفر تک پہنچ جائیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ ان کا ایمان ان کے غناء (خوشحالی) کی وجہ سے محفوظ ہے ان پر افلاس آجائے تو کفر و الحاد میں مبتلا ہو جائیں" [1]

وہی کہ "خواجہ خود روش بندہ پروری داند"

---

[1] اقبال بک ڈپو پٹنہ ۱۲

معاشیات مشیّت

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

اقرار کرو کہ اے اللہ ملک کے (حقیقی) مالک تو ہی جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور تو ہی جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے (ملک و حکومت دے کر) عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے (چھین کر) ذلیل کر دیتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے کہ تو ہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے اور تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے"

کیسا پختہ قول و قرار لیا گیا ہے کہ جس طرح لیل و نہار، موت و حیات کے سارے طبعی قوانین یا تکوینی حوادث و واقعات تمامتر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں اسی طرح ملک و رزق یا سیاست و معیشت کے سارے الٹ پھیر یا انقلاب پر بھی بالکلیہ اللہ ہی کی مشیت فرمانروا ہے۔

توحید کا مطلب

اسلام اور اسلامیت کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز توحید کی تعلیم ہے اس توحید کا مطلب صرف یہ نہیں کہ خدا اپنی ذات و صفات میں ایک یا یکتا ہے ایک تو ایک معنی کر کے ہر چیز ہی ہے کہ اس کی خاص منطقی جزئیت و انفرادیت یا وحدت میں کوئی دوسرا فرد شریک نہیں ہے۔ نہ یہ مطلب ہے کہ خالق عالم صرف ایک ہی ہے اس توحید کے قائل تو ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے پجاری ہمارے وطنی بھائی بھی ہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے مشرک اس اعتبار سے اپنے کو موحد ہی کہتے ہیں خود عرب کے مشرک بھی خالق صرف ایک ہی اللہ کو جانتے مانتے تھے اگر ان سے پوچھو کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ اسلامی یا قرآنی توحید کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اللہ معطل خالق نہیں کہ مخلوق کو پیدا کر کے خود ریٹائر ہو گیا ہو یعنی کائنات اور انسان کو پیدا کر کے اس طرح آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے کہ اپنے آفاقی (طبعی)، اور انفسی (ذہنی) قوانین کے تحت خود بخود چلتی رہے۔ قرآنی اصطلاح میں ان قوانین کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیّت کی محض آیات یا ایک دوسرے پہلو سے محض حکیمانہ انتظامات کی ہے بالفاظِ دیگر عالم میں جو طبعی اسباب یا انسانی تدابیر کارفرما نظر آتی ہیں یہ اپنے نتائج و ثمرات کی علت نہیں فقط ایک

مقررہ انتظامی علامت ہیں۔ علت آفاقی و انفسی مخلوقات و تغیرات کے ہر ہر ذرہ
کی ہر ہر حرکت و سکون کی بالذات خود ان کے خالق یا اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی ہے
ہمارے اندر باہر آفاق و انفس میں جہاں کہیں جو کچھ بھی ہے اور ہو رہا ہے وہ
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ اور يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ کے ارادہ و مشیت سے ہو رہا ہے

توحید مشیّت

ایک سیاست و معیشت کیا، آدمی اپنی زندگی کے کسی حقیر سے حقیر معاملہ
میں جو اسباب و تدابیر اختیار کرتا ہے مسلمان کا مسلّمہ عقیدہ ہے کہ وہ نتائج
و مقاصد کے حصول میں بالذات قطعی مؤثر و دخیل نہیں تاثیر بالکلیہ اللہ تعالیٰ کی
مشیّت و اذن پر موقوف ہوتی ہے زندگی کے ہر انفرادی و اجتماعی بناؤ بگاڑ، ترقی
و تنزل، نفع و ضرر، عطا و منع، مصیبت و نعمت، رنج و راحت کے ظاہری اسباب
بس ظاہری ہی ہوتے ہیں حقیقی سبب صرف مسبب الاسباب کی مشیت
و ارادہ ہوتا ہے، اسلامی تعلیم کی اس ہمہ گیر توحید مشیّت سے قرآن و حدیث
کا دفتر معمور ملیگا، جس کا ماحصل یہی ہے کہ نظام عالم میں طبیعت کا قانون
مشیت کے قانون کی محض ظاہری و اصطلاحی علامت و آیت یا انتظامی حکمت
ہے بالکل اسی طرح جیسے ریل کا ہتھا (سگنل) گرنا ریل کے آنے کی محض
ظاہری و انتظامی علامت ہوتی ہے نہ کہ علت۔ علت تو دراصل ڈرائیور
کا ارادہ یا مشیّت[1] ہے

---

[1] علت یا علیت (CAUSALITY) کی اس حقیقت کو فلسفیانہ اور سائنسی طور پر
سمجھنے کیلئے راقم ہذا کا مضمون سیرۃ النبیؐ جلد دوم (مطبوعہ دار المصنفین) میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے
اور اب بیسویں صدی کی سائنس میں تو علت کا رہا سہا نام بھی ختم ہی سمجھو "لا الٰہ" کی تصدیق تو ہو گئی
"الا اللہ" کی شہادت میں علم نہیں نفس (ہوا) زیادہ مانع ہے۔

علت و معلول کی حقیقت

یہ مثال علت و معلول ہی کی بحث میں غالباً فلسفہ یا سائنس کی کسی جدید کتاب میں نظر سے گذری ہے، عجیب مسرت ہوئی کہ معاشیات ہی کے سلسلہ میں آج کل حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ کے بعض مواعظ وغیرہ پڑھ رہا تھا تو علل و اسباب کی اسی نوعیت و حقیقت کی بحث میں مثال تک بعینہٖ یہی ملی۔ فرق ریل کے ہنٹے کی جگہ صرف ریل کی لال جھنڈی کا ہے ارشاد ہے کہ:۔

تدابیر کا درجہ

اسباب و تدابیر کا درجہ صرف اتنا ہے جیسے ریل کا ملازم لال جھنڈی دکھلا دے جس سے ریل گاڑی فوراً رک جائیگی۔ سو ظاہر ہے کہ لال جھنڈی میں تاثیر کی قوت نہیں۔ اگر ڈرائیور انجن کو نہ روکے تو ہزار جھنڈیاں بیکار ہو جائینگی پس لال جھنڈی کا درجہ صرف اتنا ہے کہ ایک اصطلاح مقرر کر لی ہے لیکن اگر ڈرائیور اس قرار داد (اصطلاح) کے خلاف کرنا چاہے تو جھنڈی میں اس کو روکنے کی طاقت ہرگز نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مقرر فرما دیا ہے کہ جو شخص اسباب کو اختیار کرے گا ہم مسببات کو ان پر فائز کر دیں گے لیکن کسی وقت اگر وہ مسببات کو پیدا نہ کرنا چاہیں تو اسباب سے کچھ نہیں ہو سکتا اسی لئے حقیقت شناس یوں کہتا ہے ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں

مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اسباب کا نام مصلحت و حکمت کی وجہ سے ہے ورنہ کرتے سب کچھ وہی ہیں اور بندہ کا نام ہو جاتا ہے۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل — نسیمِ صبح تیری مہربانی

حقیقت میں مؤثر وہی ہیں اسباب میں تاثیر کی طاقت نہیں وہ صرف علامات ہیں جیسے ابھی لال جھنڈی کی مثال دی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس مضمون کو بار بار بیان فرمایا ہے ایک جگہ بہت تصریح کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰہُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَکَّھُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ اَفَرَاَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰہُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْکُرُوْنَ ۝ اَفَرَاَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَھَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۝

(سورہ واقعہ)

ذرا دیکھو تو سہی کہ جو کچھ تم بوتے ہو اُس کو اُگاتے تم ہو یا ہم ہیں اُگانے والے اگر ہم چاہیں تو (اس ساری پیداوار) کو چور چور کر دیں پھر تم (اس طرح کی) باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم تو بڑے تاوان (تباہی) میں آگئے بلکہ سرے سے خالی ہاتھ ہی رہ گئے (کہ اصل سرمایہ تک جاتا رہا) اچھا پھر دیکھو کہ پانی جو تم پیتے ہو وہ بادل سے تم برساتے ہو یا ہم ہیں برسانے والے اگر ہم چاہیں تو اس کو (پینے کے ناقابل) کھاری بنا دیں سو تم شکر کیوں نہیں کرتے، پھر دیکھو کہ (اسی طرح) آگ جو تم جلاتے ہو (اس کی لکڑی یا) درخت تم نے پیدا کیا یا پیدا کرنے والے ہم ہیں۔"

قانونِ مشیّت

مطلب یہ ہے کہ اعیان و اشیاء ہی کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کہ ان کے افعال و آثار اندھے بہرے قانون طبیعت کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون مشیت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ انسان اپنی کھیتی باڑی کھانے پینے وغیرہ کی معاشی ضروریات کے لئے جو اختیاری تدابیر و افعال اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنی کامیابی ناکامیابی میں علمائے معاشیات کے مزعومہ قوانین معیشت کے نہیں بلکہ بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے قانون مشیت کے تابع ہوتے ہیں اور ہمارے ان اختیاری افعال و تدابیر کی

> وہ ہماری طرف نسبت ایسی ہی ہے جیسے بچے کے ہاتھ میں قلم دے کر پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر لکھایا جائے اور دو چار لفظ خوشنما لکھ کر (دل بڑھانے کے لئے) بچہ کی تعریف کر دی جائے کہ شاباش بہت اچھا لکھا اب اگر بچہ سمجھدار ہے وہ جانے گا کہ میرا اپنا کمال کچھ نہیں کمال اس کا ہے جس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور نادان ہے تو جہالت سے ناز کرنے لگیگا مگر جس وقت دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے الگ ہو جائے گا اس وقت معلوم ہو گا اور قلعی کھل جائیگی کہ وہ (بچہ) خود لکھنے پر کتنا قادر ہے اور اس میں کتنا کمال ہے [1]۔

فظلتم تفکھون

معاشیات کی دنیا میں اس "دوسرے ہاتھ کے الگ ہو جانے" اور "اگاتے

---

[1] الاصابۃ فی معنی الاجابۃ ص ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔

تم ہو یا ہم ہیں اگانے والے" کا تماشہ شاید آج ساری دنیا سے بڑھ کر خود ہمارے ہندوستان میں دیکھا دکھلایا جا رہا ہے۔ آزادی کے بعد سب سے بڑوں کی بڑی بڑی زبانوں پر سب سے بڑا دعویٰ یہ تھا کہ اس ملک میں ننگا بھوکا کسی کو نہ رہنے دیا جائے گا مگر ہو مسلسل پانچ سال سے یہ رہا ہے کہ "زیادہ اُگاؤ، زیادہ اُگاؤ" کی جتنی زیادہ سے زیادہ تدبیروں پر تدبیریں کی جا رہی ہیں اتنی ہی کمی پر کمی یا قلت پر قلت زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ عین جنگ کے زمانے سے بھی گرانی و نایابی کتنی چیزوں کی بڑھ گئی ہے۔ پہلے سب سے بڑی زبان سے یہ دعویٰ نکلا کہ دو سال (۵۲ء) کے بعد باہر سے غلہ کا ایک دانہ بھی نہ منگوایا جائے گا۔ ابھی ۵۲ء آنے بھی نہ پایا تھا کہ اہل تدبیر کی درماندگیوں کی صدائیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ اب ۵۲ء کے بجائے خدا کا نام لئے بغیر کسی پنجسالہ منصوبہ کی خدائی کے اعلان پر اعلان ہوتے رہتے ہیں۔ پھر بھی اگر "دوسرا ہاتھ" الگ ہی رہا تو منصوبہ بازیوں یا "تلفظات" کی کمی کیا ہوگی کوئی اور منصوبہ کچھ اور باتیں بنا لی جائیں گی ورنہ اپنی خوش تدبیریوں پر "جاہلانہ ناز" ہوگا۔

آگے کا حال تو اللہ کو معلوم اور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، سردست "اُگاتے تم ہو یا ہم ہیں اگانے والے" کا یہ حال ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ کسی فرد و جماعت کی نہیں، پورے ملک و حکومت کی پوری طاقتیں سالہا سال سے "زیادہ اُگاؤ" پر صرف ہو رہی ہیں۔ مستقل وزارتیں قائم ہیں سینکڑوں دفتر کھل گئے ہیں ہزاروں لاکھوں کام کرنے والے لگے ہیں۔ کروڑوں، اربوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے ماہرین کے کمیشن پر کمیشن اور کمیٹیوں پر کمیٹیاں بنتی رہتی ہیں۔ ساتھ ساتھ اخباروں میں جیسی جیسی آئے دن خبریں آتی رہتی ہیں ان کا اندازہ دو ہی چار دن کی تازہ خبروں سے لگا لیجئے۔

۲۴ر اپریل ۱۹۵۲ء کی خبر ہے کہ مستقل اطلاعات مل رہی ہیں کہ بستی (یو، پی) کے شمالی حصوں میں تہائی آبادی سخت غذائی کمی کا سامنا کر رہی ہے درختوں کی پتیاں اور جڑیں چبا چبا کر لوگ پیٹ بھر رہے ہیں تین مہینوں سے روز بروز حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے"

اسی تاریخ کو اندور سے آئی ہوئی خبر ہے کہ اناج اور پانی دونوں کی کمی سے ضلع جھبوا کے چار سو گاؤں کے ایک لاکھ آدمی باسیوں کو سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے"

مدھیہ بھارت کے خود وزیر اعلیٰ کو متاثرہ علاقوں کا دورہ کرکے سخت حیرت ہوئی کہ زیادہ تر لوگ جنگلی پھلوں، تیبوئے املی کے بیجوں اور درختوں کی جڑوں پر گذارہ کر رہے ہیں (قومی آواز ۲۵ر اپریل ۱۹۵۲ء)

اس سے ایک دن پہلے (۲۳ر اپریل ۱۹۵۲ء) کی شملہ سے اطلاع ہے کہ ضلع حصار (پنجاب) میں مویشیوں تک کے لئے چارہ پانی کی اتنی قلت ہے کہ ستمبر سے اب تک دو ہزار دیگن چارہ بھیجا جا چکا ہے، مارچ و اپریل میں چارہ خریدنے کے لئے تین لاکھ اکتالیس ہزار کی تقاوی دی گئی۔ پانی کی قلت دور کرنے کے لئے نہر کھودی گئی تاکہ گاؤں کے تالابوں میں پانی اکٹھا کیا جا سکے۔

گرانی یوں ہی کیا کم ہے کہ بمبئی میں حکومت کو غلہ کے نرخ میں تھوڑا نہیں پچاس فی صدی کا اضافہ کرنا پڑا ہے جس کے متعلق ایک ہی دن بعد (۲۵ر اپریل) کی خبر ہے کہ سوشلسٹوں نے سیتہ گرہ کا تہیہ اور طے کر لیا ہے کہ غلہ گوداموں پر مارچ کرکے قبضہ کرلیں گے اور اسے پرانے داموں پر فروخت کریں گے۔

(قومی آواز ۲۶ر اپریل ۱۹۵۲ء)

تین چار سال کے اندر ملک میں لاکھوں ایکڑ زمین نئی زیر کاشت آچکی ہے

کروڑوں کا غلہ باہر سے آتا ہے پھر قحط و قلت، گرانی و کمی کا ہنوز روز اول ہی نہیں روز افزوں نظر آتا ہے اور حکومت والوں کی یہ بے بسی کیسی عبرت کی ہے کہ بس باتیں بنانے رہ جاتے ہیں۔

فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ۔ اس "تفکہون" کی ایک مثال یہ ہے کہ کیا کیا جائے آبادی بہت بڑھتی جاتی ہے۔ ابھی ۲۴ر اپریل ہی کو ہمارے ہندوستان کے وزیر غذا نے کل ہند زراعتی کانفرنس کی ایک تقریر میں اس بڑھتی آبادی پر اس طرح اظہار افسوس فرمایا کہ:

ایک طرف آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے دوسری طرف زمین کی قوتِ پیداوار کم ہوتی جارہی ہے جس سے ملک کو سخت غذائی دشواری کے سامنے کا اندیشہ ہے

اور عبرت پر عبرت ہے کہ تھک کر ان مدعیانِ تدبیر کے ترکش سے آخری تیر اس طرح کے نکلنے لگے ہیں کہ ضبطِ تولید (برتھ کنٹرول)[1] کے ذریعہ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکا جاتے اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اناج کھانا ہی کیا ضرور ہے؟ بے اناجی غذا کے ادارے قائم ہو رہے ہیں، نمائشیں ہوتی ہیں، ہوٹل کھل رہے ہیں "تفکہونی" بے بسی ہی کی ایک مثال اور یاد آئی کہ کیا کیا جائے ارضی و سماوی آفات خشک سالی و تر سالی (سیلاب) وغیرہ دم ہی نہیں لینے دیتیں! کسی اخبار (غالباً پانیر) نے جھنجھلا کر جواب دیا کہ:

اتنے بڑے ملک میں اس طرح کی آفات تو ہمیشہ ہی کہیں نہ کہیں آتی

---

[1] شاید اس تعبیر کی شرمناکی چھپانے کے لئے اب نئی اصطلاح (F A M I S) (PLANING) (منزلی منصوبہ بندی) ایجاد کی گئی ہے۔

رہی ہیں اور آتی رہیں گی، اگر حکومت ایسے عذرات میں پناہ
لیتی رہی تو قحط و قلت پر کبھی قابو نہ پا سکے گی۔

مدعا ان ظنی و فرضی تفکہات کے ذکر کا فقط یہ ہے کہ انسانی تدابیر ہی اگر ملکی و عمومی قحط و قلت یا شخصی و انفرادی افلاس و عسرت پر قابو پانے کے لئے کافی ہوتیں تو کون ملک یا کون فرد ہے جو اپنی والی کوئی تدبیر اٹھا رکھتا ہے۔ مگر نتیجہ ہمیشہ ایک ہی نکلتا رہتا ہے کہ "لگ گیا تو تیر نہیں تکا"، اگر کامیابی ہو گئی تو اپنی خوش تدبیری پر ناز[1] ورنہ تفکہات کی کیا کمی، سیدھی بات سمجھنے سے گریز نہ ہو تو معاشیات کیا انسانی تدابیر کا زندگی کے سارے چھوٹے بڑے معاملات میں یہی حال ہے کہ تیر کبھی لگا کبھی نہیں لگا۔ جس کے معنی یہی ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر کوئی اور غیبی قوت یا مشیت دخیل کار ہے۔ جنہوں نے اس مشیت کو پایا اور مانا ہی نہیں وہ تفکہاتی باتیں سیاسیات و معاشیات میں بھی جتنی چاہیں بناتے رہیں لیکن اسلامی توحید (لا الٰہ الا اللہ) کے بنیادی اقرار ہی کا مطلب جب یہ ہے کہ ہر قسم کا نفع و ضرر، فعل واثر، شہادتی تدابیر و اسباب کے نہیں بالکلیہ غیبی مسبب الاسباب کے ارادہ و مشیت کے تابع ہے تو اسلامی سیاسیات و معاشیات کا بھی یہ اقرار کوئی جزئی و فرعی مسئلہ نہیں بلکہ بالکل ابتدائی مطالبہ اور اساسی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت جس کو چاہتی ہے ملک دیتی ہے اور جس سے چاہتی ہے چھین لیتی ہے اور اسی کی مشیت جس کو چاہتی ہے بے حساب رزق عطا فرماتی ہے تُؤْتِی الْمُلْكَ

---

[1] اب ۵۳ء کے اواخر میں کہا جاتا ہے کہ غلہ کی کمی تو نہیں رہی (گو گرانی بدستور ہے) لیکن بیکاری کی مصیبت روز افزوں، یعنی غلہ ہو بھی تو خریدنے کے لئے پیسہ نہیں نتیجہ دونوں صورتوں میں معاشی تنگی ہی رہا ۱۲

مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ......وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ؕ

"خود اپنا تجربہ اپنے اور اکثر عزیزوں دوستوں کے انفرادی واقعات تک میں یہی ہے اور جو بھی ذرا غور کرے گا یہی تجربہ ہوگا کہ معاش و رزق کا معاملہ بالخصوص کچھ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ہی ظاہر ہوتا ہے اور تدبیر کے تیر بالعموم نشانہ سے ہٹ کر ہی گرتے ہیں۔ بارہا دیکھا کہ انگریزی تعلیم میں طالب علمی میں جس کو بڑا ہونہار خیال کیا جاتا تھا وہ کچھ نہ ہوئے اور جن کو انہوں سمجھا گیا تھا وہ ہونہاروں سے میدان معاش میں کہیں آگے نکل گئے۔

تجارت وغیرہ ہر چیز میں یہی مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بارہا جس شخص اور جس چیز کی تجارت کے چلنے کے ظاہری اسباب زیادہ ہوتے ہیں وہ رہ جاتی ہے اور جس کے ظاہری امکانات کم ہوتے ہیں وہ چل جاتی ہے باقی نکات بعد الوقوع تو ہر واقعہ میں نکال ہی لئے جاتے ہیں۔" (تجدید تعلیم و تبلیغ ص۹۷)

قانونِ مشیت نہ کہ قانونِ معیشت

غرض کوئی مانے نہ مانے لیکن اسلامی معاشیات کا نام لینے والوں، اس پر کتابیں اور مضامین لکھنے والوں کو اس کے سمجھنے سمجھانے کے سوا حق ہی کیا حاصل ہے کہ معاش یا رزق کی کمی و زیادتی، تنگی و فراخی یا خود قرآن کی تعبیر میں بسط و قدر کا تعلق نہ معاشی اشیاء کے قوانین طبیعت سے ہے اور نہ انسانی تدبیروں کے تیروں یا انسان کے خانہ ساز قوانین معیشت سے، بلکہ اس کا

دار و مدار تمام تر اللہ تعالیٰ کے دیدہ و دانستہ قانون مشیت پر ہے اور معاشی مشکلات کا حل خود قدرت والے خدا کے بتائے ہوئے قوانین مشیت میں ڈھونڈھنا چاہیئے نہ کہ بے بس بندوں کے بنائے ہوئے قانون معیشت میں رزقی مشیت پر اس کی گوناگوں حکمتوں کی طرف اشارات کے ساتھ جس تکرار و اصرار کے ساتھ زور دیا گیا ہے ذیل کی آیات سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

کہیں اس مشیت کو صفت رب کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ پالنے یا پرورش کرنے والا ہی اپنے زیر پرورش کی مصلحتوں یا نفع و ضرر کو خوب جانتا ہے کہ اس کی کونسی حاجت کس کمیت و کیفیت یا کس مقدار و صورت میں پوری کرنی چاہیئے۔ پھر انسان کے پیدا کرنے والے رب (پروردگار) سے بڑھ کر اپنے زیر پرورش بندوں کی فطرت و خلقت کے منافع و مضار کو کون پوری طرح جان اور سمجھ سکتا ہے اور اس کے مناسب اس کی معاشی یا رزقی حاجتوں کو بسط یا قدر کے ساتھ پوری کر سکتا ہے ان ربک یبسط الرزق لمن یشآء ویقدر کے ساتھ فرمایا کہ انہ کان بعبادہ خبیرا البصیرا کہ وہی اپنے بندوں کے حالی و مآلی دنیا و آخرت کے مصالح کی پوری پوری خبر و بصیرت رکھتا ہے۔

آدمی کو مال و دولت پر کتنا گھمنڈ ہوتا ہے خصوصاً غریبوں کے مقابلہ میں کہ ہم پر بھلا کوئی مشکل و مصیبت کیا آسکتی ہے، ہر چیز کا مقابلہ مال و دولت سے کرلیں گے اسی گھمنڈ میں انبیاء و مرسلین کے ڈرانے کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ان سے اور ان کے غریب پیرؤوں سے اکڑ اکڑ کر کہتے ہیں کہ ہم تو

ؔ معاشی مشکلات کا یہ اسلامی حل انشاء اللہ آگے آخر باب میں ملیگا۔

تمہاری باتوں کو ماننے والے نہیں ہم مال و اولاد سب میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں ہم پر بھلا وہ عذاب کیا آسکتا ہے جس سے تم ڈراتے ہو۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ (سبا ع ۴)

فرمایا کہ ان مال و اولاد پر اکڑنے والوں سے کہدو کہ ”یہ تو میرے پرورش فرمانے والے (رب) ہی کا کام ہے کہ (اپنی پرورشی حکمتوں کے تحت) جس کو چاہتا ہے رزق زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے لیکن اکثر نادان انسان (ان حکمتوں کو) جانتے نہیں۔“

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝

سب سے بڑی حکمت و مصلحت تو آخرت کی فلاح اور خدا کا قرب ہے سو خوب جان لو کہ تمہارے اموال و اولاد (جن پر اتراتے ہو) تم کو ہمارا مقرب نہیں بنا سکتے مگر ہاں (ایسے اموال و اولاد والوں کو بھی ہمارا قرب نصیب ہو سکتا ہے) جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں (یعنی اموال و اولاد کو بھی ایمان و عمل نیک ہی کی راہ میں لگائیں اور چلائیں) یہ لوگ البتہ ایسے ہیں کہ ان کو اس عمل کی بدولت (کہ مال و اولاد کو بھی خدا ہی کی راہ میں لگایا) دہرا بدلہ ملیگا اور جو لوگ (مال و اولاد کے گھمنڈ میں ہماری ان حکمتوں اور انتظامی مصالح اور معاملات کی) آیات میں ہم کو ہرانے کی کوشش کرتے ہیں (جیسے آجکل کی مدعیانِ رازقیت حکومتیں تو یاد رکھیں کہ) ان کو عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ لہذا پروردگار کے پرورشی معاملات و انتظامات میں ان ہرانے والی کوششوں کے دخل

در معقولات سے باز رہیں اور پھر تاکید ان کو سنا دو، کہ یہ کام تو صرف میرے پروردگار (رب) ہی کا ہے کہ (پرورش کے مناسب) جس کو چاہتا ہے رزق زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے اور اگر تم کو زیادہ دیا ہے تو گھمنڈ کرنے کے بجائے اس کو دینے والے ہی کی راہ میں خرچ کرو۔ اس طرح جو کچھ بھی تم خرچ کروگے (وہ رائیگاں نہ جائے گا بلکہ پروردگار) اس کا بدلہ دے گا اور وہی بہترین رزق دینے والا ہے۔

وَمَا اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ○ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ○ (سباء ع ۵)

صفتِ رب ہی کے سیاق و سباق میں سورۃ شوریٰ کے دوسرے رکوع میں ارشاد ہے:۔

"کہ اے محمدؐ! آپ ان مشرکین سے کہئے کہ جس بات میں تم (اہلِ حق کے ساتھ) اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے (باقی اپنا معاملہ تو یہ ہے کہ جس اللہ کی او پر شان توحید و قدرت وغیرہ بیان ہوئی) اسی اللہ کو اپنا رب مانتا ہوں (اور جو رب ہے لازماً اسی کی مشیت و مرضی پر) بھروسہ کرتا اور (ہر معاملہ میں) اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ وہی

ہر بات کا پوری طرح سننے دیکھنے والا ہے اسی کے ہاتھ میں آسمان و زمین کی کنجیاں ہیں۔

اس کے بعد معاً فرمایا کہ وہی ربوبیت یا پروردگاری پر مبنی حکمتوں کے موافق اپنی قدرت کی ان کنجیوں سے کھول کر وہ جس کو چاہتا ہے رزق زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے، بیشک وہی ہر شے کی حکمت و مصلحت، کو کماحقہ، جاننے والا ہے"

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ
ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝
لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

صفت رب کی اس خصوصیت کے علاوہ خود ذات جامع الصفات اللہ کی طرف نسبت فرما کر بھی رزق کی بسط و قدر کو اسی کی مشیت پر بالکلیہ مبنی ہونے کو جابجا دہرایا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی متنبہ فرمایا گیا ہے کہ رزق کی بسط یا معاشی کشادگی ہر حال میں اور ہر شخص کے لئے لازماً خیر ہی نہیں ہوتی۔ رعد کے تیسرے رکوع میں اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ کے ساتھ ہی فرمایا کہ منکرین جن کو کچھ دنیوی مال و دولت کا حصہ مل گیا ہے وہ اس دنیوی (پست، زندگی پر اتراتے ہیں حالانکہ دنیا کی یہ (پست، زندگی آخرت کے مقابلہ میں ایک نہایت حقیر متاع کے سوا کچھ بھی نہیں۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ۝

اسی طرح عنکبوت کے چھٹے رکوع میں اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۝ کے ذرا آگے ہے کہ "یہ پست دنیوی

زندگی بجز کھیل کود کے کچھ بھی نہیں، اور زندگی تو بے شک بس آخرت ہی کی زندگی ہے کاش (جو ناداں اس کھیل کود کی زندگی میں مگن ہیں) وہ اس کو جانتے۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ o تو اس کھیل کود میں زندگی گنوانے کی حماقت کیوں کرتے؟ مطلب یہی ہوا کہ رزق کی بسطی وقدری حکمتوں یا معاشی کشادگی وتنگی کی مصلحتوں کو محض کھیل کود میں گنوانے والی چند روزہ زندگی کی ترازو میں تولتے اور اتراتے رہنا آخرت سے بے خبری وغفلت کی حماقت کے سوا کیا ہے۔

بلکہ درحقیقت اس غفلت وحماقت ہی نے دنیوی زندگی کو کھیل کود بنادیا ہے ورنہ اگر اسی معاشی خوشحالی وفراغت یا مال ودولت کو خدا کی راہ میں لگایا اور آخرت بنانے والے مصارف میں صرف کیا جاتا تو سراسر کامیابی وکامرانی کا ذریعہ بن جاتی۔ کیا روزمرّہ کے تجربات سے دیکھتے نہیں کہ رزق ومعاش کی زیادتی وکمی کا مدار خالی انسانی تدبیروں پر نہیں، اللہ ہی جس کو چاہتا ہے رزق زیادہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے، بے شبہ اس (زیادتی وکمی) میں ایمان لانے والوں کے لئے (اللہ کی حکمتوں کی) نشانیاں ہیں۔ بس اگر اس معاشی کشاکش کا حقیقی اُخروی نفع حاصل کرنا ہے تو اس کو اہل حقوق پر اللہ کی راہ میں خرچ کرو، رشتہ دار کو رشتہ دار کا حق دو مسکین کو مسکین کا۔ اور مسافر کو مسافر کا (اسی طرح اور بھی جو مالی حقوق اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان کو ادا کرنے میں) ان لوگوں کے لئے بھلائی ہے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ

إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ فَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (روم ع ۴)

لیکن عام آدمی کا حال یہ ہے کہ جہاں اس کو کچھ خوشحالی یا مال ودولت کی نعمت عطا ہوئی تو خدا و آخرت سب کو بھول کر الٹے اس کو اپنی دانش وتدبیر کا نتیجہ جاننے لگتا ہے (ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَا اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ) حالانکہ دراصل یہ آزمائش ہوتی ہے کہ دیکھیں تم ہمارے اس عطیہ و نعمت کو دنیا ہی کی پست زندگی اور کھیل کود میں کھپا دیتے ہو یا اس سے ہماری رضاجوئی اور آخرت کی فلاح کا کام لیتے ہو۔ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اس کے کچھ ہی آگے سورۃ زمر (ع ۵) میں پھر اسی حقیقت کا اعادہ فرمایا گیا ہے کہ کیا خود روزمرہ کے معاشی ورزقی تجربات سے لوگوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے اور اس (زیادتی وکمی) میں ایمان لانے والوں کے لئے (اللہ کی حکمتوں کی) نشانیاں ہیں اَوَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

اسلامی زندگی کی منطق

اسلامی معاشیات پر خامہ فرسائی کرنے والے خود مسلمان یہ تو بڑی دھوم دھام سے دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب انسان ہی

کے لئے پیدا کیا گیا ہے (خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا) زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے تمہاری خدمت و تابعداری کے لئے ہے (سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ) لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ بیشک دنیا تو تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے، مگر تم الٹ کر خود دنیا کے لئے نہیں پیدا کئے گئے ہو کہ اسی کے پیچھے جان دیتے رہو، سارا مغالطہ اسی الٹی منطق اور اصلی اسلامی منطق کے صرف ایک مقدمہ اَلدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ کو یاد رکھنے اور دوسرے وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ کو فراموش کر دینے کا ہے حالانکہ خود قرآن مجید میں یہ تو دو ہی چار جگہ ملیگا کہ دنیا انسان کے لئے ہے، سارا زور بیسیوں مقامات پر ذرا سے تعبیری اختلاف سے اسی پر ملتا ہے کہ خود انسان خدا و آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہی انسانیت کا مرجع اور منتہیٰ ہے، اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی، اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَہٰھَا، اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ، اِلَیْہِ مَاٰبٌ، وغیرہ عنوانات سے معاشی و سیاسی ہی نہیں، پوری اسلامی زندگی کی منطق کے دوسرے ہی مقدمہ پر بار بار زور دیا گیا ہے۔

ان دونوں مقدموں کے ملانے سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے وہی ہر شعبہ میں ٹھیک اور ٹھیٹھ اسلامی زندگی کا تصوّر و معیار ہے، یعنی جب دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم خدا و آخرت کے لئے تو دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو اس طرح استعمال کرو کہ خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح و نجات حاصل ہو بالفاظ دیگر دنیا اور اپنے دونوں کے پیدا کرنے والے کی منشاء و رضا کے مطابق زندگی بسر کرو، یہی تمام شعبوں کی طرح زندگی کے معاشی شعبہ میں بھی عبادت و عبدیت بندگی و سرافگندگی والی وہ اسلامی زندگی ہو گی جس کے لئے انسان

پیدا کیا گیا ہے اور جس کو اوپر معاشیات عبدیت کے عنوان سے واضح کیا
جاچکا ہے اسی منطق کے مطابق زندگی وہ صالح زندگی ہے جس کا ایمان کے
ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کو جوڑ کر ہر جگہ مطالبہ کیا گیا اور موت و زندگی
کا سارا ہنگامہ اسی حُسنِ عمل کی آزمائش و امتحان کے لئے برپا کیا گیا ہے
خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط زمین
پر ہم کو اپنا جانشین (خلیفہ) بنا کر اور بعض کو بعض پر برتری دے کر جاہی و مالی یا
معاشی وغیرہ زندگی کی ہر راہ میں جو اونچ نیچ خود ہمارے پالنے والے رب نے
رکھ دی ہے یہ اسی لئے ہے کہ ہمارے پرورشی مقام و مصالح کے لئے ہم کو
امتحان سے گذارا جائے۔ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ
فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْمَآ اٰتٰىكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ
الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ الرَّحِيْمٌ ط

نبوی تمثیل میں اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا گیا ہے کہ دنیا آخرت کی
کھیتی ہے اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ یعنی اس کھیتی کے لئے دنیا کی مختلف
مخلوقات کی صورت میں تم کو زمین پانی، بیج بسارا اور کشادروزی کے آلات
وغیرہ جو کچھ بھی طرح طرح کے سامان دیئے گئے ہیں (فِيْمَآ اٰتٰىكُمْ) ان سب
کی غرض یہی امتحان ہے کہ تم ان سامانوں کو آخرت میں کام آنے والی کھیتی میں
لگاتے ہو یا نہیں۔ ضرورت ہی نہیں زینت کا بھی جو کچھ سامان اس زمین پر پھیلایا
گیا ہے وہ بھی حسنِ عمل ہی کے امتحان کے لئے ہے اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى
الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط اور اسی
لئے امتحان ختم ہوتے ہی سامانِ امتحان بھی ختم کر دیا جائیگا۔ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ
مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا جابجا کی ان مختلف تصریحات کے علاوہ ایک

جگہ زمین و آسمان سب کی پیدائش کی غرض دو ٹوک اسی حُسنِ عمل کے امتحان و ابتلاء کو فرما دیا۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط لیکن جو کور چشم سمٰوٰت و ارض کی اس ابتلائی آفرینش کے اصلی نتیجہ "بعث بعد الموت" ہی کے سرے سے منکر ہیں ظاہر ہے کہ وہ ایسی باتوں کو افسانہ و افسوں ہی جانیں گے وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

معاشی تنگی و فراخی کا مقصود

جب ساری کائنات ارضی و سماوی کا مدعا انسان کو اس کی انسانیت کی تربیت و تکمیل کے لئے ابتلاء و آزمائش سے گذارنا ہے تو معاشی تنگی و فراخی یا رزق کی بسط و قدر سے بھی مشیت کا مقصود اس ابتلاء ہی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

سورۂ الفجر میں معاش و رزق کی اس ابتلائی نوعیت کو خصوصیت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، پہلے عاد و ثمود، فرعون وغیرہ کے سے جاہ و مال، سلطنت و ثروت والے بڑے بڑے جباروں کی سرکشی و فساد انگیزی اور پھر اسی دنیا میں تہہ و برباد ہونے کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَكْرَمَنِ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ

بہر حال آدمی کا یہ حال ہے کہ جب اس کو اس کا پروردگار بطور آزمائش عزت و نعمت عطا کرتا ہے تو اکڑنے اور کہنے لگتا ہے کہ مجھ کو تو میرے پروردگار

رَبِّیٓ اَھَانَنِ ط

نے معزز بنایا ہے دوسری طرف جب آزمائش ہی کے طور پر رزق یا معاش میں کمی یا تنگی کردی جاتی ہے تو بے صبر ہو کر کہنے لگتا ہے کہ مجھ کو تو میرے پروردگار نے ذلیل ہی کر ڈالا

آگے شدت کے ساتھ متنبہ کیا گیا کہ ہرگز نہیں (کَلَّا) اصل بات نہ یہ ہے نہ وہ، تم کو مال وجاہ دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسروں کے مقابلہ میں اکڑو اور اپنی بڑائی ہانکو، بلکہ دراصل یہ تمہارا امتحان ہے کہ تم اس جاہ ومال کو یتیموں، مسکینوں وغیرہ کی خدمت وعزت میں خرچ کر کے اپنی انسانیت وآخرت کو سنوارتے ہو یا نہیں، سو تمہارا عام حال یہ ہے کہ تم خود یتیموں کی قدر پہچانتے ہو نہ دوسروں کو مسکینوں کو کھلانے پلانے پر اپنی مثال دے کر ترغیب سے آمادہ کرتے ہو۔ حد یہ ہے کہ خاص اپنی ہی کمائی نہیں میراث تک کے مال کو سمیٹ کر خود ہی اپنے عیش وعشرت پر اڑا دیتے ہو، پھر بھی مال سے جی نہیں بھرتا اور جائز وناجائز، حق وناحق کی تمیز کے بغیر اس کے عشق وطلب میں غرقاب رہتے ہو۔ کَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔

حالانکہ اپنی واجبی ضرورتوں سے جو زائد مال تم کو دیا گیا تھا اس کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ اپنی ہی عیش وعشرت جاہ ومنزلت کا اس کو ذریعہ بنالو، اور پھر بھی ھل من مزید کی جہنم نہ بھرے، بلکہ وہ دراصل تمہاری اس آزمائش کے لئے تھا کہ دوسرے اہل حقوق اور اہل حاجت پر صرف کر کے

اپنی انسانیت و آخرت کے بناؤ کا انتظام کرلو لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو اب کان کھول کر سن لو کہ آخرت یا قیامت میں

"جب زمین ریزہ ریزہ کردی جائیگی (یعنی یہ دنیا برباد کردی جائیگی اور جس امتحان کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اس کے نتیجہ کا فیصلہ و اعلان فرمانے کے لئے) تمہارا پروردگار صف در صف (کاتب اعمال وغیرہ) فرشتوں کے ساتھ (میدان حشر میں) تشریف فرما ہوگا اور ساتھ ہی (تمہارے امتحانی نتیجہ کی جگہ) جہنم کو بھی سامنے لایا جائے گا اس دن سمجھ آئے گی لیکن اب سمجھ آنے کا وقت کہاں رہا ہوگا؟ (بے بسی کے عالم میں حسرت سے) آدمی کہنے لگے گا کہ کاش میں نے اس (اخروی) زندگی میں کام آنے والا کوئی عمل بھیجدیا ہوتا لیکن اس دن نہ خدا کے عذاب کے برابر کوئی عذاب دینے والا ہوگا اور نہ اس کی جکڑ کے برابر کوئی جکڑنے والا"

كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا وَّجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا وَّجِايْۤءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗ اَحَدٌ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ ط

دوسری طرف جو لوگ دنیا کی عیش و عشرت میں آخرت یا اپنے پروردگار (رب) کی طرف واپسی کو نہ بھولے، مال و دولت جاہ و عزت کی کثرت و قلت بسط و قدر کے جس حال میں بھی رہے، اپنے اپنے مقام امتحان کے حقوق نفس کو ایمانی اطمینان کے ساتھ ادا کرتے رہے ان سے ارشاد ہوگا کہ

"اے اپنے پروردگار پر اعتماد و اطمینان رکھنے والے نفس اب تو پروان چڑھ کر (یعنی عبدیت تکمیل کے ساتھ) اپنے پالنے والے کے پاس اس طرح خوش خوش واپس ہو کہ وہ تجھ سے خوش ہے اور تو اس سے، پس میرے بندوں (یعنی عبدیت و بندگی کا امتحان پاس کرنے والوں) داخل ہو جا اور داخل ہو جا میری جنت میں (جو میں نے اپنے بندوں ہی کیلئے تیار کی ہے)۔"

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بروم
راحتِ جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
حجاب چہرۂ جاں می شود غبار تنم
خوشا دمے کہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم
چنیں قفس نہ سزائے چو من الحان است
روم بہ گلشنِ رضواں فرغ آں چمنم

معاشیاتِ عبثیّت
یا
معاشیاتِ جدیدہ

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ط (مومنون ۶)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی عبث (مہمل) پیدا کر دیا ہے۔ اور (اپنے پیدا کرنے والے یعنی) ہمارے پاس تم کو پلٹ کر آنا نہیں (کہ تمہارے پیدا کرنے کا کچھ نتیجہ نکلے) اللہ تعالیٰ جو سراپا بادشاہ حق ہے اس کی شان (ایسی باطل کاری یا عبث کاری سے) قطعاً بلند ہے۔

لاپلاس نامی اٹھارہویں صدی کے ریاضیات و فلکیات کے ایک نامور محقق نے اپنی ایک بڑی تصنیف نپولین کو پیش کی، جس میں خدا کا نام تک نہ تھا۔ نپولین نے وجہ پوچھی، تو نہایت بیباکی سے جواب دیا کہ مجھ کو اس میں خدا کے ماننے کی ضرورت کہیں نہیں پڑی[1]۔ اسی ذہنی ساخت کے وارث بہت سے سپوتوں نے یورپ میں مادرزاد ننگوں کی مستقل

---

[1] حصل، بالکل یہی، حوالہ ٹھیک سامنے نہیں۔

آبادیاں اور کلب بنا رکھے ہیں ان کا تجربہ بھی بالکل یہی ہے کہ لباس کی کہیں ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہزاروں لاکھوں سال سے زمین کے اسی کرہ پر ہزاروں لاکھوں قسم کے جانور رہتے بستے چلے آ رہے ہیں کسی کو کبھی لباس کے ایک چیتھڑے کی بھی قطعاً ضرورت نہیں پڑی، وہ تو غریب انسان ہی کو اس کی انسانیت کی بدولت پڑی تھی۔ اب اگر نام نہاد انسانوں کی کوئی جماعت یا آبادی اپنے کو سرے سے "انسانیت" ہی سے ننگا کرنے پر تل گئی ہو تو ظاہر ہے کہ لباس ہی کی طرح خدا کی ضرورت بھی کیوں محسوس ہونے لگی، آخر جانوروں نے بھی تو کبھی خدا کی ضرورت قطعاً محسوس نہیں کی نہ خود خدا نے ان میں کوئی رسول بھیج کر اس کی تکلیف دی۔ پھر جب انسان خود ہی اپنی خدا طلب انسانی یا خلاقی فطرت و خلقت کو بھلا کر صرف نام کا انسان رہ جائے تو قدرتی معاملہ اس کے ساتھ یہی ہو سکتا ہے کہ اپنے انسان ہونے کا تخیل ہی اس کے دل و دماغ سے نکال باہر کر دیا جاتے حتیٰ کہ اکڑ اکڑ کر خود ہی اپنے کو بڑھیا جانور (NIGHER ANIMAL) کہنے لگے نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ کی تفسیر کا اس سے بڑھ کر آنکھوں سے کیا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے [1]

انسانیت بیزاری کی انتہا

غرض خدا و آخرت کے برے بھلے مسیحی تصورات و عقائد کو خیرباد کہہ کر یورپ جس طرح خود اپنی انسانیت سے دستبردار ہو رہا تھا۔ لاپلاس

---

[1] انشاء اللہ "تجدید کلامیات" میں اس پر پوری بحث ہو گی کہ انسان کھانے پینے سے بھی زیادہ خدا کا بھوکا پیاسا ہے"

کا یہ تاریخی فقرہ دراصل انسانیت بیزاری کی اس انتہائی منزل ہی کی نشاندہی کر رہا تھا۔ جو آگے چل کر صدی ڈیڑھ صدی کے اندر ہی علمی و عملی پوری فرنگی زندگی پر چھا گئی۔

ذہن کے اس سانچہ میں ڈھلی ہوئی معاشیات پر بھی جو کتابیں پڑھی پڑھائی اور لکھی لکھائی جاتی ہیں یا جو موقت رسائل اور ماہنامے وغیرہ مستقل معاشی مسائل پر نکلتے رہتے ہیں وہ یا تو تمامتر خدا اور آخرت کے انکار و نفی پر مبنی ہوتے ہیں یا کم از کم خدا کی انہیں کہیں کوئی ضرورت قطعاً نہیں محسوس کی جاتی۔ ان کا تعلق انسان کے آغاز و انجام دونوں سے بے پرواہ ہو کر صرف بیچ کی اس دنیوی زندگی کی معاشی فلاح و فساد سے ہوتا ہے یعنی عام انسانوں یا کسی ملک و خطہ کے خاص باشندوں پر کسی عام یا خاص معاشی روش و رویہ کا صرف اس زندگی کی حد تک نیک و بد بُرا بھلا کیا اثر پڑتا ہے جس کا مطلب یہی ہوا کہ انسان کی اس پوری زندگی کا کوئی آخری مقصد و مدعا نہیں یوں ہی عبث یا مہمل و باطل طور پر پیدا ہو پڑا ہے جو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فرض کیا جا سکتا۔ جب اس کی پیدا کرنے والی کوئی علیم و حکیم "الملک الحق" ذات نہ ہو،

تعین مقصد کے بغیر وسائل کا تعین ناممکن

لیکن کھانے پینے رہنے سہنے وغیرہ کی ضروریات چونکہ زندگی کے محض معاشی ذرائع و وسائل ہی ہیں اس لئے جب تک خود زندگی کی کوئی غرض و غایت انجام و آخرت یا اخلاقی قدر و قیمت نہ لگائی جائے اس کے کسی ذریعہ و وسیلہ یا کسی عام و خاص معاشی روش و رویہ کے بُرے

بھلے ہونے کا فیصلہ کیسے ممکن ہے؟ کسی شئے یا کسی فعل کو بُرا بھلا تو کسی معلوم مقصد و مدعا کے مدِ نظر ہی ٹھہرایا جا سکتا ہے جو چیز اس مقصد کی تحصیل و تکمیل میں ممد و معاون ہے وہ اچھی، جو مزاحم و مانع ہے وہ بری۔

جب معاشیات کے سارے مسائل و مباحث کا تعلق ہر پھیر کر انسانی زندگی کی کسی نہ کسی معاشی ضرورت و حاجت ہی سے ہے تو جب تک خود زندگی کی ضرورت و غایت متعین نہ ہو اس کی معاشی ضرورتوں کی تکمیل و تشفی کے کسی معاشی نظریہ و نظام کے حسن و قبح، عیب و ہنر، یا فلاح و فساد کا تعین کیسے کیا جا سکتا ہے، کسی چیز کے صحت و سقم، خطاء و صواب کا معیار و میزان تو وہ غرض و غایت ہوتی ہے جس کے ماتحت یا جس کے حق میں مفید و مضر ہونے کی بنار پر اس کو صحیح و غلط یا جائز و ناجائز کہا جاتا ہے، معاشیات یا معاشی اشیاء و افعال ہی پر کیا موقوف، زندگی کی کسی نقل و حرکت کو بُرا بھلا نیک و بد کہنے کے کوئی معنی ہی نہیں بتائے جا سکتے، جبتک کسی خاص مقصد و مدعا کے اعتبار سے پہلے اس کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہ ٹھہرالی جائے معاشیات ہی کی ایک مشہور عالم کا قول[1] ہے کہ:۔

"کسی دیوار میں کبھی کوئی کیل بھی تو بلا اخلاقیات کے نہیں ٹھونکی گئی، اور آپ کہتے ہیں کہ تم معاشیات سے اخلاقی احکام کو یکسر نکال دو"

اس طرح کی آوازیں بجائے خود منطقی قوت کتنی ہی رکھتی ہوں لیکن جدید فرنگی معاشیات کے مولد میں بھی یہ سنی سنائی اسی وقت تک کچھ جا سکتی تھیں جب تک مسیحی مذہب کے بچے کھچے اثرات کی کچھ گرفت ذہنوں پر باقی تھی ورنہ معاشیات کے موجودہ مغربی اساتذہ و مصنفین اس قسم کی بحثوں سے

---

[1] دیکھو "معاشیات مقصد و منہاج" از ڈاکٹر ذاکر حسین خان صفحہ ۲"

اب عموماً اکثر اہی جانتے ہیں تو پھر ہم مشرقی شاگرد رشیدوں کا کہنا ہی کیا

ع آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

بات لے دے کر وہی ہے کہ آدمی نے جب اپنی زندگی کا رشتہ اپنے اعمان یا پیدا کرنے والے سے توڑ لیا تو پھر دوسرا کون ہے جو علم و یقین کے ساتھ اس کی پیدائش کے انجام و آخرت کی روشنی اس کو عطا کر سکے

مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ط

ظن و خرص کی تاریکیاں

معاشیات ہی نہیں، سیاسیات و اخلاقیات، قانون اور معاشرات وغیرہ سارے عمرانی علوم حاضرہ کے علماء انسانی زندگی کے مآل و مدعا کو کھو کر لال بجھکڑوں کے ظن و خرص کی تاریکیوں میں بھٹکتے ملیں گے اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ × اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ہ اور ہر نیا لال بجھکڑ علم کے نئے نئے دعووں کے ساتھ جہل ہی کی نئی نئی تاریکیاں پھیلاتا رہتا ہے خدا بھلا کرے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا کہ انہوں نے معاشیات کی عام چالو اور چلتو راہ سے ہٹ کر بعض اصولی و اساسی بحثوں کا ایک اچھا دلچسپ خلاصہ خود اردو میں ہمارے لئے فراہم کر دیا ہے۔ حاصل سب کا یہ ہے کہ وحی و نبوت کی روشنی سے محرومی اختیار کر لینے کے بعد انسان کے پاس اس کے ناقص و محدود روز بروز بدلنے والے تجربات کے سوا چونکہ علم و عمل کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی اور ان تجربات سے "کیا ہے" سے آگے "کیا ہونا چاہئے"۔ یعنی زندگی کے کسی مقصدی معیار و میزان کا پتہ چل نہیں سکتا اس لئے بس جو کچھ "ہے" اسی کو قبول کر لینا ہے، یا زیادہ سے زیادہ "چاہئے" کی جگہ "ہونے" ہی کا کوئی شاعرانہ

فلسفہ گھڑ کر خود انسان کو خدا اور اس کے آغاز و انجام سے نا آشنا ہو جو وہ زندگی ہی کو بذاتِ خود مقصود و مطلوب بنا لیا جاتے،

اٹھارہویں صدی میں جب متکلمین (یا دین اور وحی و نبوت) کے فلسفہ کی سرد بازاری ہوئی تو

"ایک اور فلسفیانہ عقیدہ معیاری معاشیات کی بنیاد بنا جس کو کائنات کی ہم آہنگی کا مسلک کہتے ہیں اس نے اپنے تصورِ کائنات میں مرکزی جگہ خدا کے بجائے انسان کو دی"

یعنی جو جانشین (خلیفہ) و امین تھا وہ باغی و غاصب بن بیٹھا پھر نتیجہ جو ہونا تھا ہوا۔ کہ:۔

"کائنات کا مقصد اب یہ نہ رہا کہ اس کے مظاہر سے خالقِ عالم کی شان و قدرت کا اعلان ہو، بلکہ یہ کہ انسان اس میں سکھ اور چین امن و آرام سے رہے۔ اپنی جبلت پر چلنے کے لئے آزاد ہو کوئی روک ٹوک نہ رہے"

ٹیپ کا بند یہ ہے کہ:۔

"پابندیاں نہ ہوں تو انسان کی زندگی میں خود بخود صلح و آشتی امن و شانتی پیدا ہو جائے گی اور ہم آہنگی کا دور دورہ ہو گا جیسے افلاک میں ستاروں اور سیاروں کی ہم آہنگی و ترتیب ہے"

آگے خود ڈاکٹر صاحب جو "آخر ڈاکٹر صاحب" ہیں عقیدت مندی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ:۔

یہ فلسفیانہ مسلک مغربی روشن خیالی کی بہار کا پھول ہے جس کی آبیاری میں ڈیکارٹ، نیوٹن اور روسو کا کا بہت حصہ ہے"
(ص ۲۴)

قدرت کی ستم ظریفی

دیکھئے کہ بیسویں صدی ابھی اپنے دوسرے ہی دہے میں تھی کہ پہلی جنگ ۱۹۱۴ء نے اس "روشنیٔ طبع" کے "برمن بلا شندی" کی ابتداء کردی اور اس ابتدا، پرچوتھائی صدی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ خزاں کے ایک اور زیادہ تند جھونکے (دوسری جنگ ۱۹۳۹ء) نے اٹھارھویں صدی کی نوپیدا مغربی روشن خیالی" کی کہنا چاہیئے کہ ساری بہار ہی کو لوٹ لیا۔ پھولوں کی جگہ سارا چمن کانٹوں سے بھر گیا اور شاعرانہ فلسفہ نے بے روک ٹوک آزادی" کی راہ سے "صلح و آشتی" "امن و شانتی" کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر الٹ کر یہ نکل رہی ہے کہ دوسری "جہانگیر جنگ" کا خمیازہ دنیا ابھی بھگت ہی رہی ہے کہ تیسری "جہاں سوز جنگ" اور آلاتِ جنگ کی دیوانہ وار ہر طرف سے جھنکار سنائی دینے لگی ہے، پہلے اگر ایٹم بم ہیروشیما کے صرف ایک شہر کو برباد کرسکتا تھا تو اب نوایجاد ہائڈروجن بم کہا جاتا ہے کہ ایک آدھ شہر نہیں پورے ملک کے ملک کو ریگستان بنادے گا اور جراثیمی جنگ کی تصویر یہ کھینچی جاتی ہے کہ ہیضہ، طاعون وغیرہ مختلف وبائی بیماریوں کے جراثیم کو دشمن ملک میں گرا کر اس طرح پھیلا دیا جائیگا کہ

"بوڑھے بچے، عورت مرد سب ان امراض میں گرفتار اور سسک رہے ہیں ڈاکٹر نرس اسپتال کا سب عملہ بھی شکار ہے، ہزاروں لاکھوں انسان دم توڑ رہے ہیں اور حلق میں کوئی پانی کی بوند تک ٹپکانے والا نہیں، پھر جب اس حالت میں جنگ ختم ہوگی تو اس کے ساتھ وبائیں ختم نہ ہوں گی یا پورے ملک کو قرنطینہ کر دیا جائیگا

کہ جو مرتے ہیں مرتے رہیں۔ ان جراثیمی اسلحہ کے استعمال کے بعد بہت طویل عرصہ کیلئے مفتوح ملک کے سب کارخانے بند ہو جائیں گے۔ اسکولوں میں تالے پڑ جائیں گے اور ملک کا نظم ونسق ختم ہو جائے گا، افراتفری لوٹ مار اور بد اخلاقیاں عام ہو جائینگی

(الفرقان رجب ۱۳۷۱ھ ص ۴۵)

یہ ہے سکھ چین، "امن وآرام"، کا وہ نقشہ، اور بے روک ٹوک آزادی" کے اس فلسفیانہ عقیدہ" کا تحفہ جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ:

"انسان کی زندگی میں خود بخود صلح وآشتی، امن وشانتی پیدا ہو جائیگی" اور اس طرح ہم آہنگی کا دور دورہ ہوگا جو سیاروں اور ستاروں میں پائی جاتی ہے"!!

کچھ دکھ، کچھ ہنسی

کہ شاعری کے زور میں اتنی بھی عقل نہ رہی کہ ستاروں اور سیاروں میں ہم آہنگی نتیجہ ہے ان کی غیر ارادی وغیر اختیاری حرکات کا، ان کی خلقت نے تو اول دن ہی ارادہ واختیار کی امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا تھا ان کی مجبورانہ ہم آہنگی پر اس مختارانہ فطرت کا قیاس کس منطق سے صحیح اتر سکتا ہے جس کی امتیازی خصوصیت جبر نہیں، اختیار و اضطرار نہیں، ارادہ ہے اور ارادہ واختیار کی بے روک ٹوک آزادی کے معنی "ہم آہنگی"، نہیں، صرف "باہم آویزی" یا نزاع ہیں۔

ریت کی اس طرح کی بنیادوں پر کھڑا کیا ہوا۔ معیاری معاشیات"، کا کوئی فلسفہ کھڑا ہی کتنی دیر رہ سکتا ہے۔ آخر معاشیات کی ان بحثوں ہی

کے سلسلہ میں اسی کتاب میں یہ اقرار ملتا ہے کہ یورپ زندگی کی جس مذہب گریز راہ پر پڑ گیا تھا۔ اس میں کھاپی کر، یا بش بریں کچھ ظاہری آسائش و آرائش کے ساتھ کھاپی کر مرجانے کے سوا زندگی کے کسی اور مقصد و معیار کی گنجائش ہی کیسے نکل سکتی تھی

"بس آدمی کے لئے خود ہی زندگی، خود آرام و آسائش مقصود بالذات بن گیا، دوسری دنیا کے ادھار پر آدمی اس دنیا کے نقد کو ترجیح دینے لگا اور وہ رشتے جو قدیم مذہبی تہذیب میں سب افراد کو ایک مرکز کائنات یعنی ذاتِ الٰہی سے وابستہ کئے ہوئے تھے سب کے سب ٹوٹ گئے اور زندگی کے سارے اجزاء تتر بتر ہو گئے سیاسی زندگی میں، اجتماعی زندگی میں، ذہنی زندگی میں انتشار پیدا ہو گیا۔ تمدن کے اجزاء الگ الگ ہو گئے، ریاست الگ ہو گئی۔ علوم و فنون الگ ہو گئے، دین الگ، دنیا الگ، مذہب الگ، معیشت الگ" (ص۴۳)

آگے اور صاف سنئے، کہ:-

"ان میں سے ہر چیز خود اور بجائے خود مقصود بالذات ہو گئی، آرٹ کی خاطر، آرٹ شروع ہوا۔ یہ سوال نہ رہا کہ جاننے والا کیا جانتا ہے، بلکہ یہ کتنا جانتا ہے اس پر نظر نہ رہی کہ تصویر کا موضوع کیا ہے، بلکہ اہلِ نظر بس یہ دیکھنے لگے کہ کیسی بنائی ہے مقاصد کا زمانہ ختم ہوا ذرائع کا عہد شروع ہوا اور ہوتے ہوتے ذرائع و وسائل خود ہی مقصد بن گئے" (ص۴۴)

ذرائع پرستی کا جنون

معاشی زندگی جو قدرت کی عطا کی ہوئی فہم سلیم (CAMMON SENSE) کے سہارے تھوڑی بہت انفرادی و اجتماعی فکروں اور تدبیروں کے ساتھ بلے غل وغش چل رہی تھی، ذرائع پرستی کے اس جنون نے اس کو بھی علمی و فنی معاشیات کے ناپیدا کنار دفتروں میں گم کر دیا اور طرح طرح کی روز روز جنم لینے والی معاشی دعوتوں اور نظریوں کی بدولت معیشت کی سیدھی سادھی قدرتی زندگی آج زندگی کا سب سے پریشان اور بھیانک خواب بن کر رہ گئی، ان بے سروپا دفتروں، یا بہ

"علم (معاشیات) کے الگ مدون ہونے کی وجہ ایک تو وہی ہے جس کا تذکرہ ابھی ہو چکا، دوسرے دنیاداری کا غلبہ اس عہد کی کی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے معاشی زندگی بہت پیش پیش رہی، معاشی چیزوں کی قدر و قیمت تمدنی زندگی میں بڑھ گئی"
(صـــ۴۷)

دنیاداری کا غلبہ

مقاصد و اخلاق سے "پاک"، اس ذرائع پرست "ناپاک" دنیاداری کے غلبہ" کا ذکر ایک اور موقع پر آگے چل کر علمائے معاشیات ہی کے ایک مسلک کی ترجمانی میں اس طرح ملتا ہے کہ اس مسلک والے :-

"سب کے سب فلسفہ (یعنی زندگی کی کسی غرض و غایت کی جستجو) کے مقابلے میں علم کے حامی ہیں یعنی جو کچھ ہے اس سے بحث کرنا چاہئے "ہونا چاہئے" سے سرے سے سروکار نہیں تمام

مافوق التجربہ اور مابعد الطبیعاتی عناصر سے اپنے علم (معاشیات) کو پاک رکھنا چاہیئے، معاشیات میں اخلاقی احکام کے یہ سختی سے مخالف ہیں"

ذرا اور آگے کچھ اور سن لیں :-

ان کے نزدیک معاشیات کی اساس نفس انسانی کے عام قوانین ہیں اور تمام قوانین کا ماخذ فطرت انسانی کی عام نفسیاتی صفات ہیں"

ان نفسیاتی صفات میں ان دیدہ وروں کے نزدیک :-

خود غرضی

سب سے زیادہ عنصر نفسی جس پر اکثر ترتیبی معاشیوں نے اپنی علمی عمارت کی بنیاد رکھی ہے وہ خود غرضی ہے جو معاشی میدان میں خواہش دولت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس

عنصر کے ساتھ مالتھس نے خواہشِ تناسل کو بھی توام کر دیا ہے اور عرصہ تک یہ دونوں عناصر معاشی زندگی کے سارے کارخانے کی توجیہہ کیلئے کافی سمجھے جاتے رہے، گذشتہ صدی کے نصف آخر میں اس کے ساتھ ایک اور عنصر بھی شامل کیا گیا۔ یعنی ادراکِ حظ و کرب، محاسبہ افادہ، جس سے افادۂ مختتم والے تمام معاشی مظاہر کی تشریح کے مدعی ہیں" (ص ۵۹)

آگے مزید ترقی ملاحظہ ہو، ابھی تک معاشیات میں انسان کی انسانیت کو کم از کم اتنا دخل تھا کہ خود اس کا نفس بھی کسی شمار و قطار میں تھا، خواہ وہ

نفس حیوانی بلکہ شیطانی یا امّارہ ہی کیوں نہ ہو۔

"لیکن دوسرے لوگوں نے ان سادہ عناصر کی تلاش نفسِ انسانی میں (بھی) نہ کی، بلکہ انہیں خارجی، معاشی زندگی سے حاصل کرنا چاہا اور انہیں کے وجود اور ان کی حرکات پر معاشی زندگی کو منحصر کیا۔ سب سے پہلے تو یہ کام مقدارِ زر نے دیا پھر اس محنت کو جو اشیائے معاشی میں متشکل ہو گئی ہو، آخری عنصر مانا گیا، اور ریکارڈو، راڈبرٹس اور مارکس وغیرہم کے نظامہائے معیشت میں یہی مقدار محنت معاشی دنیا کی آخری بنیاد توجیہ بنی" (ص۵۹)

ایک ہی کتاب کے ان مختلف و منتشر چند اقتباسوں اور عبارتوں سے سرسری اندازہ ان مشترک رجحانات کا بخوبی ہو گیا ہو گا جو یورپ کی لائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی بے مقصد زندگی کی۔ جدید بلکہ جدید ترین علمی و عملی معاشی و سیاسی ذہنیت کے پیدا کرنے میں کارفرما رہے ہیں۔

بے مقصد بڑھیا جانور

خلاصہ سب کا وہی ہے کہ جب تک بری بھلی مذہبیت (مسیحیت) کا مغربی ذہنوں پر کچھ اثر باقی رہا بعض علمائے معاشیات کو بھی اس پر اصرار رہا کہ انسان کیڑوں مکوڑوں، چرندوں، پرندوں کی طرح کا نرا حیوان یا صرف بڑھیا جانور (HIGHER ANIMAL) نہیں ہے بلکہ اس کی انسانی فطرت میں حیوانیت سے اونچی بھی کوئی چیز، اور بڑی چیز، شریک ہے اس کی زندگی کا مآل و مستقبل خالی زمین پر چرنے چگنے اور مرجانے کے آگے

بھی کچھ ہے اور بہت کچھ ہے، لہٰذا اس کی زندگی کے معاشی مسائل اور ان کی اصلاح و فساد کا معیار بھی فقط حیوانیت نہیں۔ انسانیت اور فقط حال نہیں، مآل ہونا چاہیئے، لیکن دوسری طرف مذہب سے بڑھتی ہوئی بغاوت اس پر مصر تھی کہ ہم اپنے تجربہ و مشاہدہ کی آنکھوں سے چونکہ صرف اپنی حیوانیت اور حال ہی کو دیکھتے یا جانتے ہیں اس لئے اس کے ماوراء کسی دوسرے ذریعۂ علم سے انسانیت کا کوئی دوسرا مفہوم و مدعا پہچاننا ہی نہیں چاہتے نہ کسی اور معیار سے "چاہیئے" اور "نہ چاہیئے" کی بحث میں پڑنا پسند کرتے ہیں، بس جو کچھ سامنے ہے اسی کو سمجھ لینا چاہیئے، اسی کا نام "اثباتی معاشیات" رکھا اور بتایا گیا ہے۔ اس طرح زندگی کے کسی مقصد و مستقبل سے فرار کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا کہ زندگی کے جو ذرائع تھے وہی مقاصد بن گئے۔

پھر جس طرح جانوروں کا کھانا پینا، جینا جننا کسی دانستہ و ارادی اعلیٰ مقاصد پر مبنی اخلاقی احکام سے خالی ہوتا ہے اسی طرح انسان کی بے مقصد و بے معیار زندگی کی "معاشیات" میں بھی (اس کے علماء) اخلاقی احکام کے (دخل در معقولات) سختی سے مخالف ہونے کے سوا کیا ہو سکتے تھے لازماً جانوروں ہی کی طرح انسان کے معاشی محرکات کا سرچشمہ بھی "خود غرضی" خواہشِ تناسل" اور "حظ و کرب" یا الفاظ دیگر صرف اسی دنیا کی زندگی یا "دنیاداری کا غلبہ" اس عہد کی خصوصیت اور معیشت کا آئینہ دار ہے اس سے بھی بڑھ کر انسانی معیشت کے سراسر حیوانی تصور کی جس تازہ ترین ترقی پر لوگ رقص و وجد میں آپے سے باہر ہوئے جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب آدمی جانور ہی ٹھہرا تو اس کے چارہ کی مقدار کا فیصلہ بھی اس کی محنت و مشقت کی کمی بیشی کی مقدار ہی سے ہونا چاہیئے "مارکس

وغیرہ کے نظامہائے معیشت میں یہی بڑی دور کی کوڑی لائی گئی ہے کہ مقدار محنت ہی معاشی دنیا کی آخری بنیاد توجیہہ بنی۔

انسان کا اسلامی تصور

اس کے بالکل برعکس انسان کا اسلامی تصور ــــ جیسا کہ پہلے اچھی طرح معلوم ہوچکا ــــ یہ ہے کہ وہ حیوان صرف ظاہر میں ہے باطن میں اس کے نگاہ کرو تو معلوم ہوگا خدا جس کا تصور صفات کمال کی جامع ذات کے سوا کچھ نہیں، انسان دراصل اس کا خلیفہ و جانشین یا اس کے صفات کمال کا حامل و امین۔ مظہر اتم ہے اس کے اندر خدا نے خود اپنی روح پھونکی ہے اسی روح و روحانیت کی ترقی و تربیت کی خاطر زمین کی خلافت بخشی ہے، اسی خلافتی و اماناتی زندگی کے حقوق و فرائض کی ادائی کا نام عبادت اور اسی عباداتی یا عبدیت و بندگی والی زندگی میں پاس اور فیل ہونے کا نتیجہ آخرت یا جنت و جہنم کی ابدی صورت میں ظاہر ہوگا اس بندگی سے زندگی میں جو ہم آہنگی رونما ہوتی ہے وہ ستاروں اور سیاروں کی طرح طبعی قوانین کے جبر و اضطرار پر مبنی نہیں ہوتی، انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر پیدا کرنے والے نے اپنی جو صفت بطور خاص اس کو امانتاً سپرد فرمائی ہے وہ ارادہ و اختیار ہے آسمان و زمین اپنی جسمانی عظمت و وسعت کے باوجود جس امانت کے اٹھانے سے پیچھے ہٹ گئے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ یہی دانستہ و شعوری اختیار کی صفت تھی۔ اختیار و ارادہ کی اس اماناتی زندگی میں ہم آہنگی کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ امانت کو امانت رکھانے والے کی مرضی و منشاء کے مطابق نہ کہ کسی قانونی، یا جبلی جبر و اضطرار کے ماتحت خود اپنی خوشی اور سوچے سمجھے

اختیار وارادہ سے استعمال کیا جائے۔ ارادہ واختیار کے استعمال میں اس خلافتی وامانتی ہم آہنگی ہی سے دنیا کو اس نراج وانتشار سے نجات نصیب ہوسکتی ہے جو دوسری تمام تدبیروں سے روز بروز ہم آویزی میں ترقی کرتی جارہی ہے۔

حیوانی معاشیات

اسلام کی نظر میں جب انسان نرا معاشی حیوان نہیں تو اسلام کی انسانی معاشیات کو بھی آج کل کی نری حیوانی معاشیات سے دور کا بھی کیا لگاؤ ہو سکتا ہے لیکن کیا کہا جائے کہ خود مسلمانوں کا قلم اسلامی معاشیات کو کیسی کند چھری سے ذبح کرتا رہتا ہے کہ اس موضوع پر بالعموم حیوانی معاشیات ہی کی بولیاں ہم بھی بولتے رہتے ہیں یعنی اسلام کی معاشی تعلیمات و ہدایات کا منشاء و مرجع بھی سب کہنا چاہئے کہ اسی حیوانی یا دنیوی زندگی کے معاشی مسائل و مشکلات کا حل قرار دیتے ہیں اور اپنی آواز حیوانی معاشیات کی آوازوں میں اس طرح ملا دیتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی اصطلاحات کے نام کے سوا اسلامی روح بالکل نکل جاتی ہے۔

اچھوں اچھوں کی لغزش

یہ صورتِ حال کچھ معاشیات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس عہد کی جو امتیازی خصوصیت خود اس کے نمائندوں کی زبانی دنیا پرستی یا دنیا داری کا غلبہ" ابھی سن چکے، وبائی جراثیم کی طرح اس کا متعدی زہر اندر ہی اندر اتنا سرایت کر گیا ہے کہ دین کے اچھے اچھے صاحب علم و صاحب

صلاح حلقوں سے تعلق رکھنے والے قلموں کو بھی کیسی کیسی لغزش ہو جاتی ہے
ابھی پرسوں (۱۹ر مئی ۵۲ء) کو انگریزی کا ایک پندرہ روزہ موصول ہوا، ماشاء اللہ خالص اسلامی تعلیمات کا وکیل ہے، سارے مضامین قرآن و حدیث کے نصوص و اسناد سے مزین ہیں۔ پھر بھی ابتداء کے نوٹوں ہی میں خالص دینی عقائد و اعمال، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ تک کے جو اسرار و فوائد بیان کئے گئے ہیں سب کے سب کا تعلق کہنا چاہئے کہ خالص دنیا ہی سے بتلایا گیا ہے

"اسلام کے سارے اساسی عقائد اور اصولی اعمال کی غرض و غایت عالمگیر اخوت پیدا کرنا ہے نماز روزہ حج زکوٰۃ سب مسلمانوں میں اسی باہمی اخوت کی تعلیم و تاکید کے تخیل پر مبنی ہیں۔"

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (نماز قائم کرو میری (یعنی خدا کی) یاد کے لئے) والی نماز با جماعت کی ضبط و نظم کی تدبیری حیثیت کی بڑی قیمت یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں میں سماجی مساوات کا احساس اور زندگی (یہی دنیوی زندگی) کی کشمکش میں بقاء کے لئے جمعیت و اتحاد کا شعور ترقی کرتا ہے نماز کے میدان کو بالکل بجا طور پر اسلام کا پہلا ڈرل (فوجی قواعد) کا میدان کہا گیا ہے۔"
قرآن مجید تمام مسلمانوں کو سچا مسلمان بننے کی تاکید کرتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ:-

"صرف چند کا عمل سب کو خواری و رسوائی (ظاہر ہے کہ اسی دنیا کی خواری و رسوائی) سے نہیں بچا سکتا جب کسی ریاست کے شہریوں کی بہت بڑی اکثریت اپنے قومی اغراض کو بچانے پر کمر باندھ لیتی ہے

تب ہی کامیابی نصیب ہوتی ہے ہوائی بمباریوں اور قتلِ عام کی جو
منظم شکل یورپ نے اس دور میں پیدا کردی ہے اس کے لئے ہم
میں سے ہر فرد کو سچے مسلمان کی زندگی اختیار کرنے کی ضرورت
ہے اگر ایسا کیا گیا تو ہماری روزانہ زندگی کی بدعنوانیاں ختم ہوجائنگی
قومی طاقت مستحکم ہوگی، سماجی زندگی میں شرافت کا جوہر پیدا
ہوگا اور بین الاقوامی وقار بڑھے گا۔"

دیکھا آپ نے اسلامی زندگی کی برکات اور سچا مسلمان بننے کے
زیرِ خط مقاصد ہمارے تحتانی نہیں فوقانی شعور میں زیادہ تر کیا ہیں؟ وہی دنیا
کی "خواری رسوائی کا غم"، دنیا ہی کے قومی اغراض، قومی طاقت، بین الاقوامی
وقار، سماجی تنظیم، سماجی زندگی، آگے اداریہ کے اسی مقالہ کا جو حاصل بیان
ہوا ہے وہ بھی کان لگا کر سن لیں۔

"اگر مختلف صوبوں میں رہنے والے شہری اپنی قوت مضبوط
کرنا چاہتے ہیں تو صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اسلامی زندگی کی
راہ اختیار کریں۔ اسی سے ان کے آپس کے اختلافات دور
ہو سکتے ہیں اور فکر و عمل میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے جو ملک کے
استحکام کے لئے ناگزیر ہے ......
اسلام کے پیرو اگر اسلامی زندگی کی پیروی نہیں کرتے تو یہ استحکام
جو قومی وجود کے لئے لازم ہے عملاً کبھی حاصل نہیں ہو سکتا ...
لہٰذا اول و آخر تمام شہریوں سے ہماری اپیل یہی ہے کہ ان کو اسلام
ہی سے زندگی کی روح حاصل کرنا چاہئے اسی سے وہ قوت
و وحدت پیدا کر سکیں گے جس کے بغیر کوئی قوم دیر تک باقی

نہیں رہ سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ قومی وجود" قومی بقاء" قومی ریاست" قومی طاقت جس کا اسلام کی پیروی، اسلام کی زندگی" سے حاصل کرنا مطلوب قرار دیا گیا ہے، سب لے دے کر صرف اسی دنیا کی تو ہے، بس وہی مغالطہ کہ یہ چیزیں جس درجہ میں مطلوب بھی ہیں تو آخرت کی فلاح و نجات کے وسائل کے طور پر ضمناً و ذیلاً لیکن اب ہم نے ان کو مقاصد کے درجہ میں اپنے فکر و عمل پر اتنا مسلط کر دیا ہے کہ اخروی زندگی کا نام زبان و قلم پر آتا بھی ہے تو اس میں جوش طلب کی اس گرمی و سرگرمی کا پتہ تک نہیں ہوتا جو دنیا کے کسی معمولی مقصد کی لگن میں بھی ہم اپنے اندر پاتے ہیں لیکن کہیں کم کہیں زیادہ لیکن ذہنیت ہماری بن یہی گئی ہے کہ آخرت کا غم یا تو سرے سے ندارد یا دنیا کے مقابل نہ ہونے کے برابر،

تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ط

اسی پندرہ روزہ پرچہ میں خود معاشیات پر بھی ایک مضمون ہے جس میں قرآنی تعلیمات کی ترجمانی زیادہ صحیح کی گئی ہے مگر روح اس کی بھی وہی ہے کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کا اصلی مقصد و مدعا گویا اس دنیوی زندگی ہی کی معاشی مشکلات سے انسان کو نجات دلانا ہے اخروی نجات میں ان کو کوئی خاص دخل نہیں ہے، مضمون کا عنوان بھی یہی ہے کہ "انسانیت کی معاشی بیماریاں اور ان کا اسلامی علاج"، ابتداء اس طرح ہوتی ہے کہ :

"معاشی مشاغل کے دائرہ میں اسلام کا مقصود پورے سماج کی عام خوشحالی ہے نہ صرف چند مستثنیٰ خواص کی جاگیرداری جو بھی مختلف معاشی تعلیمات اسلام نے دی ہیں سب کی انتہائی

غرض وغایت معاشرہ کے مختلف طبقات و افراد میں کبھی
نمایاں فرق و امتیاز کو مٹانا ہے۔"

یہ وہی اشتراکیت کی بند بند بولی کے سوا کیا ہے۔ آخر میں صاحب مضمون کے نزدیک سب سے پہلی بات یاد رکھنے کی یہی ہے کہ "اسلام بس یہی چاہتا ہے کہ سب کی زندگی کا عام معیار بلند کر دے۔ یہی نعرہ تو ہے جو خدا و آخرت کا منکر یا اس سے غافل ہر چھوٹا بڑا لیڈر آج کل ہر جگہ لگاتا پھرتا ہے بلند معیاری کا یہ خبط یہاں تک پہنچا ہے کہ ابھی اسی اگست کی ۵ر تاریخ کے اخبار میں دیکھا کہ برما کے وزیر اعظم نے ایک کانفرنس میں دن دوپہر کی بیداری میں اپنے اس خواب کا اعلان فرمایا کہ "ان کی بہبودی ریاست (WELFARE - STATE) میں ہر شخص کے پاس ایک مکان ہوگا ایک موٹر کار ہوگی اور اس کی آمدنی آٹھ سو روپیہ ماہوار ہوگی۔

معاش کا رخ بھی معاد کی طرف

حالانکہ قرآن کی کثیر آیتیں خود معاشیات کے اسی مضمون میں ایسی نقل کی گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاش کے معاملہ میں بھی اسلام کا اصلی رخ معاد ہی کے ابتلائی و پرورشی مصالح کی طرف ہے ارشاد ہے کہ تمہارا مال اور اولاد (سب درحقیقت تمہاری) آزمائش اور امتحان کے لئے ہیں، اور (اس امتحان میں کامیابی پر آخرت میں تم کو) اللہ کے پاس بڑا اجر (انعام) ملے گا۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ
اَجْرٌ عَظِيْمٌ ط

احادیث وغیرہ سے قطع نظر ذرا خود قرآن ہی کی اسپرٹ مدنظر رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی غرض زندگی کا عام معیار بلند کرنا یا معاشی اونچ نیچ کو مٹانا بالکل نہیں ہے کہ خود اللہ ہی نے تو گوناگوں حکمتوں کی بناء پر یہ اونچ نیچ پیدا فرمائی ہے وَاللّٰهُ الَّذِیْ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۔ بلکہ اس کو باقی رکھ کر ہر ایک کو اس کے معاشی مقام و عمل کے لحاظ سے آخرت کی امتحانی تیاری میں لگاتا ہے

اسی طرح اَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ کو نظر انداز کر کے خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ط سے اسی مضمون میں عجیب نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ اس آیت میں قرآن دراصل اعلان کر رہا ہے کہ معاشی دولت کے سارے وسائل اس لئے خدا نے پیدا کئے ہیں کہ ان سے سماج کا ہر فرد متمتع ہو" درآنحالیکہ خود قرآن میں دوسری جگہ زمین ہی نہیں آسمان و زمین سب کی پیدائش کی خاص غرض موت کے بعد آنے والی زندگی کے لئے حسن عمل کی آزمائش یا امتحان کو بتلایا گیا ہے البتہ جو مستقبل کی اس ابدی زندگی یا مرنے کے بعد اٹھنے ہی کے سرے سے منکر ہیں ظاہر ہے کہ وہ ایسی باتوں کو افسانہ و فسوں ہی قرار دیں گے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ...... لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّکُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ "۔ (هود۔ رکوع ۱)

غیر معادی معاشیات کی نقالی

ایک یہی مضمون و مضمون نگار نہیں اچھے اچھے صاحب علم و صلاح حضرات آج کل کی خالص دنیوی اور غیر معادی معاشیات کی نقالی میں سینکڑوں صفحات اسلامی معاشیات کے نام وعنوان سے اس طرح لکھتے چلے جاتے ہیں کہ گویا قرآن و حدیث کی ساری معاشی تعلیمات کا مدعا بھی لے دے کر بس اسی دنیوی زندگی کے معاشی مسائل و مشکلات کا حل ہے وہ قرآن جس کا ایک صفحہ بھی آخرت کی زندگی کے بناؤ بگاڑ فلاح و خسران کی مرکزی مقصدیت سے خالی نہ ملیگا اسی کی معاشیات پر اسی کے ماننے والوں کے قلموں سے آپ سینکڑوں صفحات اس طرح پڑھتے چلے جائیں گے کہ گویا اس زندگی کے معاشی مسائل و احکام کو قرآن و اسلام کی نگاہ میں کسی اور دوسری زندگی سے قطعاً کوئی ربط و واسطہ نہیں۔

حاشا وکلا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس طرح کی باتیں لکھنے والے حضرات خدا نکردہ آخرت پر ایمان و اعتقاد نہیں رکھتے، کہنا صرف یہ ہے کہ اس غلبہ دنیا داری یا دنیا پرستی کے زور نے غیر شعوری طور پر اچھے اچھے مسلمانوں تک کے دل و دماغ پر اتنا قبضہ جما لیا ہے کہ دین کے احکام میں بھی ان کی سب سے پہلے اور زیادہ تر نظر خالی دنیا ہی کے مصالح و منافع پر پڑنے لگی ہے۔ بخلاف اس کے خود قرآن و حدیث کو ذرا خالی الذہن ہو کر پڑھو تو ان کی دعوت کا اصل رخ تمامتر آخرت کی فلاح یا بناؤ سنوار کی طرف پاؤ گے دنیا کے ہر رنج و راحت، تونگری و ناداری، تندرستی و بیماری، خوشحالی و بدحالی سب کا مرجع و رُخ ان کی تعلیمات میں کسی نہ کسی عنوان سے آخرت ہی کی طرف

پھرتا ہے۔

آخرت پر ایمان کی حقیقت

اس کے سوا آخر اور کیا ہے کہ اس دنیا کی انفرادی زندگی ہی نہیں خواہ وہ عمر نوح کیوں نہ ہو زمین و آسمان کی پوری کائنات کو ایک دن فنا ہو کر رہنا ہے اس کے بعد جس نئی زندگی اور نئی دنیا میں ہم کو داخل ہونا ہے وہ کروڑوں، اربوں سال ہی باقی رہنے والی نہیں بلکہ قطعاً غیر فانی اور نا متناہی ہے جب ہی تو اس اُخروی زندگی کے مقابلہ میں موجودہ دنیوی زندگی کی حدیث میں اتنی تحقیر و تذلیل ملتی ہے کہ خدا کی نظر میں اس دنیا کی وقعت اگر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو خدا و آخرت کے منکروں کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیا جاتا۔ یہ اور ایسی دوسری روایات کیا خود قرآن کی اس طرح کی آیات کی تفسیر کے سوا کچھ اور ہیں جن میں دنیا اور دنیا کی زندگی کی حقارت کو بار بار اور باصرار دہرایا گیا ہے۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ - وَمَا مَتَاعُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ، وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ، وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ، وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ -

وغیر ذلک من الآیات

زندگی کا دنی و خسیس تصور

پھر بھلا زندگی کا وہ دنی و خسیس تصور جس کی تعبیر ہی از اول تا آخر کسی

خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی آخرت یا معاد و معادیات کے انکار و نفی پر ہوئی ہے۔
اسلامی معاشیات ہی کیا، اسلام کی معاد جو زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے
شعبہ و جزئیہ کو بھی اس سراپا معاد گریز "ماڈرن" زندگی کی میزان پر کیسے تولا
اور کہاں تک اس پر پورا اتارا جا سکتا ہے! خدا اور آخرت پر ایمان کی شان
تو یہ ہے کہ مرد مومن اس دنیا کے فقر و فاقہ اور دولت و سلطنت مزدوری
و سرمایہ داری دونوں کو خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح حاصل کرنے کا یکساں
سرمایہ یقین کرتا ہے اور دونوں ہی کو مردانہ وار اسی راہ میں لگاتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ حکیم و رحیم اور قدیر خالق کی حکمت و رحمت اور
قدرت کے اجتماع نے انسان اور کائنات کی خلقت و فطرت کو آخرت
کے ساتھ کچھ ایسا ہم آہنگ بنا دیا ہے کہ اگر دنیا کی زندگی کو دین یا یوم دین
(آخرت) کے ساتھ ایماناً و عملاً پوری طرح جوڑ دیا جائے تو یہ بھی اسی طرح نمونہ
جنت بنائی جا سکتی ہے۔ جس طرح آخرت سے توڑ کر آج زندگی کے معاشی
و سیاسی، انفرادی و اجتماعی ہر شعبہ کو دجال کی جنت نما جہنم بنا لیا گیا ہے
جس میں ہر کہ و مہ دیوانہ وار کودا پڑ رہا ہے حالانکہ اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی
اس جہنم سے خود بنانے والوں کو بھی نکلنے کی اب کوئی راہ نہیں مل رہی ہے
اور آخرت سے پہلے ان ظالموں کے لئے دنیا ہی عذاب بن کر رہ گئی ہے
وَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِکَ ۔ دُوْنَ الْعَذَابِ
الْاَکْبَرِ۔

مقصود بنائے بغیر مقصود حاصل

موقع پاکر بھرے ہوتے دل کی اس تھوڑی سی بھڑاس نکال لینے کا

مدعا فقط اتنا ہے کہ خدا و آخرت پر بُرا بھلا ایمان رکھنے والے ہم مسلمان اپنی انفرادی و اجتماعی و سیاسی و معاشی زندگی کو مقصود بالذات سمجھنے سمجھانے کے بجائے خدارا ذرا اس کو آخرت کے تابع و ماتحت کرکے تجربہ کر دیکھیں کہ یہ مقصود بھی مقصود بنائے بغیر کس خوش اسلوبی و خوبی سے آخرت ہی کے طفیل میں نصیب ہو جاتا ہے۔

اجتماعی سیاست و معیشت کا انقلاب تو کسی فرد واحد کے قبضہ و اختیار کی بات نہیں لیکن انفرادی طور پر جس کا جی چاہے ذرا ہمت کرکے خود اپنی ہی معاشش کو اختیار بھر معاد کے تابع بنا کر دیکھ لے کہ زندگی کے جس سکھ چین کی تلاش میں ہم در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں وہ معادی معاشش کے صدقے میں ہماری لونڈی بن جاتی ہے یا نہیں شرط یہی ہے کہ لونڈی کو لونڈی ہی بنائے رکھیں ورنہ جہاں ڈھیل دی سر چڑھ جائے گی۔ ایک نہیں کئی کئی زندگیوں میں خود اس سگِ دنیا راقم کو اللہ تعالیٰ نے گھر باہر کھلی آنکھوں مشاہدہ کرا دیا کہ بیوی کے بجائے لونڈی بنا کر رکھنے والوں کی یہ دنیا کیسی، خدمت گذار اور وفا شعار لونڈی بن جاتی ہے چھوٹے بڑے نئے پرانے لیڈروں سے خصوصاً اپنی انفرادی زندگی میں اس تجربہ کی درخواست ہے اگر ان کے دل میں یہ حقیقت اتر جائے تو ہماری معاشی وسیاسی ساری اجتماعی دعوتوں کا بھی قبلہ درست ہو جائے

رونے کا جی چاہتا ہے

کہ مسلمان ملکوں تک کے اکثر ائمہ و خواص یا مسلمان لیڈر خود ہی ترکستان کی راہ پر پڑ گئے ہیں تو عوام کا رُخ کعبہ کی طرف کون پھیر سکتا ہے، مسلمان

جس کو ایمان لانے ہی ہر شرک اور شائبہ شرک کی کاٹ ڈالنے والی لا الٰہ کی تلوار اسی لئے دی گئی تھی کہ اس کی کاٹ کے سامنے کوئی غیر اللہ نہ ٹھہر سکے وہ اب خود ہی وطنیت اور قومیت، سیاست و معیشت، تمدن و ثقافت (کلچر) وغیرہ ماڈرن دیوتاؤں پر اسلامیت کا ٹھپہ لگاکر مستقلاً ان کا داعی و رسول بن گیا اور زبان و قلم کا سارا زور لگانے لگا ہے گویا قرآن کے خدا کو معاذاللہ وطنیت قومیت، سیاست و معیشت، انسانیت و ثقافت وغیرہ کی کوئی مستقل صاف، صاف دعوت (آئیڈیالوجی) پیش کرنا نہ آتی تھی کہ زندگی ہر زاویہ سے ہر پھر کر اول و آخر آخرت ہی کو دیکھتا دکھلاتا رہا۔

کیا کسے اور کس طرح کہا جائے کہ کیسے کیسے علم و فہم والے بالعموم اسلام کی اس توحیدی دعوت سے بے پرواہو کر جو پوری زندگی کے ہر کل و جزو کو صرف اور صرف ایک ہی مرکز کے گرد گھمانے پر مصر ہے ہر نئی شرک پرور دعوت کے لفظی، سراسر لفظی و اصطلاحی مغالطات کا شکار ہو جاتے ہیں اور تازہ بتازہ خداؤں کے پکارنے میں اپنی آوازیں بھی آیات و احادیث کو ملا ملا کر ملانے لگتے ہیں۔

اس سراپا بے علم و عمل کی طبیعت تو ان روز روز کے تازہ خداؤں سے اس درجہ گھنا اور چڑھ گئی ہے کہ بخدا بالکل ظاہریہ کا ہم مشرب بنجانے کا جی چاہتا ہے اور کتاب و سنت کی عطا کی ہوئی اصطلاحات و تعبیرات سے بھی تجاوز کرتے ڈر ہی لگنے لگا ہے کہ ہر ماڈرن اصطلاح کسی نہ کسی ماڈرن خدا کو بغل میں دبائے کسی نہ کسی ماڈرن پیغمبر کی دماغی اختراعوں کی وحی پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتی ہے اور ہم نادان مسلمان اس ماڈرنزم (تجدد) کو قرآن

و حدیث سے کسی نہ کسی طرح جوڑ دینا ہی اسلام کی سب سے بڑی دوستی جاننے لگے ہیں اس سے بڑے فتنہ نے شاید ہی کبھی ایمان و اسلام کو گھیرا ہو

طلسم کا توڑ

اس طلسم کا توڑ کلمۂ اسلام کی خالص و کامل ایمانی و عملی تجدید اور دعوتِ تجدید و احیاء کے سوا کچھ نہیں۔

ابوابِ بالا میں جس طرح رزقی یا معاشی مسائل کے اساسی و نظری مباحث کو خدا و آخرت کی ایمانی تجدید و تذکیر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے آئندہ اوراق میں انشاء اللہ اسی نقطۂ نظر سے رزق و معاش کی عملی تعلیمات آتی ہیں۔

وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَانُ ط

معاشیات انفاق

مادی وناسوتی زندگی کے ساتھ قدرتاً طرح طرح کی مادی وناسوتی حاجتیں اور ضرورتیں بھی لگی ہوئی ہیں یہ ضرورتیں جن چیزوں سے پوری ہوتی ہیں وسیع معنی میں وہی اس زندگی کا سازوسامان، مال ومتاع یا دھن ودولت ہیں۔ اس دولت کی پیدائش ومبادلہ، تقسیم وصرف وغیرہ کی علمی وفنی بحثوں کو علم معیشت یا معاشیات کہا جاتا ہے یوں کم وبیش آجکل کے ہر علم وفن کی طرح کتابوں میں معاشیات کی بھی بیسیوں تعریفیں ملتی ہیں۔ لیکن راقم ہذا اس علم وفن کا عالم نہ خالص علمی وفنی اعتبار سے اسلامی معاشیات پر کچھ لکھنا مقصود، اور نہ اس اعتبار سے نفسِ اسلام یا دین کا یہ کوئی موضوع بحث ہے، مدنظر اسلامی اور غیر اسلامی معاشی زندگی کے تصورات ورجحانات کے فرق واختلاف بلکہ تضاد وتناقض کو واضح کرنا ہے اوپر کے تمہیدی بابوں میں اس کی تمہید تھی آگے کے اوراق اس کی تکمیل وتتمہ ہوں گے

معاشی زندگی کے دو اصل مسئلے

ہمارے اس مقصد کے لئے معاشی زندگی کے بنیادی مسائل اصل میں دو ہی ہیں۔ (۱) دولت کا حصول اور (۲) اس کا استعمال۔

اور معاشیات کا یہی عام تصور و تعریف ہماری بحث کی اساس ہوگی کہ وہ نام ہے دولت کے حاصل اور اس کے استعمال کرنے کے انسانی مشاغل یا سرگرمیوں کا۔ دولت کا لفظ تو اس مفہوم میں اردو میں چل گیا ہے ورنہ عربی میں اور کتاب و سنت یا شریعت کی اصل اصطلاح مال ہے، اور مال کے حصول و استعمال کو کسب و انفاق سے تعبیر کیا گیا ہے اس طرح اسلامی معاشیات کی بھی اہم و اقدم بحث مال کا حصول یا کسب اور اس کا استعمال یا انفاق ٹھہرتی ہے۔

حیرت اور اکتشافِ عظیم

اس نقطۂ نظر سے جب اسلام کی معاشی تعلیم کو سمجھنے کے لئے خود اسلام کی کتاب "قرآن مجید" کا مطالعہ کیا تو اول نظر میں ششدر رہ گیا کہ مال کے نفس کسب و حصول کی تعلیم و ترغیب کہنا چاہئے کہ ۳۰ پاروں والے قرآن کی ایک آیت میں بھی نہ ملی۔ لیکن جو کتاب معاشیات کی نہیں در اصل معادیات کی ہے جب اس پر نظر گئی تو الحمد للہ معادی ہی نہیں معاشی صلاح و فساد کے بھی سب سے بڑے سرچشمہ کا عظیم اکتشاف ہوا۔

اسلام نے اپنی معادی یا دینی حیثیت میں انسان سے مال و معاش کے نفس کسب و طلب کا در اصل کوئی مطالبہ ہی نہیں کیا ہے، معاشی

---

[۱] اکنامکس کی یہی سیدھی سادھی تعریف انسائیکلوپیڈیا برٹیانکا میں بھی کی گئی ہے ۱۲

[۲] انسان کی آبادی سے اربوں کھربوں زیادہ دوسری جاندار مخلوقات کا رازق نہ انسان ہے نہ اس کی معاشی منصوبہ بندیاں جعلنا لکم فیھا معایش ومن لستم لہ برازقین (سورۂ حجر ع ۲)

ورزقی ضمانت، جیساکہ اوپر کتاب کے پہلے ہی باب (معاشیاتِ عبدیت) میں تفصیل گذر چکی، انسان کیا زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی پیدا کرنے والے نے اپنے اوپر لے رکھی ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا "

احادیثِ کسب کا صحیح مطلب

انسان کو معاش کے معاملہ میں اصلاً کسبِ معاش کا نہیں بلکہ معاش کو تمام تر معاد کے تابع رکھنے کا ذمہ دار اور جواب دہ ٹھہرایا گیا ہے۔

حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ آدمی کو قیامت کے دن چار باتوں کا جواب دیئے بغیر ہلنے تک کی اجازت نہیں ہوگی ان میں سے دو مال ہی کے متعلق ہوں گی کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا مِنْ اَیْنَ اِکْتَسَبَهٗ وَفِیْمَا اَنْفَقَهٗ۔ علم وقلم کے بعض بڑے مشاہیر تک کو مغالطہ ہوگیا کہ یہ وہی جدید معاشیات کے دونوں خاص موضوع ــ دولت کے حصول واستعمال .... کی نص وصراحت ہاتھ آگئی۔ حالانکہ صراحت وزور یہاں بالذات کسب وانفاق کے معاشی مسائل ومشاغل پر قطعاً نہیں بلکہ اس پر ہے کہ ان معاشی مسائل ومشاغل میں بھی اس نے معادی بناؤ بگاڑ کا پورا اہتمام رکھا یا نہیں۔

اسی طرح مثلاً کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَةِ میں مقصود کسب حلال پر زور دینا ہے نہ کہ نفس کسب کی تعلیم وترغیب یا اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰهِ سے مراد بھی حلال ہی کا کسب کرنے والا ہے ورنہ اگر نفسِ کاسب یا کمانے والا مراد ہو تو بقول مجدد تھانویؒ کے یہ

ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی ڈاکو کا نام کاسب رکھے اور اس کو اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ کا مصداق بنانے لگے۔ (علاج الحرص صہ ۱۵)

بات یہ ہے کہ طلب معاش یا کسب رزق آدمی کی دنیوی زندگی اور بقائے حیات کے لئے اس درجہ ناگزیر ہے کہ زمین پر قدم رکھتے ہی جس چیز کا سب سے زیادہ محتاج اور جس پر سب سے زیادہ مضطر ہوتا ہے اور جس سے بے نیاز رہ کر ایک دن بھی بسر کرنا دشوار ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی صورت میں رزق و معاش کا کسب و حصول ہی ہے،

بچہ جب تک خود کسب کے قابل نہیں ہوتا سارے جہانوں کے پالنے والے — رب العالمین — نے ماں باپ کے اندر ایسی زبردست کمار بیّانی کی پرورشی شفقت بھر دی ہے کہ خود خالی پیٹ رہ کر بھی بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔

ترغیبِ کسب کی عدم ضرورت

غرض رزق و مال کے کسب و حصول کی ضروری طلب ہی نہیں، اتنی حریصانہ تڑپ انسان کے اندر خود اس کے خالق کی پرورشی حکمت یا ربوبیت نے رکھ دی ہے کہ اس سے غفلت اور بے پرواہی کا کسی حال میں کسی آن اندیشہ و امکان نہیں۔ خود فرمایا کہ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ شاہ عبد القادر رح نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ "تم پیار کرتے ہو مال کو جی بھر کر" مفرداتِ راغب وغیرہ لغت کی کتابوں میں جمًّا کے معنی اتنے بھر جانے کے یا اتنی زیادتی کے دیئے ہیں کہ مزید کی گنجائش نہ رہے۔ یعنی انتہائی زیادتی و شدت، جس کا مطلب یہی ہوا کہ انسان میں

پیدائشی طور پر مال و معاش کی محبت اتنی پیدا کر دی گئی ہے کہ اب اس کی طلب و تحصیل کے لئے کسی مزید ترغیب و تحریص کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی۔ ضرورت لگا لگانے کی ہے ایڑ لگانے کی بالکل نہیں۔ ایک جگہ مال و دولت کے ساتھ اور بھی کئی ایسی چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کی محبت و زینت انسان کی گھٹی میں ڈال دی گئی ہے کہ:۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط (آلِ عِمْرَانَ ع ۲)	لوگوں کے لئے عورتوں، بیٹوں اور ڈھیروں پر ڈھیر سونے اور چاندی کے، اور گھوڑوں، مولیشیوں اور زراعت (وغیرہ) مرغوباتِ نفس کی محبت کو آراستہ و خوشنما بنا دیا گیا ہے“

ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی متنبہ فرما دیا گیا کہ ہیں یہ ساری چیزیں بہر حال صرف اسی پست یا دنیوی زندگی کا ساز و سامان ورنہ انجام کار یا آخرت کی اصلی و ابدی بھلائی کا ٹھکانا اللہ ہی کے پاس ہے۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ

پھر اس ”حُسْنُ الْمَاٰبِ“ یا انجام کی خیر و فلاح کی ترغیبی تفصیل میں ارشاد ہے کہ:۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا	کہو کہ تم کو ایسی چیز بتلا دوں جو ان سب دنیوی سامانوں سے بہتر ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے (ان دنیوی چیزوں میں) پرہیزگاری

الْاَنْهٰارُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (آل عمران)

یا تقویٰ سے کام لیا ان کے پروردگار کے ہاں آخرت میں ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور پاک و پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔

اور ان سب چیزوں سے بڑھ کر یہ کہ ان کو اپنے اصل انسانی مطلوب محبوب اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی دولت نصیب ہو گی وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ط

فطری حرص مال کا اصل راز

اس کے بعد ہی ہے کہ "اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے" (وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ ط) یعنی جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہی پوری طرح ان کی فطرت اور اس کے مطالبات کو جانتا ہے جن کی تکمیل اور تشفی کا حقیقی مقام جنت اور خدا کی خوشنودی ہے اس ضمن میں۔ "لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا" سے ایک اور بڑی اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہو گیا کہ عورتوں، بیٹوں اور مال و دولت کی ہمارے اندر اگر اتنی شدید حریصانہ رغبت و محبت نہ ہوتی تو یہ چیزیں ہمارے ابتلاء و امتحان کا ذریعہ بھی کیسے بن سکتیں اور اس طرح ان کی امتحانی راہوں میں معاش سے زیادہ ہماری معادی تربیت و تکمیل کے جو گوناگوں مصالح و مجاہدات رکھے گئے ہیں وہی فوت ہو جاتے ان مجاہدات ہی کا نام قرآن کی اصطلاح میں تقوے کی زندگی ہے، مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اموال و ازواج کی اس شدید خلقی

وفطری رغبت کے باوجود ان کے استعمال میں تقویٰ سے کام لے کر "حُبُّ الشَّهَوَات" کے تقاضوں کو خدا کی باندھی ہوئی حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ انجام وآخرت کی کامیابی اور خدا کی خوشنودی و بندہ پروری کے اصل حقدار وہی ہوں گے

اس حرص کی انتہاء

یہ تو درمیان میں ایک برمحل بات آگئی۔ گفتگو یہ تھی کہ نفس مال و معاش کی محبت وطلب انسان کی سرشت ہی میں اتنی شریک ہے کہ اس کے کسب وحصول کی ترغیب وتحسین کرکے دے کر یلے کو نیم چڑھانا ہوتا۔ حدیث میں اسی سرشت کو اس تمثیل سے واضح فرمایا گیا کہ :-

لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنَ الْمَالِ لَابْتَغَىٰ ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَهُ إِلَّا التُّرَابُ

ابن آدم کے پاس مال و دولت کی دو دو وادیاں بھری پڑی ہوں پھر بھی وہ تیسری کی فکر و طلب میں لگا رہے گا اور اس کے پیٹ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہ بھر سکے گی۔

واقعی حریص کے پیٹ کو مٹی ہی بھر سکتی ہے اور مرنے سے پہلے مال ومتاع کی کوئی بڑی مقدار اس کو قانع نہیں بنا سکتی۔ بقول شیخ شیرازؒ :-

گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پر کند یا خاکِ گور

اس حرص کو ابھارنے کی نہیں دبانے کی ضرورت ہے

جب ہمارے اندر خلقی وطبعی طور ہی پر مال کی طمع وحرص کو اس طرح

بھرپور محبوب و مزین کر دیا گیا ہے، تو اب اس کے کسب و حصول میں کسی ایسی کوتاہی کا احتمال تو سرے سے خارج از بحث ہو جاتا ہے جس سے ہماری معاشی حاجتوں یا مصلحتوں میں کوئی معتدبہ خلل و فتور پڑ سکے۔ بلکہ مال و معاش کے اس طبعی کسب و طلب کو مزید ترغیب و تحسین سے تیز و مہمیز کرنے کا نتیجہ اسی طرح گوناگوں معاشی مفاسد کی صورت میں نکل رہا ہے جس طرح حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ یا منفی ہیجان و خواہش کے مزید شہوانی محرکات، سینما اور تھیٹر، ناول، ڈرامہ، رقص و سرود، فحش تصاویر، برہنہ و نیم برہنہ لباس اور بے پردہ یا مخلوط سوسائٹی وغیرہ کی بدولت آج صنفی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کا زور روز افزوں ہے، قدرت نے نسلی بقاء و تحفظ کے لئے خود ہی جنسی داعیہ کو اتنا قوی کر دیا ہے کہ اس میں کمی یا تفریط کا کوئی اندیشہ ہی نہیں اس لئے اب اس کو خارجی محرکات سے شہ دینے کی جگہ معاشرہ میں حجاب وغیرہ کی ایسی پابندیاں لگانے کی ضرورت ہے جس سے اس کو حدود و اعتدال میں رکھا جا سکے نہ کہ الٹے بقائے نسل کے مقاصد ہی تہ و بالا ہونے لگیں

بعینہٖ یہی صورت مالی و معاشی معاملہ میں ہو رہی ہے، قدرت نے کسب معاش کا داعیہ انسان کے خمیر ہی میں اتنا زبردست رکھ دیا ہے کہ اعتدال پر رکھنے کے لئے ضرورت اس کو دبانے کی ہے نہ کہ اور ابھارنے کی ہے۔ مگر ایک مفسد فی الارض یہودی ذہنیت نے اس زبردست فطری داعیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر یہ فلسفہ بنا کر کھڑا کر دیا کہ آدمی صرف پیٹ ہے اور پوری انسانی تاریخ، تہذیب و تمدن، مذہب و روحانیت، اخلاق و معاشرت، سب کا منشاء و مرجع معاش یا پیٹ

کے سوا کچھ نہیں، پھر کیا تھا! دیکھتے ہی دیکھتے یہ بطنی فلسفہ معاش ہی نہیں ساری دنیا کا قومی اور بین الاقوامی سیاسی و سماجی نعرہ بن گیا۔ اب کسی طرف کان پڑی کوئی آواز اس کے سوا مشکل ہی سے سنائی پڑتی ہے کہ بس کسی نہ کسی طرح معاشی معیار بلند ہونا اور کرنا ہی زندگی کا واحد مسئلہ ہے کسی ملک کی کوئی حکومت اور کوئی سیاسی پارٹی اس دعوے و دعوت کا نعرہ لگائے بغیر قوم کو اپنا منہ نہیں دکھلا سکتی۔

کسبی حرص کو ابھارنے کا خمیازہ

اوپر کہیں گذر چکا ہے کہ ایک وزیر اعظم نے کانفرنس میں اپنے ملک کی معاشی زندگی کو بلند کرنے کے اس معیار کا اعلان فرمایا کہ:-

"ہر شخص کے پاس ایک مکان ہوگا، ایک موٹر ہوگی اور آٹھ سو ماہوار آمدنی"

کوئی نازک و دقیق نہیں بالکل بین و بدیہی بات ہے کہ ایک طرف انسان کے دل و دماغ کو اس کی موجودہ نیک و بد زندگی کے کسی نیک و بد انجام و آخرت سے اس طرح بیگانہ و غافل کیا جا رہا ہو کہ بس جو کچھ ہے لے دے کر یہی بہت سے بہت کم و بیش ۷۰/۸۰ سال کی زندگی کا لطف و لذت ہے اپنے لئے بھی، اپنے اہل و عیال کے لئے بھی اور قوم و ملک پوری انسانیت کے لئے بھی، انفرادی بھی، اجتماعی بھی،

دوسری طرف حقیقت و واقعیت کی دنیا یہ ہے کہ سینکڑوں میں کیا ہزاروں میں بھی دو ایک سے زیادہ ایسے نہ ہوں گے جو دین کا ذکر نہیں خود ملک کے قانونی جائز ذرائع سے اپنے زندگی کے معیار کو موٹر کیا موٹر سائیکل

تک بھی آسانی سے بلند کر سکے تو ں ایسی صورت میں کوئی فرد یا شہری بھی آخر کس امید پر صبر و قناعت کرے اور جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر خود اپنے اور اپنے بال بچوں کے معیار کو مقدور بھر زیادہ سے زیادہ بلند کئے بغیر مرجانے پر کیوں راضی ہو۔

خود غرضی و اقربا پروری، نفع بازی و ذخیرہ اندوزی، رشوت و خیانت جعل و فریب، چوری ڈاکے وغیرہ کی جو نت نئی بدعنوانیاں یا معاشی بدمعاشیاں روز بروز دنیا میں زور پکڑتی جاتی ہیں، ذرا نفسیاتی تحلیل و تجزیہ سے کام لیں تو شعوری طور پر ان کی تہ میں غیر معادی معاشیات کی پھیلائی ہوئی معاشی بلند معیاری کا سودا ہی کارفرما نکلے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اب یہ معاشی بدمعاشیاں پیشہ ور بدمعاشوں جاہلوں یا مضطر فاقہ کشوں میں محدود نہیں رہ گئی ہیں۔ خاصے کھاتے پیتے پڑھے لکھے، اعلیٰ تعلیم یافتہ، پشتینی شریفوں اور شریف زادوں میں پھیلتی جارہی ہیں، ہر چھوٹا بڑا اپنے معاش کی موجودہ سطح سے غیر مطمئن اور اس کو بلند سے بلند معیار تک پہنچانے میں دیوانہ وار منہمک ہے۔

یہ سطریں لکھ ہی رہا تھا کہ ایک ہی دن کے اخبار (۲۱ اپریل ۵۳ء) میں ایک طرف اپنے ہندوستان بلکہ اپنے صوبہ یوپی کے ایک نائب وزیر کے دورہ کی رپورٹ میں اعظم گڈھ کے یہ واقعات پڑھے کہ فصلوں کے کٹنے سے پہلے ایک دو نہیں سو کے سو کسانوں کی درخواستیں حکومت کو موصول ہوئی تھیں کہ لوگ غول کے غول نکلتے کھڑی فصلیں کاٹ لیتے اور زمین پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں کئی مقامات پر یہ صورت پیش آئی اور یہ کام صرف عام بدمعاشوں کا نہ تھا بلکہ ایک سیاسی پارٹی (پرجا سوشلسٹ) کے کارکن بھی ماخوذ ہیں۔ خود نائب وزیر صاحب کا بیان ہے کہ اعظم گڈھ

میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے اس کی ذمہ داری زیادہ تر پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ممبروں پر ہے"

آخر یہ ممبر جو سبق دن رات دوسروں کو پڑھاتے ہیں خود کیسے بھلا دیتے اسی اخبار میں پاکستان وہ بھی خاص دارالحکومت کراچی کی خبر یہ ہے کہ "تین دن پہلے جو کپڑا بازار میں بھرا تھا وہ کنٹرول ہوتے ہی چور بازار پہنچ گیا اور چیف کمشنر کی کنٹرول کی اسکیم کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی"

ظاہر ہے کہ یہ کام فاقہ کشوں کا نہیں کپڑے کا ہزاروں لاکھوں کا بیوپار کرنے والے چھوٹے بڑے تاجروں کا ہے آزادی کے بعد سے خصوصاً جیسے جیسے زندگی کا معیار بلند کرنے اور معاشی اونچ نیچ کو مٹانے اور گھٹانے کے نعرے بڑھتے جا رہے ہیں ویسے ہی ویسے آئے دن ہر طبقہ میں ہر طرح کی بدمعاشیاں اور بدعنوانیاں بڑھتی جاتی ہیں اور اس قسم کے واقعات اب غیر معمولی بالکل نہیں رہے ہیں۔

لیکن واقعات کی یہ شہادت نہ ہو تو بھی معمولی سمجھ کی سیدھی سادھی بات ہے کہ جب آدمی کے سامنے اس کے حاضر و حال کا کوئی مستقبل و مآل نہ ہو جس سے اعمال و افعال کے نفع و ضرر نیک و بد یا امید و بیم کا کوئی مستقل رشتہ قائم ہو۔ بہ الفاظ دیگر ایک طرف اس زندگی کا برا بھلا کوئی نتیجہ کسی دوسری زندگی میں نکلنے کا ایمان و یقین نہ ہو، دوسری طرف اس زندگی کا معیار بلند کرنے کی آواز ہر دیوار و دیوار سے آ رہی ہو ہر حکومت، ہر پارٹی، ہر لیڈر، ہر منسٹر، ہر اخبار، ہر پلیٹ فارم سے یہی سبق پڑھایا اور سنایا جا رہا ہو کہ زندگی کا اہم و اقدم مسئلہ کھانے پہننے رہنے، سہنے، آرام و آسائش، صحت و تعلیم کی سطح کو بلند کرنا ہے تو کوئی

فرد، کوئی طبقہ، کوئی قوم، معاش و معیشت مال و دولت کی جس نیچی اونچی سطح و معیار پر بھی ہو اس کو اور اونچا سے اونچا کرنے ہی میں جائز و ناجائز کی بحث کے بغیر آخر اپنی ساری جدوجہد فکر و سعی کو کیوں نہ لگا دے

معاش بے معاد کی ذہنیت

یہی بے معاد والی معاشی ذہنیت ہے جو جائز و ناجائز حلال و حرام کی ساری اخلاقی و دینی قدروں اور قیدوں کو توڑ چھوڑ کر انسان کو نرا حیوان بناتی چلی جارہی ہے کسب مال و معاش کی یہی نوچ کھسوٹ والی استحصالی نفسا نفسی افراد ہی پر نہیں اقوام پر بھی مسلط ہے، ہر فرد کی طرح ہر قوم بھی جنگ و صلح کی جس تدبیر سے ہو سکے دوسری قوموں کو نوچ کھسوٹ کر اپنا معاشی معیار زیادہ سے زیادہ بلند کر لینا چاہتی ہے، یہی معاشی نفسیت و نفسانیت آج پوری دنیا کے سارے انفرادی و اجتماعی قومی اور بین الاقوامی فتنوں، فسادوں، جنگوں اور جنگی تیاریوں کی سب سے بڑی جڑ ہے جب موت کے بعد کسی زندگی اور اس عالم کے علاوہ کسی دوسرے عالم کا کوئی خوف و خیال ہے ہی نہیں۔ تو پھر مرنے سے پہلے ہی کوئی فرد، کوئی جماعت، کوئی ملک اپنی والی کوئی کسر کسی امکانی راہ سے بھی اس زندگی کا زیادہ سے زیادہ عیش حاصل کر لینے میں کیوں اٹھا رکھے،،

بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اگر اس عالم کے سوا کوئی عالم نہیں اس زندگی کے سوا کوئی زندگی نہیں تو اس سے بڑھ کر کون احمق اور زیاں کار ہوگا جو اس زندگی کی پوری پوری قیمت وصول کر لینے یا عیش کوشی میں رتی بھر کوتاہی روا رکھے۔ اسی لئے

آپ دیکھتے ہیں کہ معاشی نیچ اونچ کو مٹانے یا گھٹانے کا دن رات وعظ کہنے والے لیڈروں اور منسٹروں میں شاذ ہی کوئی اتنا احمق بننا پسند کرتا ہوگا کہ اپنے بنگلے اور گملے موٹر و شوفر کی ضرورت ہی نہیں شان و شوکت میں بھی مقدور بھر کوئی کمی گوارا کرتا ہو۔

اسلام کی معادی معاشیات

اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ کر ہی اسلام کی معادی معاشیات کی بظاہر نہ سمجھ میں آنے والی یہ حقیقت بھی خوب سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام کی کتاب میں مال و معاش کے نفس کسب و تحصیل پر زور کیا اس کی تحسین تک کی کوئی آیت کیوں نہیں ملتی۔

قرآن میں مال کی مدح کی بجائے مذمت

معاشیات کی ایک مختصر تعریف علم دولت یا علم المال[1] سے بھی کی گئی ہے لیکن جو کتاب مال و دولت کا ذکر بھی مدح کے پہلو سے پسند نہیں کرتی وہ اس کو کسی مستقل علم کا درجہ کیا دیتی واحد و جمع کی صورت میں مال اور اموال کا ذکر کوئی ۵۰ جگہ قرآن مجید میں آیا ہے لیکن ایک جگہ بھی ایسی نظر نہ آئی جس میں مال کی طلب و تحصیل کی کوئی ترغیبی تعلیم ہو یا انفاق کے سوا مدح و تحسین کے مواقع میں اس کا ذکر آیا ہو زیادہ تر اس کے مذموم و قبیح پہلوؤں یا مفاسد ہی پر جا بجا تنبیہ فرمائی گئی ہے

---

[1] سائنس آف ولتھ۔

مال و دولت کے دو مغالطے

مثلاً مال یا روپیہ کی اصلی و طبعی غرض و غایت تو دین و دنیا کی صلاح و فلاح میں اس کا استعمال و انفاق ہے مگر بہتیرے آدمی نفس مال و دولت ہی کو بالذات مقصود و معبود بنا لیتے ہیں، ننانوے کے پھیر میں پڑ کر انفاق سے زیادہ جمع کرنے میں لگ جاتے ہیں اور مغالطہ یہ ہو جاتا ہے کہ اگر روپیہ پاس رہا تو ضرورت پر ہمارے ہر طرح کے کام یہ قاضی الحاجات بناتا رہیگا۔ کسی معاملہ میں کوئی خرابی و دشواری نہ پیدا ہونے دے گا، بیماری آزاری، بڑھاپے اور معذوری آل و اولاد سب ہی کی مشکل کشائی کرتا رہیگا اور اس حرصی مغالطہ میں روزانہ کے یہ تجربات بھول جاتے ہیں کہ نہ مال و دولت خود سدا رہنے والی چیز ہے نہ مشکل و مصیبت سے لازماً نجات دینے والی۔ آئے دن ارضی و سماوی آفات لگی رہتی ہیں بڑے تاجروں کے دیوالے نکلتے رہتے ہیں بینک تک فیل ہوتے رہتے ہیں قارونوں اور بادشاہوں کی اولاد بھیک مانگتے دیکھی جاتی ہے، ہزاروں لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہانے پر بھی نہ بیماری آزاری کا دور ہونا ضروری ہوتا ہے نہ موت سے چھٹکارا ملتا ہے

غرض مال و متاع کے معاملہ میں یہ دونوں مغالطے کہ وہ خود ہمیشہ رہنے والا یا ہر درد کی دوا ثابت ہونے والا ہے مغالطے ہی مغالطے ہیں جمع مال کی اس دہری ضلالت کو قرآن نے دو ہی بلیغ فقروں میں بیان کر دیا ہے الذی جمع مالاً وعدده یحسب ان ماله اخلده ۔یعنی جو مال جمع کرتا اور اس کے حساب کتاب میں کھپا

رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سدا باقی رہیگا اور کسی کام میں کوئی خلل وخرابی نہ آنے دیگا[1]، وہ کان کھول کر سن لے کہ ایسا ہرگز نہیں (کَلَّا)، بلکہ یہ شخص "حُطمہ" میں جھونک دیا جائے گا اور جانتے ہو کہ "حُطمہ" کیا ہے؟ اللہ کے حکم سے سلگائی ہوئی آگ جو دلوں پر چھا جاتی ہے....

آخرت میں تو جو ہوگا، ہوگا، دنیا میں بھی ننانوے کے پھیر میں پڑنے والے جس چھوٹے بڑے کو چاہو ذرا قریب[2] ہوکر دیکھ لو تو دنیا میں بھی اسی "حُطَمَہ" کی بھٹی میں اس کا دل جھلستا ہوا پاؤگے۔ مال جو قدرۃً استعمال وانفاق کے لئے بنایا گیا ہے اس کے دیوانہ وار کسب وجمع کی دھن، راحت وعافیت سے زیادہ اس کو لازماً وبال وعذاب ہی بنا کر چھوڑتی ہے۔ حدیث میں اس دعا کی تعلیم فرمائی گئی ہے کہ :۔

"اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے مال سے جو میرے لئے عذاب ہو جائے" اَعُوْذُ بِكَ مِنْ مَّالٍ يَّكُوْنُ عَلَيَّ عَذَابًا۔

---

[1] مفردات راغب میں خلود کے لغوی معنی یہی بتائے ہیں کہ کسی چیز کا خرابی سے محفوظ اپنے حال پر قائم رہنا الخلود هو تبری الشی من اعتراض الفساد وبقاؤها على الحالة التي هو عليها [2] ایک بہت بڑے ایسے ہی والیِ ملک کو قریب سے دیکھا جن کی نسبت مشہور کیا مسلم تھا کہ تعداد ان سے زیادہ دنیا میں شاید کسی کے پاس ہو، اشرفیاں لاریوں میں بھری تھیں پھر بھی جی نہ بھرتا تھا بادشاہ ہوکر فقیر ہی بنے رہتے نہ اپنے اوپر خرچ دل کھول کر کر سکتے نہ اہل وعیال پر، اپنے مرتبہ ومقام کا لحاظ کئے بغیر ہر نا مناسب سے نامناسب اور بدنما سے بدنما راہ سے جمع کرنے ہی کی دھن میں لگے رہے۔ نتیجہ جاننے والے جانتے ہیں کہ بالآخر ان قناطیر مقنطرۃ کی ملکیت وتصرف سے عملاً محروم ہوکر رہے۔

مال کا سب سے بڑا وبال

عقلاً بھی دیکھا جائے تو مال تھوڑا ہو یا بہت اس کا بڑا مذموم پہلو صحیح مصارف میں صرف کرنے کے بجائے کمانے اور جمع کرنے میں کھپا رہنا ہے، آگے معلوم ہوگا کہ کم وبیش سارے معاشی مفاسد اسی فاسد ذہنیت کا نتیجہ ہوتے ہیں ایسا مال اور کمائی دنیا و آخرت دونوں ہی کی تباہی ہوتا ہے مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ط اور سب سے بڑا وبال یہ کہ مال ہی کے گھمنڈ میں آدمی اکثر خدا سے بھی اپنے کو بے نیاز سمجھ بیٹھتا ہے۔ حالانکہ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ە كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ٥ (آل عمران رکوع ۲)

جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی خدا کے مقابلہ میں، مال اور اولاد کوئی چیز بھی ان کے کام نہیں آسکتی بالآخر ان کو جہنم کا ایندھن ہی بننا پڑیگا جیسا کہ فرعون اور ان سے پہلے والوں کا حال ہوا کہ (مال و اولاد کے گھمنڈ میں) ہماری آیتوں کو جھٹلایا پس ان کو ان گناہوں کی پاداش میں آخرکار خدا نے پکڑ لیا اور خدا (ایسوں کو) سخت عذاب دینے والا ہے۔

مذمت مال کی کثیر آیات

اور بھی جابجا کثیر آیات میں اموال پر فخر و غرور وغیرہ کے جو طرح طرح کے

مفاسد مرتب ہوتے ہیں ان کا ذکر مذمت ہی سے ملتا ہے،

① نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا	میں مال میں تم سے بڑھا ہوا ہوں
② اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ط	اور بھائی بندوں کے جتھے کے اعتبار سے بھی۔

ایک جگہ سورۂ کہف ہی میں فرمایا کہ

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ط (ع ۵)	مال اور اولاد زیادہ سے زیادہ بس اس پست زندگی کی رونق ہیں اور باقی رہنے والے نیک اعمال تمہارے پروردگار کے پاس ثواب کے اعتبار سے بھی دہزار درجہ) بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی۔

سورۂ مومنون میں ہے کہ:۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ہ (ع ۴)	ہم ان کو جو مال واولاد دیتے چلے جاتے ہیں تو کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ اس طرح ہم ان کو جلد جلد فائدے پہنچا رہے ہیں بلکہ یہ (احمق) سمجھتے نہیں (کہ یہ دراصل ڈھیل ہے)

حضرت موسیٰ علیہ السلام عرض کرتے ہیں کہ:۔

رَبَّنَا اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا	پروردگار تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں رونق

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ

اور مال دیا جس کی بدولت وہ لوگوں کو تیری راہ سے بہکاتے ہیں لے پروردگار تو ان کے مالوں کو برباد کردے۔

شیطان کو جب اولادِ آدم کے گمراہ کرنے کی مہلت ملی تو اس کی گمراہی کے ذرائع میں بھی اولاد کے ساتھ اموال کا ذکر خصوصیت سے فرمایا کہ جا اور ان کی گمراہی کے لئے جو کچھ ہو سکے کر.... اور ان کے اموال واولاد میں اپنا ساجھا لگا اور وعدے کر۔ حالانکہ شیطان جو کچھ بھی (مال ودولت کے منافع وفضائل کا لالچ دلاکر) وعدہ کرتا ہے وہ (درحقیقت) فریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ط (بنی اسرائیل)

نفس مال کے علاوہ کسب مال کا بھی جہاں ذکر آیا ہے تو تحسین و ترغیب کے عنوان سے نہیں بلکہ کسبِ باطل وفاسد ذرائع کی مذمت وممانعت کے ساتھ، مثلاً یہود کے بڑے بڑے جرائم کے سلسلہ میں ان کی سودخواری اور دوسرے باطل یا ناحق طریقوں سے لوگوں کے مال کمانے کا ذکر وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ دوسری جگہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کے اکثر علماء ومشائخ لوگوں کا مال ناجائز یا باطل طریقوں سے کھا جاتے ہیں۔

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔

سورۂ بقرہ میں دیگر احکام کے سلسلہ میں خود مسلمانوں کو خطاب ہے کہ:۔

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ (ع ۲۳)

آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل (ناجائز) طور پر مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمے) حاکموں کے ہاں اس غرض سے نہ لے جاؤ کہ (اس ذریعہ سے) لوگوں کے کچھ مال گناہ کی راہ سے کھا جاؤ درانحالیکہ تم اپنے (گناہ یا ظلم) کو جان بھی رہے ہو۔

اسی طرح سورۂ نساء میں مسلمانوں ہی کو مخاطب فرما کر آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل یا ناحق طور پر کھانے سے منع فرمایا کہ:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔

سورۂ نساء ہی میں یتیموں کے مال میں مختلف احتیاطی احکام دینے کے علاوہ یہاں تک فرمایا کہ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم و زیادتی کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں کرتے کہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ط

سورۂ حدید میں اس دنیا کی پست و بے ثبات انفرادی و اجتماعی زندگی اور پھر اس کی بربادی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کا مقطع بھی اولاد

کے ساتھ اموال میں مقابلہ و مسابقت کی مذمت ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط (ع ۳)

جان لو کہ دنیا کی، پست زندگی (بچپن میں تو نام ہے) کھیل کود کا (جوانی میں اس کا مشغلہ) آرائش وزیبائش اور آپس میں فخر و ناز اور (آخر عمر میں) اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جنون"

اور اب اولاد کے معاملہ میں اس جنون نے کثرت تعداد سے زیادہ جاہ و مال میں اولاد کے مقابلہ کی صورت اختیار کر لی ہے کہ میرا لڑکا کلکٹر ہو، جج ہو، کونسل کا ممبر ہو، منسٹر ہو، بڑا وکیل ہو، بڑا کاروباری ہو، حد یہ کہ اس پر فخر کرتے دیکھا کہ میرے لڑکے کی تنخواہ تو کم ہے لیکن بالائی آمدنی خوب ہے اور بعضے اس کے ساتھ "ما شاء اللہ" بھی لگا دیتے ہیں۔

آگے بچپن سے لے کر مرنے تک کے اس سب کھیل کود، آرائش ونمائش، فخر و مباہات اور جاہ و مال میں مسابقت کا تفصیلی انجام بھی سن لیں۔ کہ جیسے بارش سے کچھ دنوں کے لئے کھیتوں میں بہار آجاتی ہے اور پھر وہ زرد پڑ کر خشک اور کٹ پٹ کر چورا بھوسا ہو جاتے ہیں

كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ط

یہی حال دنیا کی چند روزہ سرسبزیوں شادابیوں یا بہار کا ہے کہ سب کا انجام موت کی خزاں ہے۔

اب اگر زندگی کی کھیتی کا بیج اور لبسارہ بھی ٹھیک نہ ہوا۔ یعنی نیت و مقصد تمام تر وقتی و ظاہری سرسبزی و شادابی ہی سے لطف اندوز ہونا تھا تو نتیجہ (آخرت) خسران یا عذاب شدید کے سوا کیا نکل سکتا ہے۔

وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ

اور اگر نظر آخرت و انجام پر تھی یعنی دنیا کی جو جہد بھی تھی آخرت کی کھیتی (مزرعة الآخرة) کے طور پر تھی تو انشاء اللہ بشری لغزشوں اور کوتاہیوں کی مغفرت اور بالآخر خدا کی رضا و خوشنودی کی ابدی و لازوالی بہار کا وعدہ پورا ہو کر رہیگا۔ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ط

دنیا کے مال و جاہ اور عیش عشرت ہی کو زندگی کی اصلی بہار جاننے والے اور اس کی حرص و ہوس میں مرنے کھپنے والوں کی ایک تعبیر قرآن مجید نے "مُتْرَفِيْنَ" سے کی ہے۔ ان کا ذکر بھی جہاں آیا ہے مذمت کے ساتھ آیا ہے بلکہ یہ اپنی عیش پرستیوں اور مال و دولت کے گھمنڈ ہی میں کفر و طغیان کی انتہائی سرکشیوں تک جا پہونچتے ہیں۔ اور انجام بد سے ڈرانے والوں یا رسولوں تک کی باتوں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ٥ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ٥ (سباع ۴)	اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے دولتمندوں (مترفین) نے کہا کہ ہم تو تمہاری باتوں کو ماننے والے نہیں ہیں اور (مال و اولاد ہی کے گھمنڈ میں) کہا کہ ہم مال اور اولاد تم سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں اور (یہ کہتے ہوتے)

کسی عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں

وہی مغالطہ اور دھوکا، کہ مال و دولت ہر مصیبت کا علاج ہے حالانکہ معاشی کشادگی ہو یا تنگی دراصل ہر بات پروردگار کی خاص خاص پرورشی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی مشیت کے تابع ہوتی ہے پھر بہتیرے کشادہ معاش لوگوں یا دولتمندوں کو ایک اور مغالطہ یا خوش فہمی یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی خوش حالی کو اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کی دلیل سمجھنے لگتے ہیں آگے ان دونوں باتوں کی تردید فرمائی۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ وَمَآ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا (سبا ۴-۵)

کہہ دو کہ معاش یا رزق و روزی میں کمی و زیادتی یہ تو بالکل میرے پروردگار (رب) کی (پرورشی حکمت) و مشیت پر مبنی ہے جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے اور اموال و اولاد بجائے خود کوئی ایسی چیز نہیں جو خدا سے تم کو نزدیک کر دیں، ہاں جس نے ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کی ان کے لئے البتہ ان کے عمل کا بدلہ چند در چند ہو گا۔

جو لوگ جائز و ناجائز طور پر کما کما کر مال و دولت یا سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو کیسے دردناک عذاب کی خبر دی گئی ہے کہ اس سونے چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپا کر ان کی پیشانیوں، پہلوؤں

پیٹھوں کو اس سے داغا جائے گا۔ کہ لو جو کچھ تم نے جمع کر رکھا تھا اس کا مزہ چکھو۔

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (توبہ ع ۵)

ہم کافروں تک کے مال و دولت کو کیسی للچاتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر اس پر تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ:۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (توبہ ع ۱۱)

ان کافروں کے مال و دولت اور اولاد پر تم تعجب کرو (یہ ان کے حق میں کوئی نعمت نہیں بلکہ) ان چیزوں کے ذریعہ اللہ ان کو دنیا میں بھی عذاب ہی دینا چاہتا ہے اور بالآخر یہ جان بھی (ان چیزوں کی بدولت) کفر ہی کی حالت میں دیں گے۔

سورۂ منافقون میں خود مسلمانوں کو مال و دولت سے اس طرح ڈرایا کہ دیکھو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (ع ۳)

اے ایمان والو! تمہارے اموال و اولاد کہیں تم کو خدا کی یاد (و اطاعت) سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو ایسا کریں گے تو وہ گھاٹے ہی میں رہنے والے ہیں۔

پھر یہ تو مسلمانوں اور ایمان والوں کے لئے ایک کھلی حقیقت ہے جس کو بکثرت اور بار بار دہرایا گیا ہے کہ اس چندروزہ پست زندگی کی ایسی بساط ہی کیا ہے جس کے مال و متاع کے کسب و حصول میں مر کھپ کر اپنی اصلی و ابدی خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی زندگی کو برباد کر بیٹھو۔

"دنیا میں جو کچھ بھی تم کو دیا گیا ہے اس کی بساط اس پست و حقیر زندگی اور اس کی آرائش و نمائش کے سازوسامان سے زیادہ نہیں، ورنہ بہترین اور ہمیشہ باقی رہنے والا سرمایہ تو وہ اجروثواب ہی ہوگا جو ایمان و عمل صالح کی زندگی گذارنے والوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں عطا ہوگا مگر اکثر احمق آدمی اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔ بھلا وہ شخص جس سے اللہ تعالیٰ نے آخرت کے اجروانعام کے اچھے اچھے وعدے فرمائے ہیں اور جو بالآخر پورے ہو کر اور موعودہ نعمتیں مل کر رہیں گی۔ کیا اس کے لئے زیبا ہے کہ وہ اس شخص کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے جس کو خدا نے محض اس پست زندگی کا کچھ سازوسامان دے دیا ہے اور آخر کار اس کو قیامت کے دن اس سازوسامان یا عیش و عشرت کا مزہ چکھنے کیلئے حاضر ہونا پڑے گا۔ (تفسیری ترجمہ)

وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَزِیْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِیْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ هُوَ یَوْمَ

الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ہ (قصص ع ۷)

اور بھی کتنی جگہ مختلف عنوانات سے دنیا کے مال و متاع یا اس سے تمتع و استفادہ کا خصوصاً آخرت کے مقابلہ میں استخفاف و تحقیر ہی سے ذکر ہے مثلاً :۔

"کہہ دو کہ دنیا کی چیزوں سے تمتع و انتفاع کا موقع بہت تھوڑا ہے اور آخرت ہر طرح اس شخص کے لئے بہتر ہی ہے جس نے تقویٰ کی زندگی بسر کی"

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَّالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى"

سورۂ مومن میں فرعون کی فرعونیت کے مقابلہ میں ایک مومن پکار اٹھتا ہے کہ :۔

"بھائیو! اس پست زندگی کا حظ و تمتع محض چند روز کا ہے اور ہمیشہ ٹھہرنے کی جگہ آخرت ہی ہے"

"يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ"

جن کو کچھ مال و دولت یا رزق فراغت زیادہ حاصل ہو جاتی ہے وہ اس پست چند روزہ زندگی پر اور بھی اکڑنے لگتے ہیں، حالانکہ رزق یا معاشی تنگی و کشادگی اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اور یہی حکمت پر مبنی ہے ورنہ دراصل اس دنیوی زندگی کی آخرت کے مقابلہ میں ایک متاع حقیر سے زیادہ بساط ہی کیا ہے جو آدمی اس کے مال و دولت پر اترانے لگے،

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ط وَفَرِحُوْا

بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ
اِلَّا مَتَاعٌ ۞ (رعد ع ۳)

اوپر مال و دولت کی خلقی شدید محبت کے سلسلہ میں آل عمران کی وہ آیات پڑھ ہی چکے ہو جس میں سونے چاندی کے ڈھیروں پر ڈھیروں، گویا مال و دولت کے پہاڑوں تک کو اس پست زندگی کی متاع سے زیادہ نہیں قرار دیا گیا ہے اور اس کے مقابلہ میں سارا زور آخرت ہی کی مطلوبیت پر ہے۔

سورۂ زخرف میں ہے:۔ کہ:۔

"اگر یہ بات نہ ہوتی کہ حرص و طمع میں آکر کم و بیش سب ہی کافر ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے باغیوں یا کافروں کو اتنا دھن دولت دیدیتا کہ ان کا سارا گھر اور ساز و سامان، چھتیں، دروازے، زینے تخت وغیرہ سب کے سب سونے کے بن جاتے کیونکہ یہ سب چیزیں بس زیادہ سے زیادہ اسی پست و فانی زندگی کا حقیر سرمایہ ہیں اور اصل زندگی تو بس آخرت کی ابدی زندگی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کے نہیں تقویٰ کے سرمایہ داروں کے لئے محفوظ رکھی ہے (ع ۳)

ایک اور عجیب آیت کافروں ہی کے متعلق مادی دنیا میں ان کی دنیوی و ظاہری کامیابیوں کی آل عمران میں ایسی ملتی ہے کہ جب تلاوت میں آتی ہے تو کفر اور کافروں کے دنیا میں موجودہ غلبہ و تسلط کا نقشہ کھنچ جاتا ہے ارشاد ہے۔

"کہ کفر اور کافرانہ زندگی اختیار کرنے والوں کا جو سارے ملکوں

میں دور دورہ نظر آرہا ہے اس سے تم دھوکے میں نہ پڑ جانا کیونکہ یہ بہار بہت عارضی ہے بس دیکھتے ہی دیکھتے سب کا خاتمہ تھوڑے ہی دنوں میں آخرت کی ابدی جہنمی زندگی پر ہونے والا ہے اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ (آخری رکوع)

شہروں شہروں، ملکوں ملکوں، پورے کرۂ ارض پر ریلوں، موٹروں ہوائی جہازوں کی بدولت آج کفر اور کافرانہ یا اس دنیا کی حقیر و خسیس زندگی کے لئے جس شد و مد کے ساتھ چل پھر دوڑ و دھوپ آمد و شد کا دور دورہ ہے تَقَلُّبُ فِي الْبِلَادِ کے دو ہی لفظوں نے اس کی کیسی جاندار تصویر آنکھوں کے سامنے کردی ہے ظاہری چل پھر کے علاوہ "تقلب" کے لغوی مفہوم میں تدبیری تصرفات بھی داخل ہیں[1] جس سے سیاسی و سائنسی، تجارتی و صنعتی وغیرہ ہر طرح کی دنیوی دوڑ دھوپ یا جدوجہد کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے۔

مال کے بجائے مآل کی ترغیب

خلاصہ یہ کہ معاشیات جس "علم المال" کا نام ہے آپ نے دیکھا کہ اس مال کی طلب و تحصیل کی ترغیب و تحسین کے بجائے اسلام کی کتاب کا اصل زور اس کے مفاسد اور خرابیوں کی تنبیہ پر ہے اور ترغیب و تحسین مال کے مقابلہ میں کم و بیش ہر جگہ مآل یا آخرت کی طلب و تحصیل کی ہے اس کے بالکل برعکس عہد حاضر کی معاشی تعلیمات اور دعوتوں کا ماحصل

[1] ملاحظہ ہو مفردات راغب ۱۲

انسان کو خدا اور آخرت سے توڑ کر تمامتر بندۂ شکم بنا دیتا ہے۔

آیات کے بعد احادیث

آیات کے بعد روایاتِ حدیث کو لیجئے تو اس میں مال و دنیا کی مذمت پر ذم المال والدنیا کے عنوان سے مستقل باب ملتا ہے جس میں اس قسم کی روایات درج ہیں۔

حضرت ابو ذرؓ راوی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ وسلم کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے کہ میں حاضر خدمت ہوا دیکھ کر فرمانے لگے کہ رب کعبہ کی قسم وہی لوگ سب سے زیادہ گھاٹے میں ہیں، وہی لوگ سب سے زیادہ گھاٹے میں ہیں..... میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا جن کے پاس مال زیادہ ہے۔ مگر یہ کہ آدمی اس کو داہنے بائیں، آگے پیچھے ہر طرف برابر خرچ ہی کرتا ہے اور ایسے خرچ کرنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔

بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ

"بحرین سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب جزیہ کا مال آیا اور انصار اس کی خبر پاکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو دیکھ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ تم جو امید لے کر آئے ہو پوری ہو گی، ساتھ ہی فرمایا کہ خدا کی قسم میں تمہارے فقر و فاقہ سے نہیں ڈرتا البتہ اس سے ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا کشادہ کی جائے جیسا کہ تم سے پہلوں پر کی گئی اور تم کو اس کا حرص و مقابلہ اسی طرح ہلاک کر دے جس طرح ان کو کیا"

اسی طرح دوسری متفق علیہ روایت ہے کہ :۔

"میں جس بات سے تم پر اپنے بعد ڈرتا ہوں وہ دنیا کی سرسبزی و شادابی اور آرائش کے دروازوں کا تم پر کھل جاتا ہے"

اسی مطلب کو ترمذی میں حضرت کعب بن عیاض نے اس طرح روایت کیا ہے کہ :۔

"ہر امت کے لئے کوئی نہ کوئی فتنہ رہا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے"

بخاری کی ایک حدیث میں بطور بددعا زبان مبارک سے یہ الفاظ مروی ہیں کہ :۔

"ہلاک ہو بندۂ درہم و دینار (روپیہ پیسہ کا پجاری) —
تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَ الدِّرْھَمِ۔

انبیائی اسوہ

گو مال و دولت سے نفرت کرنا یا افلاس و غربت کو دعوت دینا بذاتِ خود مامور و مطلوب نہیں تاہم حضرات انبیاء علیہم السلام نے بالعموم اور نبی الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بالخصوص امت و انسانیت کے لئے جو اسوہ چھوڑا ہے وہ فقر و قناعت ہی کا ہے، دولت و امارت کا نہیں، کون نہیں جانتا کہ مکی نہیں مدنی زندگی اور پورے ملک عرب کی بادشاہی کے عہد میں بھی کاشانۂ نبوت میں ایک دو دن نہیں دو دو مہینے متواتر چولہا نہیں جلتا تھا پانی اور کھجور پر گذر ہوتا تھا حضرتِ

عائشہ فرماتی ہیں کہ :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سے مدینہ تشریف لائے وفات تک آپ کے گھر والوں نے کبھی تین رات بھر گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی ۔"

اور بھی اسی طرح کی بہت سی روایتیں حدیث کی عام و متداول کتابوں میں ملتی ہیں کہ :-

" رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئے کہ جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی ۔" چپاتیوں کی سی باریک روٹی تک تناول نہیں فرمائی ۔" خراب کھجور تک پیٹ بھر نہیں نوش فرمائے ۔" بعثت سے وفات تک میدہ کی روٹی نہیں دیکھی ۔" چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائی جو کہ پیس کر بس منہ سے پھونک دیا جاتا اس سے جتنی بھوسی اڑ جاتی ، باقی ویسے ہی گوندھ کر پکا لیا جاتا ۔"

بڑا قیمتی سبق

مدینہ کی زندگی میں اس طرح کی تنگی پر ظاہر ہے کہ آپؐ مجبور و مضطر ہرگز نہ تھے ، دیدہ و دانستہ اس حال کو اختیار فرما کر ظاہر ہے کہ امت و انسانیت کو کوئی بڑا قیمتی سبق دینا تھا وہ سبق یہی ہو سکتا تھا کہ آدمی کی نظر خدا و آخرت پر ہو تو دنیا کے مال و متاع ، عیش و عشرت کیا معنیٰ ! معمولی آسودہ حالی کو بھی زندگی کا مقصد بہر حال نہیں بنایا جا سکتا ۔ آدھا پیٹ کھا کر بھی گذر کی جا سکتی ہے نہ کہ پوری زندگی کو پیٹ ہی پیٹ کے

نعروں، انفرادی و اجتماعی لڑائی جھگڑوں، قومی اور بین الاقوامی شر و فساد اور جنگوں میں تبدیل کر دینا۔ جیسا کہ ماڈرن معاشیات اور اس پر مبنی سیاسیات نے کر رکھا ہے یہ انسان و انسانیت کی انتہائی ذلت و رسوائی اور ہڈیوں پر کتوں کی لڑائی کے سوا کیا ہے۔

ایک اور بہت بڑا فساد

مال و دولت کا یہ ہے کہ اس کا کبر و غرور اور حرص و طمع بالعموم حق کے قبول و اعتراف سے مانع ہو جاتی ہے فرعون و قارون کو جاہ و مال کے فریب کے سوا حق شناسی یا ایمان سے کس نے محروم رکھا اور حقیر و فقیر جادوگر جن کو مال ہی کا لالچ دلا کر داعیٔ حق حضرت موسیٰ کے مقابلہ پر آمادہ کیا گیا تھا۔ وہ اس لالچ ہی سے بچ کر اور حق کو پہچان کر پکار اٹھے کہ:۔

"ہم تو ہارون و موسیٰ کے رب پر ایمان لاتے ہیں۔ قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ مُوْسٰى وَهَارُوْنَ۔

پھر فرعون نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سولی چڑھانے تک کی دھمکیاں دی مگر دین حق کا مزہ پا کر ان غریبوں کا جواب کیا تھا کہ

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى	ہم تو حق کی ان کھلی باتوں
مَا جَاۤءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ	اور اپنے پروردگار کے مقابلہ میں
وَالَّذِىْ فَطَرَنَا فَاقْضِ	تجھ کو، یا تیرے حکم کو، ہرگز اختیار
مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا	نہ کریں گے، بس تجھ کو جو کچھ کرنا
تَقْضِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ	ہے کر لے تو جو کچھ بھی کر سکتا ہے

زیادہ سے زیادہ اس دنیا کی زندگی ہی کی حد تک کر سکتا ہے۔.....اور اللہ ہر طرح بدرجہا بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

ایمان لانے والے زیادہ مساکین ہی ہوتے ہیں

اور بھی عموماً حق کی پکار سننے اور انبیاء پر ایمان لانے والے زیادہ تر غرباء و مساکین ہی ہوتے ہیں جو بہت ہی ذلیل و حقیر نظر آتے ہیں۔ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ۔ حدیث بھی شاہد ہے کہ حضرات انبیاء کے پیرو اکثر غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔

ان سطروں کے دورانِ تحریر ہی میں سیرۃ النبی (علامہ شبلیؒ) کا ایک اقتباس نظر پڑا کہ خود پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فقر و افلاس کی گدڑیوں میں خدمتِ اسلام کے کیسے کیسے لعل ملے۔

"یہ لوگ قریش کے مناصب اعظم میں سے کوئی منصب نہ رکھتے تھے بلکہ اکثر ایسے تھے مثلاً عمارؓ، خبابؓ، ابو صہیب وغیرہ (رضی اللہ عنہم) جن کو دولت و جاہ کے دربار میں جگہ بھی نہ مل سکتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو لے کر حرم میں جاتے تو رؤسائے قریش ہنس کر کہتے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا۔ (اَهٰؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنْۢ بَيْنِنَا)

"کفار کے نزدیک ان کا افلاس ان کی تحقیر کا سبب تھا لیکن یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ایمان کی دولت سب سے پہلے انہیں کے ہاتھ آسکتی تھی، دولت و مال ان کے دلوں کو

سیاہ نہیں کر چکا تھا، فخر و غرور ان کو اختیار حق سے روک نہیں سکتا تھا۔ ان کو یہ ڈر نہ تھا کہ اگر بت پرستی چھوڑ دیں گے تو کعبہ کا کوئی منصب عظیم ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ غرض ان کے دل (مال و جاہ) ہر قسم کے زنگ سے پاک تھے اور حق کی شعاعیں ان پر دفعۃً پرتو افگن ہو سکتی تھیں، یہی سبب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ابتدائی پیرو ہمیشہ نادار و مفلس لوگ ہوتے ہیں عیسائیت کے ارکان اولین ماہی گیر تھے حضرت نوح علیہ السلام کے مقربین خاص کی نسبت کفار کو یہ کہنا پڑا جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے ”کہ تیری پیروی انہی لوگوں نے کی جو رذیل ہیں اور ہم تو تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم سب جھوٹے ہو“

حکومت کے چٹورے

آج ہم مسلمانوں کے منہ میں پانی سب سے زیادہ حکومت و سلطنت کے نام سے بھر آتا ہے بہتیرے اسلام کا نام ہی حکومت کی چاٹ میں لیتے ہیں کیا پاکستان کا نعرہ لگانے والے اکثر ایسے ہی نہ تھے[1] لیکن اسلام کی حکومت خود حکومت کے چٹوروں سے ہرگز قائم نہیں ہوتی بلکہ خدا و آخرت پر راسخ و مضبوط ایمان رکھنے والوں سے

---

[1] جن کی دریدہ دہنیاں پاکستان قائم ہو جانے کے بعد یہاں تک پہنچی ہیں کہ دنیا میں کبھی کہیں اسلامی حکومت قائم بھی ہوتی ہے ! یہ پاکستان کے ایک وزیر کے الفاظ ہیں “

اقتباس بالا کی اگلی سطروں میں ہے کہ:۔

"یہ شائقین اسلام جس قسم کا راسخ ایمان لائے تھے اس کی تفصیل آگے آتی ہے جس سے ظاہر ہوگا کہ قریش کی سخت خونخواریاں جور وظلم کے شدائد اور زر و مال کی انتہائی ترغیبیں کوئی چیز ان کو متزلزل نہ کر سکی اور آخر ان ہی کمزور ہاتھوں نے قیصر وکسریٰ کا تخت الٹ دیا"

(سیرۃ النبی ؐ حصہ اول از علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ)

اسلام کی حکومت حقیقی معنی میں ایسے ہی ہاتھوں سے پہلے بھی قائم ہوئی تھی اور آئندہ بھی جب اور جہاں قائم ہوگی ایسے ہی ہاتھوں سے ہوگی۔ یہ تو موقع کی ایک استطرادی بات تھی۔ کہنا یہ ہے کہ دینی نقطۂ نظر اور وحی نبوت کی ساری تعلیم و تاریخ سے مدح و ستائش زیادہ تر فقر و قناعت ہی کی نکلتی ہے اور آج کے معاشی نعروں کی طرح نفسِ مال و معاش کے حصول و کسب کی تحریص و تاکید کا تو ایک حرف بھی نہیں ملتا۔

دینی معاش تمام تر معاد کے تابع

راز وہی ہے کہ وحی نبوت کی تعلیم و دعوت کا بالذات تعلق خدا و آخرت یا معاد کی طلب و ترغیب سے ہوتا ہے باقی امور معاش یا دنیوی معاملات سے متعلق دینی احکام جو کچھ بھی ہوتے ہیں وہ تمام تر معاد ہی کی اصلاح و فساد کے تابع اور اسی کے بناؤ بگاڑ کے مدنظر۔

البتہ چونکہ بنانے والے نے دنیا کو تمام تر دین و آخرت ہی کے لئے بنایا ہے اس لئے لازماً خود دنیا کا بناؤ بھی دین ہی کے اوامر و نواہی یا

احکام کے اتباع میں منحصر و مضمر ہے جن سے دین بنتا ہے ورنہ آسمانی کتابیں نہ معاشیات کی کوئی علمی وفنی کتاب ہوتی ہے اور نہ انبیائی دعوت براہ راست کسی معاشی دعوت یا آئیڈیالوجی کا نعرہ ہوتی ہے بخلاف اس کے غیر معادی یا غیر اسلامی و لادینی معاشیات کا نعرہ جب تمامتر دنیا ہی کے معیار زندگی کو بلند سے بلند تر کرنا ہے تو قدرۃً انفرادی و اجتماعی، قومی و بین الاقوامی طور پر اس کی تعلیم کا زور بھی دوسرے افراد، جماعتوں اور قوموں کے مقابلہ میں ایثار سے زیادہ خود غرضی، دینے سے زیادہ لینے، خرچ کرنے سے زیادہ کمانے، یا انفاق سے کسب ہی پر ہوگا۔ کیونکہ اس مادی و معاشی زندگی کا معیار کسب و کسبیت یا حصولِ مال و زر ہی کی راہ سے بلند کیا جا سکتا ہے۔

اصل روح انفاق یا ایثار ہے

دوسری طرف اسلامی یا معادی معاشیات کی اصل روح انفاق وانفاقیت یا ایثار و قربانی ہے اس میں کسب کی گنجائش جو کچھ ہے بھی تو "زیستن برائے خوردن" کے لئے نہیں بلکہ "خوردن برائے زیستن" کیلئے اور "زیستن" بھر کے "خوردن" کی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے ایک تو خود انسان کی فطرت میں کسب و حصول کا داعیہ اتنا قوی اور عقل معاش اس کو اتنی کافی عطا کر دی گئی ہے کہ معاش میں کسی غفلت و اختلال کا احتمال نہیں رہ جاتا اور اول و آخر یہ کہ جب تک اس کو جلانا ہے کھلانے کا ذمہ پیدا کرنے والے نے خود اپنے اوپر انسان ہی کا نہیں ہر جاندار کا لے رکھا ہے۔ ان مقدمات کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ اسلام کی معاشی تعلیم یا معاشیات

جو کچھ بھی ہو اصلاً و اصولاً معاشیات انفاق ہی ہوگی۔ اور انفاق سے مراد ظاہر ہے کہ وہی ہوگا جو معادی معاشیات کے چوکھٹے میں ٹھیک بیٹھ سکے یعنی جس کا بنیادی مقصد معاشی نہیں معادی معیار کو ملتید سے بلند تر کرنا ہو

کسب کے لئے قرآنی اصطلاح ابتغاء فضل کا راز

قرآن مجید بھر میں دو چار جگہ کسب کی جو تعلیم ہے بھی اس کے لئے ابتغاءً فضل کی اصطلاح استعمال فرمائی گئی ہے وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ اور خدا کا فضل وہی ہو سکتا ہے جس سے اس کی زیادہ سے زیادہ رضا حاصل ہو۔ بالفاظ دیگر جس سے معاد ہی کا معیار اونچا ہو لیکن چونکہ ظاہری صورت طلب فضل کی بھی کسب ہی ہوتی ہے لہذا حکم یا تاکید کا عنوان۔ ابتغاء فضل کے لئے بھی نہیں اختیار فرمایا بس اجازت یا بہت سے بہت استحسان کا درجہ رکھا ہے ارشاد ہے کہ جب نماز جمعہ سے فارغ ہو چکو تو اپنے اپنے رزقی مشاغل کی جگہوں میں پھیل کر خدا کا فضل تلاش کرو۔ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ جس کا مطلب یہ کوئی بھی نہیں لیتا اور نہ لے سکتا ہے کہ نماز جمعہ کے بعد کسی نہ کسی کاروبار یا معاشی دھندے میں لگنا فرض و واجب ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ کھانے کمانے کے دھندے میں اتنا منہمک نہ ہو کہ نماز کھا جاؤ جیسے ہی نماز کی پکار (اذان) ہو سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کے خدا کی یاد کے لئے دوڑ پڑو، اسی میں تمہاری حقیقی بھلائی اور بہبودی ہے۔ اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ہاں

جب نماز ختم ہو چکے تو پھر اپنے معاشی کاموں یا کسبی مشاغل میں خدا کی رضا اور احکام کے تابع رہ کر لگ سکتے ہو کہ تب ہی یہ کسب "فضل اللہ" کا مصداق ہو گا ورنہ خدا کا فضل کیا الٹے خدا کا غضب خرید دو گے، تاکید ہے تو اس کی کہ نماز سے فارغ ہو کر بھی جب پیٹ یا دنیا کے دھندوں میں لگو تب بھی خدا یاد سے غفلت ہرگز نہ ہو برابر کثرت سے اس کی یاد بھی ساتھ ساتھ چلی جائے یعنی اس کے احکام سے معاشی و دنیوی کاموں کے دوران میں تجاوز و سرتابی قطعاً نہ ہو کہ خدا کی حقیقی و عملی یاد یہی ہے۔ اور اسی پر دنیا و آخرت دونوں کی فلاح و بہبود منحصر ہے۔ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ط اسی طرح دوسری جگہ حکم ہے تو یہ کہ دیکھو، مسلمانو ایسا نہ ہونے پائے کہ تمہارے مال و دولت آل و اولاد کے دنیوی بکھیڑے تم کو خدا کی یاد سے غافل و بے پرواہ کر دیں۔ اور جو بھی ایسا کرے گا بالآخر دین و دنیا ہر اعتبار سے وہ گھاٹے ہی گھاٹے میں رہنے والے ہوں گے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ

(منافقون ع ۱)

معادی معاشیات والوں کی خاص پہچان

ایک اور جگہ دینی یا معادی معاشیات والوں کی خاص پہچان یہ بتلائی کہ وہ ان لوگوں کی تجارت یا کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل ان کو اللہ کی یاد اور (اس کے احکام) نماز زکوٰۃ (وغیرہ) سے غافل نہیں ہونے دیتے۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ۔ غافل نہ ہونے کا راز یہی ہے کہ ان لوگوں نے اپنے معاشی مشاغل بالکلیہ معادی مصالح کے تابع کر رکھے ہیں اور ان مصروفیتوں کے دوران میں بھی وہ مؤاخذہ یا آخرت کے

یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ (النور رکوع ۵)

اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی ایسے ڈرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ عطا فرمائے گا اور بدلہ کے ماسوا خاص اپنے فضل سے اور بھی بہت کچھ دے گا۔

اور چونکہ آدمی کاروباری یا معاشی کامیابیوں کو تمامتر اپنی تدبیری سرگرمیوں پر موقوف جانتا ہے اس لئے ساتھ ہی اس پر متنبہ فرما دیا کہ رزق و معاش کا دارومدار دراصل اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے وہ جس کو چاہتا ہے (بلا تدبیر بھی) بیشمار دیدیتا ہے۔ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ اور پھر آگے دین و آخرت کے منکروں یا کافروں کی سرگرمیوں کا یہ حسرتناک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ:۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ کَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْئًا

ان کے اعمال و مشاغل کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت یا سراب ہو جس کو پیاسا پانی خیال کرتا ہو یہاں تک کہ جب اس سراب کے پاس

پہونچا جس کو پانی سمجھ رکھا تھا، تو کچھ نہ پایا۔

یہ تو منکرین دین و آخرت کو پوری طرح آخرت ہیں ہی نظر آئے گا جب اللہ تعالیٰ کا سامنا ہوگا اور دنیا کی سرابی اور پرفریب چمک دمک والی سرگرمیوں کا حساب وہ چکائے گا۔ اور یہ حساب اللہ تعالیٰ بہت جلد کرنے والا ہے اس لئے کہ دنیا کی چندروزہ زندگی خود ہی سراب سے زیادہ کیا ہے؟

وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ

لیکن اس دنیا میں بھی اگر ہم آنکھیں کھول کر دیکھیں تو کتنی ہماری سرگرمیاں خصوصاً معاشی تدبیریں نامرادیوں پر ختم ہوتی اور سراب ہی ثابت ہوتی رہتی ہیں۔

اسلامی معاشیات تمامتر انفاقی معاشیات ہے

خلاصہ یہ ہے کہ آج کل کی معاشیات یا علم المال کی دو بڑی بحثوں

(۱) مال کا کسب و حصول،

(۲) اس کا استعمال و انفاق۔

ان میں نفس کسب کے تدبیری مشاغل یا سرگرمیوں پر کوئی زور تو قرآنی یا اسلامی معاشیات ہیں سرے سے ندارد ہی ہے اور جو کچھ ہے وہ کسب کی ناجائز یا باطل تدبیروں اور طریقوں کی روک تھام پر ورنہ اصل زور کسب کی بجائے انفاق ہی پر اتنا ملتا ہے کہ اسلامی معاشیات کہنا چاہئے کہ تمامتر انفاقی معاشیات کا نام ہے۔

اس انفاق کے معنیٰ

اور اس انفاق کے معنیٰ بھی آج کل کی طرح من مانی راہوں میں خرچ

کرنے کے قطعاً نہیں دنیوی زندگی کی آرائشوں اور نمائشوں میں
نہ محض دنیوی منافع و مقاصد کی نیت سے جو خالص مادی یا غیر معادی
معاشیات کے مالی انفاق و استعمال کے مباحث کا حاصل ہوتا ہے بلکہ
مال کا یہ استعمال یا انفاق خواہ اپنے نفس یا اہل و عیال ہی پہ کیوں نہ ہو
اسلامی انفاق اسی وقت قرار پائے گا جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کی راہ و رضا کی
نیت یعنی احکام شریعت کے مطابق اور فلاح آخرت کے مدنظر ہو۔
آگے خود قرآن مجید کو اس نقطۂ نظر سے پڑھو۔

فاتحۃ الکتاب کی تمہیدی سات آیتوں کے بعد پہلی سورت (بقرہ)
کی ابتداء میں اسلام کی اس کتاب سے ہدایت پانے اور بالآخر فلاح و کامیابی
کی جو سات شرطیں لگائی گئی ہیں ان میں ایمانیات (یُؤْمِنُوْنَ
بِالْغَیْبِ اور عبادات یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ) کے بعد تیسری شرط انفاق
ہی کی ملتی ہے۔ انفاق سے مراد بھی روپیہ پیسہ ہی کا خرچ کرنا نہیں جسمانی
و ذہنی قوت و قابلیت وقت و فرصت جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے جس کو
دے رکھا ہے سب ہی کو حسب موقع خرچ کرنے کا مطالبہ ہے وَمِمَّا
رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ہ

انفاق پر مسلسل دو رکوع

آگے قرآن کی اسی سب سے پہلی اور سب سے بڑی سورۃ میں جس ایک مضمون
کا فقط ایک دو آیتوں میں نہیں مسلسل پورے دو رکوع (۳۵-۳۶)
میں ذکر چلا گیا ہے وہ انفاق ہی کی مختلف و دلنشین تمثیلات و تعبیرات
سے ترغیب و تحریص ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ط

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ (ایسی ہے)، جیسے ایک دانہ (بوؤ) جس سے سات بالیاں پیدا ہوں (اور) ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اس سے بھی زیادہ اللہ جس کو جتنا چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت و علم والا ہے (اس کے پاس کسی چیز کی کمی تو ہے نہیں اپنے علم و حکمت کے موافق جس کو جتنا بھی چاہتا ہے دیتا ہے)

یہ انفاق کسی مادی نفع کے لئے نہیں

پھر اس انفاق میں دنیا کے کسی مادی نفع پر نظر رکھنے کی اجازت تو الگ رہی کسی طرح کا احسان تک رکھنے کی اجازت نہیں۔ نظر صرف اللہ کی رضا اور آخرت کے اجر پر رہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں اس طرح خرچ کرتے ہیں کہ نہ اس پر زبان سے کوئی احسان جتلاتے ہیں اور نہ (اپنے کسی برتاؤ سے کوئی) آزار پہنچاتے ہیں تو ایسے ہی لوگوں کو اپنے انفاق

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ
مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ
صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى وَاللّٰهُ
غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ
يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ
وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ
عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ
وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا
لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ
مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

کا بدلہ اپنے پروردگار کے پاس ملیگا
اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا نہ غم
زبان سے کوئی اچھی بات کہہ دینا
یا (کسی معاملہ میں) کسی (کی زیادتی)
کو معاف کر دینا ایسی خیر و خیرات سے
بہتر ہے جس کے بعد کوئی آزار پہونچایا
جائے (لہذا) اے ایمان لانے والو
(اللہ اور آخرت پر تمہارے ایمان کا تقاضا
ہی یہ ہے کہ) تم احسان رکھ کر یا
آزار پہنچا کر اپنی خیرات کو اس شخص
کی طرح برباد کر ڈالو جو لوگوں کے
دکھلانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور
ایمان نہ اللہ ہی پر رکھتا ہے نہ آخرت
پر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک
چٹان ہو جس پر کچھ مٹی پڑی ہے پھر
اس پر زور کی بارش پڑے جو اس کو
کوئی روئیدگی یا سرسبزی بخشنے کے
بجائے جیسا تھا ویسا ہی سپاٹ
کر چھوڑے ایسے لوگوں کو اپنی (اس
بظاہر نیک) کمائی سے کچھ بھی ہاتھ
نہیں لگتا۔ اور اللہ (خدا و آخرت

کا) انکار کرنے والوں کو (انفاق کی
بھی) صحیح راہ نہیں دکھاتا۔

اس کے برخلاف

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ
اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ
اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ عِنْدِ
اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ
بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ
فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ وَ
اِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

ان لوگوں کے خرچ کرنے کی مثال جو
اپنے مالوں کو اللہ کی خوشنودیوں کی
خاطر اپنے نفسوں (یا نیتوں) کی پختگی
کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ایسے باغ
کی ہے جو کسی ٹیکرے پر واقع ہو
کہ اس پر زور کا پانی پڑے تب تو وہ
دو گنا چوگنا پھل لاتے اور اگر زور
کی بارش نہ بھی ہو تو پھوار ہی کافی
ہو جاتے (برباد بہر حال نہ ہو) اور
تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس (کے
متعلق تمہاری ظاہری و باطنی حالت
و نیت سب) سے آگاہ ہے (اسی
کے اعتبار سے اجر دیگا)

کسب کا ذکر بھی انفاق کے لئے

اس کے بعد کمائی یا کسب کا ذکر ہے مگر خود کسب کے لئے نہیں بلکہ
انفاق ہی کے لئے۔ بہتوں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنی کمائی سے خیر و خیرات
کے نام پر کچھ دیتے بھی ہیں تو ایسی بیکار ردی چیزیں جو خود اپنے کام میں

لانا پسند نہیں ہوتا، مثلاً پھٹے پرانے کپڑے، گلا سڑا اناج، باسی تواسی کھانا۔ ایسا انفاق بھی اسلام وایمان کی شان کے خلاف ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ

اے ایمان والو اپنی کمائی میں سے عمدہ چیزوں کو راہ خدا میں خرچ کیا کرو اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں اور ایسی خراب چیزوں کے دینے کا قصد نہ کرو جن کو تم خود لینے پر آمادہ نہیں ہو بجز اس کے کہ چشم پوشی سے کام لو (یہ اور بات ہے) اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ (محتاج نہیں کہ اس کے لئے تم سڑی گلی چیز خرچ کرو) وہ تو ہر طرح بے نیاز اور لائق ستائش ہی ہے

انفاق کوتاہیوں کے دو سبب

انفاق میں اس طرح کی ساری کوتاہیوں کے بالعموم دو سبب ہوتے ہیں ایک خود اپنی محتاجی کا ڈر کہ صدقات وخیرات میں خرچ کرنے سے ہم خود خالی ہاتھ نہ ہوجائیں یا بال بچوں کے لئے پس انداز نہ ہو سکے دوسرے جو لوگ عیاشی وآوارگی شراب وقمار اور ڈانس وغیرہ کے فواحش میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے پاس نیک راہوں میں خرچ کرنے کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے آگے ان دونوں شیطانی وسوسوں

اور حرکتوں پر تنبیہ ہے۔

اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝

شیطان تم کو (ایک طرف) مفلسی سے ڈراتا ہے اور (دوسری طرف) بری باتوں کا حکم کرتا ہے اور اللہ (اس کے برخلاف خیر و خیرات میں خرچ کرنے پر آخرت میں) تم سے مغفرت کا (اور دنیا میں زیادہ دینے یا) فضل کا وعدہ فرماتا ہے اور اللہ ہی کشادگی دینے والا اور خوب جاننے والا ہے (کہ کس کے لئے کیا مناسب و مصلحت ہے)

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَۃٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُہٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو سب کو اللہ ضرور جانتا ہے (اس لئے اس کے رائگاں ہونے کا تو وہم ہی نہ کرو) اور ایسے ظالموں کا (جو شیطان کے بہکانے سے مفلسی سے ڈرتے ہیں یا فواحش میں اڑاتے ہیں اللہ کے مقابلہ میں ان کا) کوئی یار و مددگار نہیں ہو سکتا (البتہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ اگر کسی وقت محتاج بھی ہو جائیں تو اللہ ان کی مدد پر ہر طرح قادر ہے

غرض ترغیب و تاکید نہ کمانے کی ہے نہ کما کر جمع کرنے کی اور نہ اپنی عیش پرستیوں اور نفس پروری میں اڑانے کی بلکہ کھلے چھپے حسب موقع نیک راہوں میں خرچ ہی خرچ کرتے رہنے کی۔ ارشاد ہے کہ

کھلے چھپے ہر طرح انفاق کی ترغیب

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

تم صدقات ظاہر کر کے کھلے طور پر دو تب بھی اچھا ہے اور حاجتمندوں کو چھپا کر دو تو اور بھی تمہارے حق میں بہتر ہے (بڑی بات تو یہ ہے کہ) اللہ اس کی برکت سے تمہاری برائیوں کو مٹا دیگا اور تم جو کچھ (کھلے چھپے جس طرح بھی) کرتے ہو وہ سب پوری طرح جانتا ہے"

عجیب بات

ہے کہ ظاہراً تو صدقات وخیرات کے دینے میں نفع دینے والا کا نہیں بلکہ جس کو دیا جاتا ہے اس کا ہے کہ اس کی معاشی تنگی د دشواری دفع ہوتی ہے۔ مگر کہا اس کے بجائے یہ جا رہا ہے کہ کھلے چھپے جس طرح بھی کسی کو دو بھلا اور بہتر تمہارے حق میں ہے کیوں؟ اس لئے کہ انفاق کی اصلی غرض حاجتمند کی معاشی یا رزقی حاجت روائی نہیں جیسا کہ نام نہاد اسلامی معاشیات والے زور دیتے ہیں کہ زکوٰۃ وغیرہ کا حکم معاشی مسائل کے حل کے لئے ہے کیونکہ

اپنے محتاج بندوں کو رزق تو ان کا قادرِ مطلق رزاق ہزار طرح پہنچا سکتا ہے تم کو جو انفاق کا حکم دیا گیا ہے اس میں اصل نفع تمہارا ہی ہے بشرطیکہ خدا اور آخرت پر ایمان ہو اور نیت اصل میں معاشی مسائل کے حل کرنے کی نہیں بلکہ خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح ہو۔ آگے ارشاد ہے کہ

خرچ کرنے میں نفع خرچ کرنیوالے ہی کا نہ کہ جس پر خرچ کیا

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

تم جو بھی خرچ کرتے ہو اس میں نفع خود تمہارا ہی ہے کیونکہ تم اللہ کی رضا جوئی کے سوا اور کسی مطلب سے نہیں خرچ کرتے ہو اور (اس طرح) تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو (بالآخر) پورا کا پورا تم کو ملکر رہے گا کمی یا ظلم ذرہ برابر بھی تمہارے حق میں نہ ہوگا۔

مصارفِ انفاق

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ

یہ ان لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ کی راہ (خدمت دین) میں بندھے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے (تلاشِ معاش میں) کہیں آجا نہیں سکتے اور چونکہ وہ سوال سے بھی بچتے ہیں اس لئے ناواقف ان کو آسودہ حال

لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ؒ

خیال کرتا ہے حالانکہ تم ان (کے فقروفاقہ) کو ان کے چہرہ سے پہچان سکتے ہو (البتہ) وہ لپٹ کر نہیں مانگتے باقی تم جو کچھ بھی خرچ کروگے اللہ اس کو بہرحال خوب جانتا ہے

جب تم خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ کرتے ہو اور خدا اس کو خوب جانتا بھی ہے تو پھر اس کے خزانہ میں کمی کیا ہے جو اس کا بہتر سے بہتر اور بھرپور بدلہ نہ ملے گا لہٰذا اس صورت میں آدمی کیوں نہ دن رات کھلے چھپے خوب دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ؒ

جو لوگ بھی اپنے مالوں کو دن رات کھلے چھپے ہر طرح خرچ کرتے رہتے ہیں ان کا بدلہ (آخرت ہی نہیں دنیا میں بھی) ان کے کوئی خوف وغم کی بات نہ ہوگی (کہ خرچ کرنے سے ہم مفلس یا ہماری آل اولاد بے سہارا ہو جائے گی)

سورۂ بقرہ کے علاوہ بھی آخر قرآن تک مختلف عنوانات سے انفاق پر زور

یہ تو سورۂ بقرہ کے دور کوع سے زائد کے اقتباسات تھے جن سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ رزق و معاش کے معاملہ میں اسلامی و قرآنی تعلیمات کا اصل زور کسب و تحصیل پر نہیں بلکہ انفاق اور اس کی تفصیل پر ہے

اس سورۃ کے علاوہ بھی آخر قرآن تک مختلف عنوانات سے انفاق کی ترغیب وتحسین اور امساک کی تقبیح ومذمت ہی ملتی ہے۔ سورۃ انفال میں پکا اور پورا مسلمان ہونے کے لئے ارشاد ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ه اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ	جو لوگ نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (بس) وہی سچے پکے مسلمان ہیں ان ہی کے لئے اپنے پروردگار کے ہاں بڑے درجے ہیں اور مغفرت ہے اور آخرت کا رزق۔ ....

زکوٰۃ انفاق ہی کی مفروض صورت ہے

معلوم ہوا کہ ایمان واسلام میں رسوخ وپختگی نماز کے بعد جس چیز پر سب سے زیادہ موقوف ہے وہ انفاق ہی ہے اور بھی اکثر جگہ نماز کی فرضیت کے ساتھ ساتھ جس چیز کو عبادت ہی بتا کر فرض کیا گیا ہے وہ انفاق مال ہی کی خاص صورت زکوٰۃ ہے۔

سورۂ مومنون جس کی ابتداء قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے فرما کر خصوصیت سے مسلمانوں کی دینی ودنیوی فلاح وصلاح کی جو شرطیں قرار دی گئی ہیں ان میں بقرہ کی ابتدائی آیات کی طرح تیسری شرط زکوٰۃ ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ه اور کہیں ہے کہ نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو، وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ سورۃ توبہ میں

ہے کہ :-

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (رکوع ۲)

اللہ کی (عبادت گاہوں) مسجدوں کو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا تو ایسوں ہی کے لئے امید (یا اللہ کا وعدہ) ہے کہ راہ یاب ہوں گے

مسلم کی حقیقت کا دوسرا جزء زکوٰۃ

مسلمان یا مسلم جس کے معنی ہیں اللہ کا کامل فرمانبردار، سورۂ حج کے آخر میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ یہی لقب اللہ کے فرمانبرداروں کو نزول قرآن سے پہلے بھی عطا ہوا تھا اور یہی قرآن نے تم کو بھی عطا کیا ہے تاکہ ایک طرف اس کامل اطاعت کے گواہ یا اسوۂ و نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لئے ہوں اور دوسری طرف تم تمام انسانوں کے لئے اس کی شہادت یا مثال و نمونہ بنو،

آگے یہ اسوہ و مثال یا نمونہ بننے کے لئے جن دو بنیادی باتوں کا مطالبہ ہے ان میں ایک وہی نماز کی پابندی اور دوسری زکوٰۃ کی ادائیگی ہے فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ مسلمانوں سے پہلے بھی بنی اسرائیل کے عہد و میثاق کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت و اعانت کا وعدہ جن شرائط کے ساتھ فرمایا ہے ان میں بھی ان دو بنیادی شرطوں کو

مقدم رکھا ہے کہ اگر تم نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے رہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں - وَقَالَ اللّٰهُ إِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ (مائدہ ع ۳)

غرض نماز کی فرضیت جو پورے دین کا ستون ہے اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّيْنِ ۰ اس ستون کے ساتھ ہی جس دوسرے فرض کو قریب قریب ہر جگہ خود قرآن میں فرض ہی قرار دے کر باندھ دیا گیا ہے وہ انفاق کا خاص فریضہ زکوٰۃ ہے

مطلق انفاق کے عجیب تشویقی عنوانات

باقی مطلق انفاق کی تشویق و تحریص کے لئے جیسے جیسے عنوانات اختیار فرمائے گئے ہیں ان میں سے ایک خود خدا کا اپنے لئے قرض مانگنا ہی کیسا عجیب عنوان ہے کہ جس کا سب کچھ وہی الٹے اس سے قرض مانگ رہا ہے جس کا کچھ نہیں اور پھر اس کی ادائیگی میں کیسے کیسے انعامات کا وعدہ فرمایا ہے - اوپر بنی اسرائیل سے ان کا ساتھ دینے یا ان کی نصرت فرمانے کی جو آیات و شرائط ابھی نقل ہوئی ہیں ان ہی میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ :-

وَأَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ط

اگر تم اللہ کو (اخلاص وغیرہ کے اعتبار سے) اچھا قرض دو گے تو میں ضرور ضرور تمہاری برائیوں کو دور کر دوں گا اور یقینی طور پر تم کو ایسے باغوں میں جگہ دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی

اسی طرح سورۃ بقرہ میں ہے کہ

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرًا وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (ع ۳۱)

کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرض اچھا جس کو وہ چند در چند بڑھاتا ہی چلا جاتے اور یہ اللہ ہی تو ہے جو بڑھاتا گھٹاتا ہے اور بالآخر تو (اس کے پاس پلٹ کر تم کو جانا بھی ہے۔

اور بھی درمیان میں اسی عنوان سے انفاق پر ابھارا گیا ہے اور آخر میں اٹھائیسواں پارہ کے سورۂ تغابن کے آخر میں ہے کہ۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

اگر تم اللہ کو اچھا قرض دوگے تو وہ تمہارے لئے اس کو بڑھاتا چلا جائیگا اور (مزید براں اس کی برکت سے) تمہارے دوسرے گناہ بھی معاف فرمائے گا اور (کیوں نہ ہو کہ) اللہ تو بڑا قدر دان ساتھ ہی بردبار (اتنا بڑا ہے کہ) کھلے چھپے سب کا جاننے والا ہے اور (زبردست ہو کہ بھی اگر قرض کے اچھا ہونے میں کچھ بھول چوک ہو گئی تو اس سے) چشم پوشی فرمائیگا (اور یہ سب اس وجہ سے ہے کہ وہ) بڑی حکمت والا بھی ہے (جس کا کوئی کام

حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا،

کیسا لطف و کرم کا عنوان

ذرا اس عنوان کے لطف و کرم کو سوچئے کہ ایک شخص جو اپنی ذات سے بالکل فقیر اور کنگال ہے اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب ایک بہت بڑے بادشاہ بلکہ بادشاہوں کے بادشاہ کا دیا ہوا ہے، قربان جائیے اس بندہ پروری کے کہ پھر بھی بادشاہوں کا بادشاہ خود اپنے بھکاری سے دوسرے بھکاریوں اور بندوں کو یہ کہہ کر دلانا چاہتا ہے کہ میاں اس میں سے کچھ ہم کو بھی قرض دیتے ہو جس کو ہم زیادہ سے زیادہ بڑھا چڑھا کر ادا کر دیں گے۔

سبحان اللہ! کیا شانِ رحمت و حکمت ہے، اور کیسا بدبخت ہے وہ بھکاری بندہ جو ایسے قرضخواہ مولا و آقا کے حکم و ارشاد پر اپنا بھرا ہوا کشکول خوش خوش خالی کر دینے کے بجائے کچھ تھوڑا بہت بھی واپس کرنے سے جی چراتا اور مین میخ نکالتا ہے۔

ایک اور عجیب و غریب عنوان

مطلق انفاق ہی کا سورۂ بقرہ میں یہ اختیار کیا گیا کہ:-

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ	لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟
قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ	(بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ	مال و دولت، وقت، قوت،
وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ	اور دل و دماغ، علم و فہم کی ہر

وَابْنَ السَّبِيْلِ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ٥ (ع ۲٦)

چھوٹی بڑی صلاحیت جو کچھ بھی تم کو دی گئی ہے سب خرچ ہی کرنے کو تو دی گئی ہے ہاں پوچھنے کی بات یہ البتہ ہے کہ کس کام میں خرچ کریں تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود اپنی مسرفانہ عیش و عشرت، زیب و زینت پر نہیں بلکہ) جو کچھ بھی تم خرچ کرو ماں باپ پر، بھائی بندوں پر، یتیموں محتاجوں اور مسافروں پر اور (ایک خرچ کرنے ہی پر کیا موقوف) جو بھی تم نیکی کا کام کرو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

ایک اور زیادہ توجہ طلب انداز

پھر آگے ہی کے رکوع میں اسی سوال کا جواب ایک اور زیادہ توجہ طلب انداز میں ملتا ہے کہ اگر تم دنیا و آخرت کی حقیقت مثلاً ایک کی بے ثباتی اور دوسرے کی ثبات و دوام ہی — پر غور کرو تو تمہارے اس سوال کا کہ کیا صرف کریں اس کے سوا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی اصلی و واجبی ضرورتوں سے جو کچھ بھی بچ رہے .. (العفو) وہ دنیا کے عیش و عشرت نام و نمود کے بجائے آخرت ہی کی ابدی زندگی بنانے پر خرچ کر دیا کرو

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ

مال کی محبت کے باوجود اس کو خدا کی محبت میں خرچ کرنا

اس سے پہلے اسی سورۃ (ع ۲۱) میں جہاں نیکی و نیکوکاری کی باتوں کی کچھ تفصیل فرمائی گئی ہے اس میں بھی خدا و آخرت، ملائکہ و انبیاء پر ایمان لانے کے بعد اعمال صالحہ میں سب سے مقدم ذکر مال کی محبت کے باوجود اس کو خدا کی محبت میں خرچ کرنے ہی کا ہے

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ

لیکن نیکی کی (شان) یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں کتابوں اور نبیوں پر ایمان لاتے اور مال کی محبت کے باوجود اس کو اللہ کی محبت میں اپنے (حاجتمند) رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں دے۔

انفاق کے بغیر نیکی حاصل ہی نہیں ہو سکتی

اور چوتھے پارے کے شروع میں تو انفاق کو نیکی کے حصول کا ایسا لازمہ بنا دیا گیا ہے کہ "تم نیکی کو اس وقت تک (کماحقہ) ہرگز حاصل ہی نہ کر پاؤ گے جبتک کہ اپنی محبوب یا پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ نہ کرتے رہو۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ٥

عدم انفاق یا بخل کی مذمت

اس طرح انفاق کی تاکید وتحریص پر کثرت کے ساتھ اور طرح طرح سے صرف ایجابی طور ہی سے بس نہیں کیا بلکہ جا بجا سلبی طور پر عدم انفاق یا بخل و امساک کی شدت کے ساتھ قباحت و مذمت بھی بیان فرمائی گئی۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط

(عمران ع ۱۷)

ہرگز نہ خیال کریں وہ لوگ جو ایسی چیزوں میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دے رکھی ہیں (اور جس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب اللہ ہی کا دیا ہوا ہے) کہ یہ ان کے حق میں اچھی بات ہے بلکہ یہ ان کے لئے بہت ہی بری بات ہے قیامت کے دن وہی چیزیں ان کی گردن کا طوق بنا دی جائیں گی جن میں انھوں نے بخل سے کام لیا ہے۔

بخل کی بد ترین حد یہ ہے کہ اکثر مسلمان زکوٰۃ تک ادا نہیں کرتے تو اور کیا خرچ کریں گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت میں ان لوگوں کو سانپ کے طوق پہنائے جائیں گے یعنی ان کا مال سانپ بنا کر ان کی گردن کا طوق بنا دیا جائے گا (اعاذنا اللہ منہ)

ذلت کا عذاب

سورۃ نساء میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا

اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ

جو بخل سے کام لیتے ہیں اور دوسروں

النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝

کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں اور (یاد رکھیں) کہ ہم نے ایسے ناشکروں کے لئے ذلت والا عذاب تیار کر رکھا ہے

دنیا ہی میں ذلت

یہ ذلت اور عذاب سچ پوچھیے تو دنیا ہی سے شروع ہو جاتا ہے حبّ زر یا بخل میں آدمی لازماً دن رات ایسی حرکتیں کرتا رہتا ہے جن سے اپنے پرائے سب ہی کی نظروں میں ذلیل ہوتا رہتا ہے، ساتھ ہی بار بار یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام و قرآن کی نگاہ میں انفاق بھی وہی انفاق ہے جو خدا و آخرت کے ایمان پر مبنی خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح کے لئے خرچ کیا جائے نہ کہ لوگوں کو دکھلانے یا نام و نمود کے لئے آج کل جو لوگ بظاہر کچھ نیک کاموں میں دیتے دلاتے ہیں زیادہ تر دکھلاوے یا اسی دنیا کی عزت و شہرت کی خاطر، آگے ہی ایسوں کے حق میں ارشاد ہے کہ اللہ ان کو بھی پسند نہیں فرماتا۔

ریائی انفاق کی حماقت

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطَانُ لَهٗ قَرِيْنًا

جو لوگ اپنے مال و دولت کو لوگوں کے دکھلاوے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور ایمان نہ اللہ پر رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر اور جس کا ساتھی شیطان ہو

(کہ وہی اس طرح کی خدا چھوڑی باتیں سکھلاتا ہے) تو وہ بڑا ہی برا ساتھی ہے"
کہ خرچ کرا کے بھی برباد ہی کرا دیتا ہے اس لئے کہ دنیا اور اس کی عزت و شہرت سب کے دن کی! حالانکہ یہی مال اگر خدا کی خوشنودی اور آخرت کی ابدی زندگی کے لئے خرچ کیا جاتا تو اس کی قدر و قیمت کتنی بڑھ جاتی ہے اسی حماقت و نادانی پر آگے تنبیہ ہے کہ

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝

اگر یہ خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (جو کچھ خرچ کرتے خدا و آخرت ہی کے لئے) خرچ کرتے تو اس میں ان کا بگڑ ہی کیا جاتا درآنحالیکہ اللہ ان سے خوب واقف ہے۔

لہذا اس کے علم و واقفیت کے بعد اس کا احتمال تو ہو ہی نہیں سکتا کہ نیک و بد کسی عمل کے معاملہ میں ذرہ بھر بھی ظلم و زیادتی ہو گی بلکہ اس کی رحمت کا رنگ تو یہ ہے کہ ایک طرف نیکی کا صلہ نہ صرف کئی گنا عطا ہو گا بلکہ خاص اپنے پاس سے مزید اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا (نساء ع ۶)

خود خدا سے بدعہدی و منافقت

بہتوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کوئی کام اٹکتا ہے تو خدا سے دعا بھی مانگتے ہیں نذر و نیاز بھی مانتے ہیں کہ ہمارا یہ کام بن جاتے ہم پر فضل

ہو جائے تو ہم اتنی خیر و خیرات کریں گے، فلاں نیک کام میں خرچ کریں گے لیکن ان چاہا خدا جب اپنے فضل سے پورا کر دیتا ہے تو بخل کرنے لگتے اور اپنے عہد سے پھر جاتے ہیں۔ فَلَمَّآ اٰتٰاهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ پھر خدا کی طرف سے اس منافقانہ عہد شکنی کی یہ سزا ملتی ہے کہ ان کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے نفاق پیدا کر دیتا ہے فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (توبہ ع ۱۰)

انفاق کی اصل غرض بھی معاش نہیں معاد ہے

جدید معاشیات کے مختلف نظریات و تعلیمات کے مقابلہ میں قرآنی و اسلامی معاشیات کی نوعیت آپ نے دیکھا کہ نہ صرف اصلاً و اصولاً معاشیاتِ کسب کے بجائے معاشیاتِ انفاق کی ہے بلکہ اس انفاق سے مراد بھی وہ انفاق ہے کہ جس میں محض دنیا کے معاشی مصالح و مقاصد سے بہت زیادہ دین کی معادی فوز و فلاح مدنظر ہو۔ اوپر جو آیات نقل ہو چکی ہیں ان کے علاوہ اس انفاق کی معاشی نہیں معادی غرض و غایت کو پیش نظر رکھنے کی سورۂ بقرہ ہی میں ایک جگہ کیسے ڈرانے والے انداز میں تعلیم و تاکید ہے کہ:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ	اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی (جس سے وہاں کی ابدی زندگی میں کوئی نفع حاصل

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ٥ کرلو نہ کوئی دوستی وہاں کسی کے کام
(بقرہ ع ۳۴) آنے والی ہوگی اور نہ کوئی سفارش
(کسی کو بچانے والی ہوگی۔ اور کافر یعنی خدا و آخرت کے منکر ہی قدرۃً اس خوفناک دن سے نڈر ہو کر دیگر معاملات کی طرح انفاق کے معاملہ میں بھی اپنے اوپر) ظلم ہی کرتے ہیں۔ کہ خرچ بھی کرتے ہیں مگر آخرت کی نیت نہ ہونے سے وہاں خسارہ ہی میں رہیں گے)

اسلامی و غیر اسلامی معاشیات کا تضاد

دینی اور لادینی معاشیات کے اس بنیادی تخالف و تضاد کی بناء پر اصول ہی میں نہیں بہت سے تفصیلی مسائل و مباحث میں بھی ان دونوں کو ملانے اور جوڑنے کی کوشش اکثر اَنمل اور بے جوڑ چیزوں کو ملانے اور جوڑنے کی بنجاتی ہے جس سے اسلامی معاشیات کی تعلیمات کو صحیح طور پر سمجھانے سے زیادہ ان میں طرح طرح کی غلطیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو اور کردی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ جدید اشتراکی یا سرمایہ دارانہ معاشیات کی تردید اور اس کے مقابلہ میں اسلامی معاشیات کے تفوق و برتری کا اثبات کرتے ہیں ان کی بحثوں اور کتابوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح محض اسی دنیا کے معاشی مسائل و مشکلات کو حل کرنے کے لئے نئے نئے اہل معاشیات نے نئے نئے نظریات پیش کئے ہیں اسی طرح اس دنیا کی معاشی گتھیوں کو سلجھانے ہی کا ان سے بہتر ایک پرانا نظریہ و نظام اسلامی معاشیات کا بھی ہے۔ (وشتان بینھما)

حدیثوں میں بھی اصل زور کسب نہیں انفاق ہی پر ہے۔

اسلام کی کتاب کی طرح اسلام کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کا اصل رُخ بھی کسب کے بجائے انفاق ہی کی تعلیم و ترغیب کی طرف ملتا ہے اور اس انفاق کا بھی اصل مدعا معاشی سے زیادہ معادی بناؤ ہے، حدیث کی کوئی کتاب اٹھالو مال و دولت کمانے کے بجائے خرچ کرنے اور خدا و آخرت ہی کے لئے خرچ کرنے کی تعلیم و ترغیب، طرح طرح کے مؤثر عنوانات سے پاؤ گے۔ سب سے زیادہ پڑھی پڑھائی جانے والی مقبول کتاب مشکوٰۃ شریف ہے اس میں کتاب الزکوٰۃ اور اس کے تحت انفاق و صدقہ کی فضیلت اور بخل و امساک کی مذمت و کراہیت پر جو مستقل ابواب ہیں وہ اصح المطابع کی چھپی ہوئی بڑی تقطیع پر ۱۸ صفحوں سے زائد تک چلے گئے ہیں۔

اور یہ انفاق بھی اصلاً آخرت کے لئے

زکوٰۃ، صدقہ یا انفاق اسلام کی نگاہ میں مال کا ایسا حق ہے کہ جبتک وہ ادا نہ ہو مال، مال نہیں قطعاً وبال اور دنیا سے بڑھ کر عذابِ آخرت ہے، کتاب الزکوٰۃ میں دوسری ہی طویل حدیث صاحب مشکوٰۃ نے جو درج کی ہے اس کا حاصل اسی عذابِ آخرت سے ڈرانا ہے نہ کہ دنیا کی معاشی مشکل کا حل بتانا وہ جو سونے چاندی (یا روپیہ پیسہ) والا آدمی ان کا حق (زکوٰۃ) نہیں ادا کرتا اس کے لئے قیامت کے دن اس سونے چاندی ہی کی آتشیں تختیاں بنائی جائیں گی جن کو جہنم کی آگ میں تپا تپا کر اس کے پہلو، پیشانی اور پیٹھ

کو برابر داغا جائے گا"

در اصل یہ قرآن مجید ہی کی اس آیت کی تفسیر و تشریح ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝	جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک بڑے دردناک عذاب کی خبر سنادو، کہ جس دن یہی سونا چاندی دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھ کو داغا جائے گا کہ لو یہ ہے وہ جو تم نے جمع کر رکھا تھا اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو"

....

یہ تو صحیح مسلم کی تفسیری حدیث تھی۔ بخاری شریف کی ایک اور تفسیری ہی روایت میں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور اس نے زکوٰۃ نہ ادا کی تو قیامت کے دن یہ مال ایک سخت زہریلا اژدھا بنا کر اس کی گردن میں لٹکا دیا جائے گا جو اس کے دونوں کلوں کو ڈس ڈس کر کہے گا کہ میں ہوں تیرا مال تیرا خزانہ، یہ فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی سورۃ آل عمران والی آیت پڑھی جو بخل کی مذمت میں اوپر نقل ہو چکی ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاقِ انفاق

احکام زکوٰۃ سے متعلق بہت سی حدیثیں درج کرنے کے بعد پھر

صاحب مشکوٰۃ نے ایک مستقل باب انفاق کے دینی و دنیوی منافع و برکات اور بخل کی مضرتوں اور خرابیوں کا باندھا ہے اس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق انفاق بخاری شریف ہی کی روایت سے منقول ہے کہ
"اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو تو مجھ کو اس بات سے خوشی ہوگی کہ تین راتیں بھی اس طرح نہ گذریں کہ اس میں سے کچھ بھی باقی رہ جائے بجز اس کے جو قرض ادا کرنے کے لئے بچا لوں"

اسی باب میں بخاری ہی کی ایک اور حدیث ہے کہ" ایک مرتبہ نماز سے فارغ ہو کر آپ اتنی عجلت کے ساتھ گھر میں تشریف لے گئے کہ لوگ ڈر گئے کہ کیا بات ہے واپسی پر لوگوں کو متعجب دیکھ کر فرمایا کہ مجھ کو یاد آیا کہ کچھ سونا میرے پاس ہے اور یہ بات مجھ کو مکروہ معلوم ہوئی کہ اس کی یاد (ایک لمحہ کے لئے بھی) خدا کی یاد میں مخل یا حارج ہو، اس لئے جلدی سے جا کر میں نے حکم دیدیا کہ اس کو تقسیم کر دیا جائے۔

اسی طرح ایک تیسری روایت میں ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور کی بیماری کے زمانہ میں میرے پاس آپ کے چھ سات دینار تھے جن کو خرچ کر دینے کا حکم فرمایا لیکن مجھ کو آپ کے درد کی تکلیف میں اس کا موقع نہ مل سکا پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ وہ دینار کیا کئے؟ میں نے عرض کیا کہ بخدا آپ کے درد کی وجہ سے ان کا خرچ کرنا یاد نہیں رہا آپ نے ان کو فوراً ہی منگوایا اور ہاتھ میں رکھ کر فرمایا کہ کیا گمان ہوگا خدا کے رسول کا خدا کے بارے میں، اگر وہ اس حال میں خدا سے ملے کہ یہ دینار اس کی ملک میں ہوں۔ یعنی نبوت کی شان و مذاق کے منافی ہوگا۔ کہ نبی ہو کر اور خدا پہ کامل توکل رکھ کر مال کو دل میں اتنی جگہ دے کر کہ فکر فردا کیلئے اس کو پس انداز کرے (واللہ اعلم)

مذاقِ نبوت والے صحابہ کو بھی یہی تعلیم

پھر جن حضرات صحابہ میں اس مذاقِ نبوت کا رنگ تھا ان کے لئے بھی یہی پسند فرماتے تھے روایتِ بالا ہی کے آگے ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدسؐ حضرت بلال رضؓ کے پاس تشریف لے گئے تو دیکھا کہ خشک کھجوروں کا ان کے ہاں ڈھیر لگا ہے آپؐ نے پوچھا بلال یہ کیا ہے عرض کیا کہ آئندہ کے لئے میں نے جمع کر رکھا ہے فرمایا کیا تم کو ڈر نہیں لگتا کہ قیامت کے دن اس کی وجہ سے تم پر جہنم کی آگ کا کچھ اثر ہو جاتے۔ بلال خرچ کرو اور عرش والے کی طرف سے کمی کا اندیشہ نہ کرو" مطلب وہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر پورے بھروسہ یا کمالِ توکل کے شایانِ شان نہیں کہ آدمی روزی یا معاش کے معاملہ میں اپنے دل کو کل کی فکر میں الجھائے۔

زائد از ضرورت (فضل) کا انفاق

عرش والے پر کامل توکل و اعتماد کا نصب العین تو نبوت کا ہی اسوہ ہے اور بطور نصب العین (آئیڈیل) سامنے رکھنا اسی کو چاہیئے تب جا کر وہ انفاقی ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے جو کتاب و سنت میں مطلوب ہے اور آدمی اپنی وسعت و ہمت کے موافق اسلامی انفاق کے حقوق ادا کر سکتا ہے یعنی اپنے اور اپنے اہل و عیال کی واقعی ضروریات و نفقات (نہ کہ فضولیات) کے انتظام و اطمینان سے جو کچھ زائد ہو وہ اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کر سکتا ہے اسی باب کی پانچویں حدیث میں ابو امامہ رضؓ سے مروی ہے کہ "اے ابن آدم فضل (یعنی زائد از

ضرورت) کا خرچ کر دینا ہی تیرے حق میں بھلا ہے اور اس کا روکنا یا جمع رکھنا برا ہے۔ البتہ بقدرِ کفایت (یعنی کہ جتنا ضروریات واجبہ کے لئے کافی ہو) کے روکنے یا جمع رکھنے پر ملامت نہیں، اور اس زائد کے خرچ کرنے میں بھی اہل وعیال کو مقدم رکھو، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کچھ رزق بسط وفراخی عطا فرمائیں تو کھانے پینے رہنے سہنے وغیرہ کی حاجتوں میں جائز حد تک پہلے اہل وعیال ہی کے حق میں وسعت ورعایت سے کام لینا چاہیئے کہ وہ براہ راست ہماری کفالت میں ہیں، اس لئے جب نفقات واجبہ سے زیادہ کی گنجائش ہو تو توسط واعتدال کے ساتھ مزید راحت وآرام کا انتظام بھی اہل وعیال ہی کا مقدم حق ہے اس کے بعد دوسروں کی خدمت اور ان پر انفاق میں بخل وامساک یا تنگدلی سے کام لینا برا اور قابل ملامت ہے

شیطان کی راہ زنی

جب ہماری نہ صرف واجبی ضرورت پوری ہو رہی ہو بلکہ اپنے اور متعلقین کی جائز راحت کا بھی انتظام ہو اس کے بعد بھی خدا کی راہ میں انفاق پر اگر ہم خست اور تنگدلی سے کام لیں یا اس ڈر سے ہم خرچ نہ کریں کہ آگے چل کر ہم یا ہماری اولاد تنگ دست اور فقیر نہ ہو جائے تو یہ فقر وفاقہ کا بعینہ وہی احتمال ہے جس سے شیطان ہماری راہ مارنے کے لئے ڈراتا ہے اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ حالانکہ اللہ اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کو اور زیادہ دینے کا وعدہ کرتا ہے وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ط

ابن آدم تو خرچ کر تجھ پر خرچ کیا جائے گا۔

مشکوٰۃ کے اسی باب میں اسی کو ایک حدیث قدسی میں اس عنوان سے

فرمایا گیا ہے کہ "اے ابن آدم تو خرچ کر تو تجھ پر خرچ کیا جائیگا" یعنی جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ و رضا میں خرچ کروگے اس کے تلف و ضائع ہونے کا اندیشہ نہ کرو اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ دوسروں سے تم پر خرچ کرایا تم کو دلا دیں گے، مثلاً ملازمت میں ترقی دلا دی، زراعت میں پیداوار بڑھا دی، تجارت میں نفع زیادہ ہوگیا۔ اسلام کی انفاقی معاشیات کی رو سے تلف و تنگی کا خوف و اندیشہ خرچ کرنے والوں کو نہیں بخل کرنے والوں کو کرنا چاہیئے۔ آگے ہی ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں ایک دعا کرتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے کہ اے اللہ بخل کرنے والے کا مال تلف و ہلاک فرمادے، ظاہر ہے کہ یہ آخرت کے نہیں اسی دنیا کے بدل و تلف کا معاملہ ہے۔ پھر اگلی ہی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خرچ کرو اور (زیادہ) حساب کتاب نہ لگایا کرو کہ خدا بھی تم کو دینے میں (یرزق من یشاء بغیر حساب) کے بجائے حساب و کتاب (یعنی تنگی) کا معاملہ نہ فرمانے لگے۔ اور بس اندازہ یا جمع کرنے کے (زیادہ) پھیر میں نہ پڑو کہ خدا بھی اپنا ہاتھ روک لے اکہ اب تو میری رزاقیت کے بجائے تمام تر اپنی جمع پونجی پر تم کو بھروسہ ہے بلکہ) اپنی وسعت و گنجائش بھر جو کچھ کم سے کم بھی (نیک راہ میں) دے سکتے ہو دیتے ضرور رہو۔

حقیر سے حقیر انفاق بھی انفاق ہی ہے

مطلب وہی ہے کہ ہاتھ کھلا رہے تھوڑا بہت جو کچھ بن پڑے آدمی دیتا اور خرچ بہر حال کرتا رہے تاکہ دینے یا انفاق کی ذہنیت و عادت قائم رہے، اسی عادت و ذہنیت کے بقا اور تربیت کیلئے عورتوں کو خصوصاً خطاب کرکے

فرمایا (جو عموماً تنگ نظر ہوتی ہیں) کہ :۔ کوئی عورت اپنی پڑوسن کو اگر بکری کا ایک کھر بھی دے سکتی ہو تو اس دینے کو بھی حقیر نہ جانے ، حتیٰ کہ دوسری روایت میں ہے کہ ، یہ کھر بھی خواہ جلا ہوا ہی کیوں نہ ہو ، مگر دے ضرور۔ شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ مقصود اس سے مبالغہ ہے یعنی وہی کہ کچھ نہ کچھ دیتے رہنے کی عادت پڑی رہے خواہ بظاہر حقیر سے حقیر چیز کیوں نہ ہو جیسا کہ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ بَعَدْلِ تَمْرًا کہ خواہ یہ چیز اپنی مقدار یا قیمت میں ایک کھجور ہی کے برابر ہو۔ البتہ پاک کمائی ہونا شرط ہے (مِنْ کَسْبٍ طَیِّبٍ) کیونکہ اللہ پاک قبول پاک ہی چیز کو فرماتا ہے پھر یہ پاک چیز کتنی ہی حقیر و قلیل ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی شان پرورش یا ربوبیت سے کھجور برابر چیز کی بھی پرورش فرما کر اس کو اتنا بڑھا دیتا ہے کہ دینی و دنیوی برکات کے لحاظ سے وہ پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے ۔

انفاق لازمۂ اسلام ہے

اسلام کی انفاقی تعلیم میں اس مبالغہ کا مدعا ہر پھر کر یہی نکلتا ہے کہ دوسروں سے لینے کے بجائے نظر تھوڑا بہت جو ہو سکے دیتے اور لٹانے پر ہی رہنی چاہیئے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے بہتر یا افضل صدقہ کون ہے؟ فرمایا غریب آدمی اپنی محنت و مشقت سے پیدا کر کے کسی کو جو کچھ دیدے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب شوربا پکاؤ اور گنجائش نہ ہو تو پانی ہی زیادہ کر دو اور اپنے ہمسایوں کا خیال کرو کہ ان کو بھی پہنچ جائے غرض کچھ نہ کچھ دینے یا خرچ کرتے رہنا مسلمان ہونے کا لازمہ ہونا چاہیئے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ عَلٰی مُسْلِمٍ صَدَقَۃٌ یعنی ہر مسلمان پر کچھ نہ کچھ صدقہ دینا لازم ہے لوگوں نے عرض کیا کہ اگر کسی کے پاس سرے سے کچھ

کچھ نہ ہو، فرمایا اپنے ہاتھ سے کچھ کام کرے اور جو ملے خود بھی اس سے متمتع ہو اور صدقہ بھی کرے، عرض کیا کہ اگر کام کرنے سے لاچار ہو فرمایا کسی اور طریقہ ہی سے کسی مصیبت زدہ حاجتمند کی مدد کرے۔ عرض کیا اگر یہ بھی نہ ہو سکے فرمایا کسی بھلی بات کا امر کرے عرض کیا یہ بھی نہ کر سکے فرمایا کم از کم بری بات سے بچا تے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہی ہوگا"۔ چونکہ مالی انفاق یا صدقہ کا مقصد حاجتمندوں کی حاجت روائی یا نفع رسانی ہی ہے اس لئے کسی برائی سے کسی کو بچانا بھی یقیناً نفع رسانی اور صدقہ ہی ہے جیسے کسی کو سانپ کے کاٹنے سے بچالیا جاوے تو اس سے بڑھ کر اس کی کیا مدد ہوگی؟

عیال و اقربا پر خرچ کرنا بھی خیر و صدقہ ہے

نیت اگر صحیح ہو یعنی انفاق کی اصلی غرض خدا کی رضا جوئی اور اس کے حکموں کی فرماں برداری تو غیروں پر کیا خود اپنے اہل و عیال، اعزہ و اقرباء پر خرچ کرنا بھی اسلام کی نگاہ میں خیر و صدقہ ہی ہے بلکہ ایک اعتبار سے زیادہ اجر و ثواب کا کام کہ صلہ رحمی کا حق بھی ساتھ ساتھ ادا ہوتا ہے خود حضورؐ ہی کا ارشاد ہے کہ غریب و مسکین کو دینا تو صرف صدقہ اور قرابت والوں کو دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحم بھی۔ صحاح کی متفقہ روایت ہے کہ جو مسلمان اپنے گھر والوں کے نفقہ میں بھی ثواب کی نیت (یعنی خدا کے حکم و اطاعت کی اور آخرت کے اجر کی) کر لے تو ادائے واجب کے علاوہ صدقہ کا اجر مفت میں ملے گا۔ اذا انفق المسلم علیٰ اھلہ کانت لہ صدقۃ۔ اس کے بعد ہی اس سے بڑھ کر صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ خدا کی راہ یا جہاد میں خرچ کرنے غلام کو آزاد کرنے میں خرچ کرنے، کسی مسکین کو صدقہ دینے ان سب کے مقابلہ

میں گھر کے لوگوں پر خرچ کرنے کو زیادہ موجب اجر قرار دیا گیا ہے

اَعْظَمُهَا اَجْرًا اَلَّذِیْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ

خود اپنے اوپر انفاق بھی خیر ہی ہے

گھر والوں اور قرابت والوں سے مقدم ایک حدیث میں خود اپنے اوپر خرچ کو رکھا ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ میرے پاس ایک دینار ہے فرمایا خود اپنے اوپر خرچ کرو عرض کیا ایک اور ہے فرمایا گھر والوں پر خرچ کرو عرض کیا ایک اور ہے فرمایا اب تم زیادہ جانتے ہو" کہ ان کے بعد تمہارے نزدیک کون زیادہ مستحق ہے

بلا ارادہ خرچ ہو جانا بھی صدقہ ہے واسطۂ انفاق ہونا بھی صدقہ ہے

انتہاء اس ترغیب انفاق کی یہ ہے کہ بلا ہمارے ارادہ و نیت کے بھی اگر ہماری ملک سے کچھ خرچ ہو جائے اور دوسرے کا بھلا ہو جائے تو وہ بھی صدقہ ہو جاتا ہے متفق علیہ حدیث ہے کہ کسی مسلمان کے درخت یا کھیت سے اگر کوئی شخص یا کوئی جانور کچھ کھالے تو وہ بھی صدقہ ہے، مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ جو کچھ چوری ہو جائے وہ بھی صدقہ ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک چیز سرے سے ہماری ملک میں نہیں اس کے خرچ کرنے یا دینے دلانے میں ہم کسی طرح واسطہ بن گئے تو اسلام اس کو بھی صدقہ یا اجر و ثواب ہی کا کام ٹھہراتا ہے مثلاً کوئی بیوی گھر کے کھانے پینے میں سے (جس کا اصل مالک شوہر ہے) کسی کو کچھ کھلا یا پلا یا دیدیا یا جو شخص کسی دوسرے کے مال کا خزانچی یا امین ہے اور مالک کے حکم و اجازت کے مطابق لوگوں کو دیتا ہے تو ان سب کو اس انفاق

کا ثواب ملیگا اور اتنا ہی ملے گا جتنا خود اصل مالک کو اور کسی کے اجر میں ذرہ برابر بھی کوئی کمی نہ ہوگی کہ ایک حصہ سے کچھ کم یا کاٹ کر کے دوسرے کو دیا جائے سبحان اللہ! کیا شانِ کرم ہے!

خرچ کرنا ہی جمع کرنا ہے

مگر اسلام کی یہ معاشی انفاقیت یا بے دریغ خرچ کرنے کی ذہنیت جب ہی پیدا ہو سکتی ہے جبکہ خدا و آخرت پر ایمانی نظر ہو، کیونکہ اس نظر والوں کی نظر میں خرچ کرنا ہی جمع کرنا ہے، دینا، دینا نہیں لینا ہے، یا انفاق عین ابقا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم (اہل بیت) نے ایک بکری ذبح کی حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تقسیم کرنے کے بعد باقی کیا بچا؟ عرض کیا کہ ایک دست باقی رہی ہے فرمایا کہ وہی باقی نہیں (فانی) ہے اور (در اصل) باقی وہ ہے جو لوگوں کو دیدیا۔ جب تک باقی وفانی کی یہ ایمانی نظر پیدا نہ ہو کون ہے جو خود اپنی خواہشوں کو بیچ کر دوسروں کو اس طرح بانٹتا پھرے جس طرح کہ حضرت ابو ذرؓ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے میں حاضر ہوا تو دیکھتے ہی فرمانے لگے کہ وہی ہیں سب سے گھاٹے میں رب کعبہ کی قسم، میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ قربان ہوں آپ پر، کون ہیں وہ؟ (جن کو آپ سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہنے والا یا زیاں کار فرما رہے ہیں) فرمایا وہ جن کے پاس مال زیادہ ہے، پھر آپؐ نے فرمایا کہ مال داروں کے لئے اس گھاٹے اور خسارہ سے بچنے کی صورت ایک ہی ہے کہ اپنے مال کو خیر کے ہر موقع پر ہر وقت ہر طرف برابر خرچ ہی کرتے رہیں، جس کو آپ نے بار بار فرمایا کہ "اس طرح اور اس طرح" پھر خود ہی اس کی تشریح فرمائی کہ آگے سے پیچھے سے، داہنے سے، بائیں سے، یعنی چاروں طرف

خرچ ہی خرچ کرنے پر تلا رہتا ہو۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ لیکن ایسے خرچ کرنے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں وَ قَلِیْلٌ مَّا ھُمْ جس کا مطلب یہی کہ مال و دولت زیادہ تر زیاں و خسران ہی کا سامان ہو جاتا ہے۔

انفاق کی بجائے امساکی ذہنیت فساد و ہلاکت کا سبب ہے

غرض جس پہلو سے دیکھو کتاب و سنت کی معاشیت کا اصل زور انفاقیت یا خدا و آخرت کے ایمان پر مبنی ایسا ذہنی رجحان پیدا کرنے پر ہے کہ انسان لینے سے زیادہ دینے، کسب سے زیادہ انفاق یا ہر وقت ہر طرف اپنی بساط بھر خرچ ہی خرچ کرنے کی فکر میں زیادہ لگا رہے اور ہاتھ کو روکنے یا نفس میں بخل و امساک کا میلان خرچ کے مواقع پر نہ پیدا ہونے پائے نفس کے اس امساکی میلان ہی کو قرآن مجید میں "شحّ نفس" سے تعبیر فرمایا گیا اور دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی کے لئے اس سے بچنا ضروری قرار دیا گیا ہے سورۂ تغابن میں ہے کہ فلاح پانے والے وہی لوگ ہوں گے جن کا نفس "شحّ" (بخل، و حرص) سے بچایا گیا وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ اور فساد کا بڑا سرچشمہ یہ "شح نفس" ہی ہے جس کے مفہوم میں بخل اور حرص دونوں[1] داخل ہیں۔ بلکہ لازم و ملزوم ہیں کیونکہ اس کی بدولت دوسروں کو دینا تو الگ رہا آدمی دوسروں سے چھیننے نوچ کھسوٹ یا استحصال و انتفاع ہی کی فکر میں دن رات لگا رہتا ہے حتیٰ کہ حدیث میں تو اس "شحّ نفس" کو اگلی امتوں کی تباہی و خونریزی کا بڑا سبب بتایا گیا ہے صحیح مسلم کی

---

[1] مفردات راغب میں ہے الشح بخل مع حرص۔ اور مشکوٰۃ کے مشہور شارح اور مسلّم محدث حضرت شیخ عبدالحق دہلوی ؒ نے شُحّ کا ترجمہ "شدت بخل و حرص" سے فرمایا ہے۔

روایت ہے کہ شدت بخل وحرص کے اس مجموعہ "شح" سے بچو کیونکہ اس نے تم سے پہلوں کو ہلاک وبرباد کر دیا، خونریزی پر ان کو آمادہ کیا اور حرام کو انہوں نے حلال کر لیا۔

بمبئی کا تازہ واقعہ

ان سطروں تک پہنچ کر قلم سے کھنے پر اخبار جو اٹھایا تو بڑی موٹی اس سرخی پر نظر پڑی کہ :-

بمبئی کے لکھ پتی تاجر اور اس کے جواں بیٹے کا قتل " مقتول لکھ پتی کا نام محمد علیلی اور قاتل کا نام نور محمد ہے "

" دونوں بڑے تاجر تھے، پرانے دوستانہ تعلقات تھے، علیلی نے نور محمد سے چھ ہزار روپیہ لیا تھا جس کے ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا تھا اس پر دونوں میں تلخ کلامی تک نوبت آچکی تھی۔ کل ۱۳ مئی ۱۹۵۳ء، رات نور محمد تنہا علیلی کی دوکان پر آگیا اور سلام کے بعد اچانک جیب سے چاقو نکال کر وار کر دیا۔ علیلی کا لڑکا باپ کی مدد کو دوڑا تو نور محمد نے دوسرا وار علیلی کی کنپٹی پر کیا جس سے شریانوں کا خون تیزی سے بہنا شروع ہو گیا۔

اسی پر بس نہ کر کے ایک اور وار لڑکے کی گردن پر بھی کیا اور دونوں وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔

سوچنے کی بات ہے کہ مقتول "لکھ پتی تاجر" یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ چھ ہزار کا وہ کسی طرح بندوبست ہی نہ کر سکتا تھا اسی طرح قاتل بھی بڑا تاجر تھا فاقہ کش نہ تھا کہ مضطر ہو کر مارنے مرنے پر اتر آیا۔ مگر وہی کہ دینے کے بجائے لینے یا انفاق کے بجائے کسب کی اندھا دھند ذہنیت یا بخل وحرص کی شدت جس پر نہ تو

"پرانے دوستانہ تعلقات" غالب آسکے اور نہ تاجرانہ اسلام" نہ دنیا ہی کا کوئی اور خوف وخیال۔ اس "بخل وحرص" سے بچانے والی فقط ایک ہی شے ہو سکتی تھی خدا و آخرت پر ایمان پر مبنی انفاقی ذہنیت اور اس کی اسلامی تربیت۔
لیکن اس ذہنیت وتربیت کو "تاجرانہ اسلامیت والے عوام میں ڈھونڈھنا ہی عبث ہے جبکہ امت کے ان خواص، علماء و مشائخ تک میں کمیاب ہے جن کے سپرد یہ ذہنیت پیدا کرنا اور اسلامی تربیت دینا کیا گیا تھا۔
حال ہی میں ایک ثقہ صاحب علم دوست نے ایک بڑی مشہور دینی جماعت کے خادموں کے ایک ذی علم اونچے خادم کا عجیب عبرتناک تازہ بالکل اپنے ذاتی علم کا واقعہ سنایا کہ انہوں نے اپنے ایک معتقد تاجر سے ۱۲ / ۱۳ ہزار مختلف عنوانات سے قرض لے کر بالآخر انکار کر دیا اور وہ تاجر اس صدمہ سے بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ تفصیلات ناگفتہ بہ ہیں۔
اوپر تاجر باپ بیٹے کے قتل کا واقعہ ابھی جس اخبار سے آپ کو سنایا گیا اسی سے اور بمبئی ہی کا اسی "کسبی ذہنیت" کا دوسرا واقعہ جان کے بجائے آبرو پر وار کا سن لیں۔ کہ ایک خوبصورت ۲۰ سالہ خاتون سکینہ بائی کو اس کے شوہر اور نند نے اس کے سر کے بال کاٹ کر برہنہ گھر سے باہر نکال دیا"، کیوں؟ اس لئے کہ شوہر اور نند کی کوشش تھی کہ سکینہ عصمت فروشی کے کاروبار پر راضی ہو جائے مگر وہ نہ ہوئی" دیکھا آپ نے خود شوہر کی کسبی ذہنیت کا انجام۔
یہ تو اس ذہنیت کے انفرادی کارنامے تھے جو اخباروں کے صفحات کے علاوہ آپ کے ذاتی تجربات میں بھی کم یاب نہ ہوں گے۔ لیکن اجتماعی یا قومی اور بین الاقوامی شور وشر فتنہ وفساد جو آج ساری دنیا میں برپا ہے اس کی تہ میں کیا سطح ہی پر یہی ذہنیت کارفرما نہیں؟ کہ ہر جماعت وطبقہ اور

ہر قوم و ملک مادی منافع اور دنیوی برتری کی دوڑ میں دوسرے کے سر پر پاؤں رکھ کر آگے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے خصوصاً جب سے سیاست نے معیشت سے اپنا گٹھ جوڑ کر لیا ہے اس وقت سے تو اور بھی ہر حکومت کی داخلی و خارجی سیاست نے پیٹ ہی پیٹ کو اپنا کامیاب نعرۂ جنگ بنا لیا ہے بالکل ڈاکوؤں کی طرح مختلف حکومتیں بھی ڈاکہ ڈالنے ہی کے لئے اپنے جتھے کو بڑھانے اور مضبوط کرنے کی فکر میں لگی ہیں اور گرم سے پہلے ساری دنیا سرد جنگ سے کانپ رہی ہے۔ حاصل وہی کہ افراد و اقوام سب پر نیچے سے اوپر تک داہنے بائیں، آگے پیچھے ہر طرف سے مالی و مادی منافع و فوائد میں ترقی یعنی کسب کا بھوت سوار ہے، اس سرتاسر کسبی یا انتفاعی معاشیات کو اسلام کی اس انفاقی معاشیات سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے، جس کے رسول ؐ کی زبان سے ابھی سنا جا چکا کہ سب سے خسروزیاں کار وہ ہیں جو مالدار زیادہ ہیں اور اس خسران سے بچنے کی تدبیر ایک ہی ہے کہ آدمی داہنے بائیں، آگے پیچھے ہر طرف سے اور ہر موقع پر خرچ ہی خرچ کرتا رہے

کسب کی بجائے عدم کسب کی تعلیم

اس اسلامی انفاقیت اور آج کل کی استحصالی یا انتفاعی کسبیت میں اگر کوئی تعلق ہے تو نفی و اثبات بلکہ کفر و ایمان کے ضدین کا۔ جس طرح کفر کی دعوت تمامتر اسی دنیا کے معاش و علیش کے معیار کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنا ہے اسی طرح ایمان کی دعوت دنیا کی زندگی یا علیش کے حقیقی معنی میں زندگی ہونے ہی کی نفی ہے۔ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ ط اور اس کا لازمی نتیجہ کسب معاش کے مسئلہ میں نفس کسب کی ترغیب و تحریص کے بجائے اسلام میں

کی تحدید یا عدم کسب کی تعلیم دیتا ہے یعنی کسب کے ایسے ذرائع سے روکتا یا ان کو حرام و ممنوع ٹھہراتا ہے جو ممکن ہے کہ بظاہر اس دنیا کے معاشی معیار کو بلند کرتے ہوں لیکن معادی معیار کو پست بلکہ برباد کرنے والے ہی ہوتے ہیں۔

اسلام اور رسولِ اسلام کی کتاب و سنت میں کہنا چاہئے کہ ایک آیت و حدیث ایسی نہیں ملتی جس کو بالکلیہ کسب من حیث کسب کا امر و تعلیم کہا جا سکے جو آیات بھی کسب سے ملتی ہیں سب کا تعلق کسب و اکل کے سلبی و منفی اوامر و احکام یا نواہی و ممنوعات سے ہے یعنی کسب کی فلاں فلاں صورتیں یا کھانے پینے کی فلاں فلاں چیزیں باطل و ممنوع یا حرام و ناجائز ہیں۔ راز وہی ہے کہ نفس اکل و کسب کا میلان انسان کے حیوانی جز میں حکیمانہ قدرت نے قدرۃً ہی اتنا حرص کے درجہ تک بھر دیا ہے کہ ضرورت اب اس کو تیز کرنے کی قطعاً نہیں بلکہ قابو و اعتدال میں لانے کی ہے

اسلام کے عدمی کسب یا حرام کی سب سے شدید صورت سود ہے

کسب کی ان عدمی و منفی یا حرام صورتوں میں خود قرآن نے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ جس صورت کو حرام ٹھہرایا ہے وہ سود یا بیاج اور ربا کی ہے جس کے بغیر کہا جاتا ہے کہ جدید تمدن و تجارت یا معاش و معیشت کی گاڑی کسی طرح چل ہی نہیں سکتی اور گو علمی طور پر اب معاشیاتِ جدیدہ کے بھی بہت سے ماہر و اکابر سود کے مفاسد کو محسوس اور ان کا اعتراف کرنے لگے ہیں تاہم عملاً وہ معاشرہ کے رگ و پے میں اسی طرح سرایت کئے ہوئے ہے جس طرح کہ رسول علیہ السلام نے پیشین گوئی فرما دی تھی کہ ایک زمانہ آیسا آئے گا کہ جو سود سے بچنا چاہے گا اس کو بھی اس کا دھواں پہنچ کر رہیگا (او کما قال ؐ)

اوپر سورۃ بقرہ کے مسلسل دور کوع سے زائد کی اتفاقی آیات وترغیبات کے معًا بعد سب سے پہلا قدغن کسب کی اس سب سے خبیث صورت سود پر لگایا گیا ہے اور کیسی تہدید کے ساتھ اور تہدید بھی پہلے ہی قدم پر دنیا نہیں آخرت کے حق میں کہ :-

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔

جو سود کھاتے ہیں وہ (قیامت کے دن) نہ اٹھیں گے مگر ایسے شخص کی طرح جس کو شیطان نے لگ کر خبطی (حواس باختہ) کردیا ہو یہ سزا ان کو (سود خواری کی حریصانہ منطق کی بدولت) یہ کہنے کی ملیگی کہ بیع (یا تجارت) بھی تو سود ہی جیسا معاملہ ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا ہے"

اگرچہ سود خواروں کا یہ انجام دراصل آخرت میں ہوگا لیکن وہاں کا ہر حال حقیقت میں یہیں کے اعمال کا آئینہ یا تجسیم وتمثیل ہوگا اسی کو مولانا دریا بادی سلمہ اپنی تفسیر ماجدی میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"اصل منظر تو یہ قیامت کے دن کا ہے کہ اپنی قبروں سے اٹھنے پر یہ سود خوار سیدھے نہ کھڑے ہو سکیں گے کھڑے ہوں گے بھی تو متوالوں، خبطیوں، دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے لڑکھڑاتے ہوئے لیکن اس کا ایک ہلکا سا رنگ اس دنیا میں بھی نظر آجاتا ہے مہاجن ساہوکار جو روپیہ کے پیچھے دیوانہ یا باؤلا رہتا ہے واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جن یا بھوت لپٹ گیا ہے....

اہل کشف اور محققین کا بیان ہے کہ قیامت میں انسان اسی صورت کے ساتھ اٹھے گا جس قسم کی سیرت وخصلت (یا ذہنیت) دنیا میں اس پر غالب رہتی ہے۔ کما قال العارف الرومی ؂

سیرتے کو بر شہادت غالب است ہم براں تصویر حشرت واجب است

مہاجن اور ساہوکار غریب تو اب پیچھے پڑ گئے، عہد حاضر کا سارا معاشی شور وغوغا خصوصیت سے اشتراکیت نے ظہور کے بعد سے "کیا" یہ شیطانی خبط، باولے کتوں کی حرکات یا ہوشیار کتوں کی ہڈیوں پر دیوانہ وار گھار کے کے سوا کچھ اور ہے!۔ آگے اس شیطانی تسلط والی معاشیات کی حرمت میں جیسی شدت اسلام کی کتاب خود قرآن کریم میں اختیار فرمائی گئی ہے اس کا اندازہ اس سے کرو کہ حکم حرمت کے بعد پھر سود کا لوٹ کر نام لینے والوں کی سزا وہی مقرر کی گئی ہے جو کفار کی ہے۔ دائمی جہنم

وَمَنْ عَادَ فَأُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اور حرام صرف آئندہ ہی کے لئے نہیں کیا گیا بلکہ حرمت سے پہلے کے سودی معاملات کا بقایا سود لینے سے بھی کیسی تیز دھمکی کے ساتھ روکا گیا کہ "اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو اللہ ورسول کی طرف سے اس کو اپنے حق میں اعلان جنگ جانو"،

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

اسلامی معاشیات میں انفاق ہی عین کسب ہے

آگے اسی سلسلہ میں پھر انفاقیت ہی پر یہ انتہائی زور ہے کہ سود کا بقایا وصول کرنا تو خدا ورسول سے جنگ مول لینا ہے ہی۔ اصل قرض کے ادا کرنے میں بھی اگر قرضدار کو دشواری وتنگی دیکھو تو یہی نہیں کہ آسانی ہونے تک

اس کو مہلت دو بلکہ سرے سے اصل بھی اگر معاف کر دو تو یہ تمہارے حق میں اور بھی بہتر ہوگا۔ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اور اس بہتری سے مراد اصل میں وہی آخرت کی بہتری ہے کہ آخرت پر ایمان رکھنے والوں کی نظر میں اصلی کسب یا کمائی وہی ہے جو وہاں کام آئے اس کے ساتھ ہی یہ ارشاد ہے کہ اس دن سے ڈرو جبکہ پلٹ کر اللہ کے پاس جانا ہوگا جہاں ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر رتی بھر ظلم نہ ہوگا۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

قرآن مجید یا اسلام جس کسب کی تعلیم وتاکید کے لئے آیا وہ بس یہی کسب ہے جو آخرت میں یا اس دن کام آئے جو یہاں سے چار و ناچار لوٹ کر اپنے خالق و مالک کے حضور میں پیشی کا ہوگا اس لئے اسلامی معاشیات کی رو سے انفاق ہی عین کسب یا خرچ کرنا ہی کمانا ہے۔

اسلام سود کے نام ونشان تک کو جس طرح مٹا دینا چاہتا ہے اس کا اندازہ بخاری شریف کی اس مشہور روایت سے کرو کہ سود لینے والوں ہی پر نہیں سود دینے والوں، سودی معاملہ کے لکھنے والوں، اس کی گواہی دینے والوں سب پر یکساں لعنت فرمائی گئی ہے اور سب کو یکساں مجرم ٹھہرایا گیا ہے، یہ تو کسب کے بجائے کسب کی خبیث ترین صورت کی ممانعت یا کسب کی عدمی و سلبی تعلیم تھی اور بھی جہاں تک کسب معاش کا تعلق ہے قرآن میں نفس کسب کے بجائے عدم کسب یا کسب کی سلبی و منفی تعلیمات ہی جا بجا زیادہ ملتی ہیں یعنی کسب یا اکل کی حرمت و تحدید کی مختلف صورتیں۔

ﷺ ﷺ ﷺ

عدمی کسب کے دوگونہ احکام

کسب کی اس نفی و تحدید کے کلی و اصولی احکام دو طرح کے ہیں ایک طرف کسب کی بہت سی صورتوں کو سرے سے حرام و باطل یا ناجائز و ناحق قرار دیدیا گیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق و ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ دوسری طرف اسی کسب یا اکل کو پاک و پاکیزہ یا طیبات کی خاص خاص شرائط و قیود کے ساتھ مشروط و مقید کر کے محدود کردیا گیا ہے کہ ہماری عطا کی ہوئی رزقی چیزوں میں سے صرف پاک چیزوں کو کھاؤ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ آگے چند ناپاک یا حرام چیزوں کو خصوصیت کے ساتھ گنا بھی دیا گیا کہ مردار کو، خون کو، سور کے گوشت کو، اور جس کو غیر اللہ کے نام پر نامزد کیا گیا ہو ان سب کو اللہ نے تمہارے لیئے حرام کردیا ہے۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ط (بقرہ ع ۲۱) مطلب یہی ہوا کہ اسلام اکل و کسب یا مال و دولت کے حصول و پیدائش میں من مانی راہوں کی آزادی قطعاً نہیں دیتا کہ جس کا جو کچھ اور جس طرح جی چاہے کھائے کمائے بلکہ اس نے کھانے کمانے کی بہتیری چیزوں اور طریقوں کو حرام و ممنوع ٹھہرا کر ایسی چیزوں اور صورتوں کو جائز رکھا یا حلال و طیب قرار دیا ہے جن میں انسان کی معاشی سے زیادہ اور بہت زیادہ معادی خیر و فلاح مد نظر ہے

حدیث و فقہ میں

کسب و اکل کے جو ابواب و احکام ہیں اور جو دراصل قرآن ہی کے اصول

وکلیات کی تفصیلات واستنباطات ہیں ان میں بھی نفس کسب کی ترغیب وتعلیم کے بجائے یا تو مال ومعاش کے کسب وطلب کو حلال وطیب صورتوں کے اندر محدود کردیا گیا ہے یا اس سے بھی زیادہ حرام راہوں کی نفی ونہی پر زور دیا گیا ہے حدیث کی کوئی کتاب اٹھالو تو کسب مال یا پیدائش دولت کا جو سب سے بڑا ذریعہ بیع وشراء یا تجارت ہے اس کے بارے میں کتاب البیوع میں کثرت سے روایات نہی وممانعت کی ملیں گی۔ سب سے زیادہ پڑھا پڑھایا جانے والا مقبول ومشہور مجموعہ احادیث کا مشکوٰۃ ہے۔ اس میں کتاب البیوع کے تحت پہلے باب کا عنوان ہی کسب اور طلب حلال ہے اس کی روایات کا ماحصل نفس کسب کی ترغیب وتوسیع یا معیار معاش کی بلندی نہیں بلکہ طیب وحلال کے اندر اس کی تحدید ہے یا کسب کے حرام وممنوع طریقوں کی تفصیل اور ان کی نہی وممانعت۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ خود پاک ہے وہ قبول نہیں فرماتا مگر صرف پاک وطیب چیزوں کو۔ اور اللہ نے مسلمانوں کو صرف انہی چیزوں (کے اکل وکسب) کا حکم دیا ہے جن کا پیغمبروں کو" اور ظاہر ہے کہ پیغمبروں کو صرف حلال وطیب ہی چیزوں کے کھانے کا حکم ہوتا ہے چنانچہ اسی کی سند اور شہادت میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دو آیات تلاوت فرمائیں یَا أَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ط اے پیغمبرو پاک چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، اور یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُلُوا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ پھر اسی روایت میں حضور ہی نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو مثلاً حج وغیرہ کسی نیک عمل کے لئے دور دراز سفر کی اتنی مشقت اٹھاتا ہے کہ بال پریشان ہیں اور جسم گرد وغبار سے اٹا ہے اتنی محنت ومشقت کے باوجود جب آسمان کی طرف

ہاتھ اٹھاتا ہے اور آہ وزاری کے ساتھ "اے پروردگار، اے پروردگار" کہہ کر دعا کرتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے آدمی کا بھی اگر کھانا پینا حرام کا ہے اور اس کی پرورش حرام سے ہوئی ہے تو اس کی دعا کیا قبول ہو سکتی ہے۔

حرام و حلال سے بے پرواہی

مطلب یہی ہوا کہ دینی و اسلامی یا خدا سے تعلق رکھنے والی معاشی زندگی کا اہم و اقدم سوال کسب نہیں، کسبِ حلال ہے جس کے بغیر حج وغیرہ کے سے پُرمشقت اور خالص دینی اعمال و عبادات تک اپنے ثمرات و برکات سے خالی رہتے ہیں اور دعا جو عبادت کا مغز یا عبدیت و بندگی کی جان ہے وہ بھی اللہ کی نگاہ میں لائق توجہ و قبول نہیں رہتی اس کے بعد بخاری شریف کی ایک اور روایت منقول ہے کہ ایک زمانہ ایسا آجائیگا کہ آدمی کھانے کمانے میں حلال و حرام کی بالکل پرواہ یا تمیز نہ کریگا کیا دور حاضر کی کسبی و معاشی جدوجہد کی سب سے بڑی خصوصیت یہی نہیں اور روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہے کہ مقصود جائز و ناجائز حلال و حرام کی فکر و تمیز کے بغیر مال و دولت کا محض کسب و حصول یا معاشی معیار بلند کرنا کرانا رہ گیا ہے، معاشی بلند معیاری کے ان بے تمیز نعروں کے بجائے اسلامی معاشیات کا سارا زور کسب میں حلال و حرام کی تمیز پر ہے اور اتنا زیادہ ہے کہ کھلے ہوتے حلال و حرام کا ذکر ہی کیا۔ مشتبہ چیزوں کے قریب جانے کا بھی اسلام روادار نہیں۔ آگے ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ

مشتبہ چیزوں تک پرہیز

.. حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام بھی ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں (جن کا حلال و حرام ہونا قطعیت کے ساتھ نہیں بتلایا گیا۔ اور اس نہ بتلانے میں تقویٰ کی تربیت و ترقی کی حکمت تھی) پس جس نے

ان مشتبہ چیزوں کے معاملہ میں تقویٰ سے کام لیا (یعنی ان سے بچا رہا) اس نے اپنے دین کو (خدا کی نظر میں) اور اپنی آبرو کو لوگوں کی نظر میں (اس حرف گیری سے کہ یہ حلال وحرام کی پرواہ نہیں کرتا) بچا لیا اور (جس نے اس کی پرواہ نہ کی بلکہ) مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہوا وہ (سمجھ لو کہ) حرام ہی میں مبتلا ہو گیا (کیونکہ بے پرواہ و بے احتیاط آدمی دیر سویر مبتلا ہو کر رہتا ہے) جیسے وہ چرواہا جو (ممنوعہ) چراگاہ کے بالکل کنارے چراتا ہے۔ اندیشہ (اور قوی احتمال ہے کہ ایک نہ ایک دن) ممنوعہ حدود میں جا پڑے، یاد رکھو کہ ہر بادشاہ کی ایک محفوظ یا ممنوع چراگاہ ہوتی ہے اسی طرح یہ بھی یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی ممنوع چراگاہ اس کے محارم ہیں (یعنی جن چیزوں کو اس نے حرام و ناجائز قرار دیدیا ہے)

خلاصہ یہ کہ کسب معاش کے معاملہ میں مسلمان کی شان صرف قطعی یا کھلے ہوئے محرمات ہی سے بچنا نہیں ہے بلکہ ایسے مشتبہات سے بھی بچنا ہے جن کی حلت وجواز قطعی ویقینی نہیں ہے۔ اسی حدیث کی شرح میں مشکوٰۃ کے شارح و محدث شیخ عبدالحق صاحب دہلویؒ لمعات میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"سلامتی اسی وقت تک ہے جب تک (کسب و اکل کے معاملہ میں) بندہ اپنی زندگی کی بقاء کے لئے بس بقدر ضرورت پر کفایت وقناعت کرتا ہے اور جہاں حد ضرورت سے قدم باہر نکلا اور مباحات میں توسیع یا گنجائش سے کام لیا گیا کہ مکروہات میں جا پڑا اور مکروہات سے محرمات اور محرمات سے کفر تک کا راستہ کھل جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پناہ میں رکھے"

اسلام کی معاشی بلند معیاری

یہ ہے صحیح معنی میں اسلام کی معاشی بلند معیاری کہ مسلمان اپنے کسب معاش کو اس فانی و عارضی زندگی کی بس واجبی

ضرورتوں تک محدود رکھ کر آخرت کی خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی یا ابدی زندگی کے معیار کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنے میں لگاہے وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔

بھلا دین کی اس قناعتی معاشیات کا بے دینی کی اس حرصی معاشیات سے کہاں تک اور کن کن باتوں میں جوڑ ملایا جا سکتا ہے جس میں قناعت موت کے مرادف اور ترقی کی دشمن خیال کی جاتی ہے اور کیوں نہ کی جاتے؟ جب اس زندگی کے آگے نہ کوئی اور زندگی ہو نہ اس کے بناؤ بگاڑ کا کوئی سوال، تو اس سے بڑا احمق کون ہوگا جو حلال وحرام کی تمیز یا قناعت کے وعظ کو سننا بھی گوارا کرے، یا کسی بلند و بانگ وزیر باتدبیر کا یہ بلند معاشی معیار بھی کیوں کسی کو قانع بنائے کہ ہر شخص کی آمدنی ۸۰۰ ماہوار ہو اور ہر شخص کے پاس اپنی موٹر اور اپنا گھر ہو، جبتک دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ۸۰۰ ماہوار سے زائد حاصل کر رہا ہو اور موٹروں میں دو چار ہزار والی پر بس کیوں کرے جبکہ بازار میں لاکھوں والی تک موجود ہوں اور گھر کے دو چار کمروں پر کیوں راضی رہے جبکہ اس دنیا میں روس کی مدعیانہ اشتراکیت اور معاشی مساوات کی سرزمین پر اس کے سب سے بڑے مدعی اسٹالن کا قصر ہی نہیں، اس کی قبر بھی لاکھوںؔ کی لاگت سے بنائی جا رہی ہو۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ابھی مذکورہ بالا حدیث کا مشہور آخری ٹکڑا سنانا باقی ہے کہ اور سب سے زیادہ یہ مد یاد رکھو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک رہا تو سارا بدن ٹھیک رہتا ہے اور وہ بگڑا تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے یاد رکھو کہ وہ دل ہے۔ الا ان فی الجسد مضغۃ اذا اصلحت

ؔ یاد نہیں رہا لاکھوں کیا شاید کروڑوں کا تخمینہ کہیں پڑھا تھا۔

صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ۔ الاوھی القلب۔

کسب واکل کی حرام راہوں سے بچنے بچانے کی اس انتہائی تاکید و احتیاط کے بعد کہ صرف کھلی ہوئی حرام چیزوں سے نہیں بلکہ جن کے حرام ہونے کا شبہ ہو ان سے بھی بچنا چاہیئے کہ سلامتی اسی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلامتی سے مراد جسم و بدن کی سلامتی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ تو بار ہا سانڈ کی طرح حرام خوری ہی میں خوب فربہ ہوتا ہے کہ بس جس کے کھیت میں جی چاہا گھس گیا اور منہ مارنے لگا۔ انسان کی سلامتی سے مراد تو اس کے قلب و روح یا باطن ہی کی سلامتی ہو سکتی ہے جو اس کی انسانیت یا انسانی فطرت کا اصلی جوہر ہے آج دنیا کی معاشیات و سیاسیات ہی کا نہیں زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ کا بگاڑ اور فساد تمام تر اس جوہر انسانیت ہی کے بگاڑ کا خمیازہ ہے۔

وہ معاشیات جس کی اصل نظر دل کی درستی و صلاح پر ہو اس کا میل اس معاشیات سے کیسے ہو سکتا ہے جس کی نظر صرف جسم کے بناؤ سنوار سے آگے نہ جاتی ہو اور اگر کہیں دونوں کی ظاہر صورت کچھ ملتی جلتی نظر آتے تو یہ وہ ڈارونی فریب نظر ہوگا۔ کہ انسان اور حیوان کی جسمانیت یا جسمانی ساخت و صورت کو ملتا جلتا دیکھ کر انسان کو بھی ترقی یافتہ اعلیٰ درجہ کا جانور ہی ٹھہرا دیا۔ ظالم نے اس موٹی بات کو نہیں سمجھا کہ خود جانوروں یا بندروں میں کوئی ڈارون نہ پہلے پیدا ہوا اور نہ آیندہ پیدا ہوگا اس عقلمندی کی داد کون دے سکتا ہے کہ سونا چونکہ دراصل اسی مادہ سے بنا ہے جس سے مٹی۔ لہذا سونے کی مٹی کے علاوہ یا مٹی سے زیادہ کوئی اپنی

طلائی حقیقت وقیمت نہیں! ان دانشمندوں کا نام آجاتا ہے تو قلم بے قابو ہونے لگتا ہے۔

کسب کی نبوی منفی تعلیم

ورنہ ابھی نبوت کی اصل معاشی دانش وحکمت کا وہ حصہ نقل کرنا باقی ہے جس سے دوٹوک یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی معاشیات کی نوعی حقیقت کسب کی ایجابی نہیں منفی تعلیم یا کسب کے امر کے بجائے اس کی نہی ونفی، یعنی کسب کی ایسی راہوں سے روکنا ہے جن سے دل کا بگاڑ یا آخرت کی بربادی ہو، چنانچہ مشکوٰۃ ہی میں آگے جو روایات درج کی گئی ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں چیز کی قیمت یا اس کے کسب کو خبیث یا پلید ٹھہرایا فلاں چیز کی قیمت کی نہی وممانعت فرمائی، فلاں چیز کی آمدنی یا کھانے پر لعنت فرمائی فلاں چیز کی بیع یا تجارت کو حرام قرار دیا مثلاً۔

آپ نے کتے کی قیمت کو خبیث کہا، زنا کی خرچی کو خبیث کہا، حجام (یا پچھنے لگانے والے) کے کسب کو بھی خبیث کہا۔ اسی طرح دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے کتے کی قیمت، زنا کے مہر اور کاہن کی اجرت سے نہی فرمائی یا روکا، سود کھانے والے پر لعنت فرمائی اور تصویر بنانے والے پر لعنت کی گودنے والے اور گدوانے والے دونوں پر لعنت[1] فرمائی۔ چوتھی حدیث ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب کی، مردار کی، سور کی اور بتوں کی بیع یا تجارت حرام فرمائی اس پر لوگوں نے دریافت فرمایا کہ مردار کی چربی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ (اس سے

---

[1] جو کہ آجکل فیشن بنا ہوا ہے کہ لوگ اپنے جسم پر دوستوں، معشوقوں وغیرہ کا نام و تصویر گدواتے ہی رہتے ہیں۔

تو بہت کام نکلتے ہیں مثلاً کشتیوں پر ملی جاتی ہے کھالیں اس سے چرب کی جاتی ہیں۔ چراغوں میں جلائی جاتی ہے آپ نے فرمایا کہ نہیں (باوجود ان کاموں میں آنے کے) وہ بھی حرام ہی ہے۔

حرام مال سے خیر و خیرات بھی قبول نہیں

اسی طرح اور بھی آگے جو حدیثیں مشکوٰۃ میں ہی منقول ہیں ان میں بھی سارا زور کسب پر نہیں کسب حرام سے ممانعت و احتیاط ہی پر ہے، یہاں تک کہ حرام کمائی کو اگر صدقہ کرے یعنی کسی کارِ خیر میں دیدے تو وہ بھی قبول نہ ہوگا۔

"کوئی شخص حرام مال کماتا ہو پھر اس کو صدقہ کرتا ہو تو ایسا صدقہ قبول نہیں ہوتا اور نہ ایسے مال کو (خود اپنے اوپر) خرچ کرنے میں برکت ہوتی ہے اور اگر ایسے مال کو ترکہ میں چھوڑ مرا تو وہ اس کے حق میں دوزخ کا توشہ بن جاتا ہے کیونکہ خدا برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا ہے بلکہ بھلائی سے برائی کو مٹاتا ہے"

اس کے بعد کی روایت ہے کہ "جس گوشت کی پرورش حرام مال سے ہوئی ہو وہ جنت میں نہ داخل ہوگا۔ جو گوشت حرام مال سے پلا ہو وہ دوزخ ہی کے لائق زیادہ ہے" پھر کچھ اور احادیث تقویٰ و احتیاط کی ہیں جن کا ماحصل وہی ہے کہ فقط ایسی ہی چیزوں کے کھانے کمانے یا اکل و کسب سے پرہیز واجب نہیں جن کا حرام ہونا قطعی ہے بلکہ مشتبہ چیزوں سے بھی بچنا چاہئے۔

دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيبُكَ

پھر اس طرح کی روایات ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے معاملے میں دس شخصوں پر لعنت فرمائی۔ شراب بنانے والے پر (خواہ اپنے لئے

بناتے یا دوسروں کے لئے) اور پینے والے اور اٹھانے والے پر اور جس کے پاس اٹھا کر لیجاتے۔ اور پلانے والے پر اور بیچنے والے پر (خواہ وہ کسی دوسرے ہی طرف سے بطور وکیل یا دلال کے بیچ رہا ہو) اور اس کی قیمت کھانے والے پر (خواہ خود نہ بیچنے والا ہو) اور اس کے خریدنے والے پر (خواہ اپنے لئے خریدے یا تجارت کے لئے) اور جس کے لئے خریدی گئی ہو اس پر"

یہ شراب اور اس کے سلسلہ کے کاروباری مشاغل آج دنیا میں کسب معاش کا اتنا بڑا ذریعہ بنے ہوتے ہیں کہ حکومتوں کو آبکاری کے صرف محصول سے کروڑوں کی آمدنی ہوتی ہے حتیٰ کہ جو حکومتیں اصولاً شراب کو بند کرنا چاہتی ہیں وہ بھی آمدنی کے اتنے بڑے دروازہ کو بند کرتے ہچکچاتی ہیں۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ اسلام نے کسب کے اس بڑے وسیع ذریعہ پر کتنا سخت پہرہ بٹھا رکھا ہے۔

اور آگے ان حدیثوں کو نقل کیا ہے جن میں گانے بجانے کے پیشوں اور ان کی اجرتوں کو حرام و ممنوع کیا گیا ہے اور اس کی سند میں خود قرآن کی آیت وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ کو خود حضور نے پیش فرما کر اس کی حرمت کو قرآنی حکم بنا دیا ہے آج ان پیشوں نے بھی خصوصاً فلم و سینما کی راہ سے کتنی وسعت اختیار کر لی ہے۔ حد یہ کہ اب تو گانے بجانے ناچنے تھرکنے کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کو آرٹ کا معزز لقب دے کر دیگر علوم و فنون کی طرح اس کے لئے بھی باقاعدہ اور مستقل تعلیم اور بڑی بڑی تعلیم گاہوں کا انتظام کیا جاتا ہے اور جو کام اسلام ہی کی برکت سے کل تک کم از کم شریفوں اور شریف زادیوں کا ننگ و عیب سمجھا جاتا تھا۔ وہ آج عین ہنر ہے اور خود حکومتوں کی طرف سے اس کی طرح

طرح سے عزت و ہمت بڑھائی جاتی ہے

صحابہ کی اسلامی معاشی مزاج شناسی

اس کے بعد وہ مشہور حدیث ملتی ہے کہ کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ اس میں بھی نفس کسب نہیں کسب حلال کی اہمیت اور لازماً کسب کی حرام راہوں سے ممانعت ہی مقصود ہے حضرات صحابہ اسلام کے اس معاشی مزاج کو خوب پہچان گئے تھے کہ وہ نفس کسب کی تعلیم و تاکید کے لئے نہیں بلکہ اس کو کسب کے حلال و طیب پاک و پاکیزہ وسائل تک محدود کرنے کے لئے آیا ہے چنانچہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو یہ کیا کہ سب سے زیادہ پاک (اطیب) کونسی کمائی یا کسب ہے؟ ارشاد ہوا کہ دستکاری، کاشتکاری (وغیرہ ایسا کام) جو آدمی کو خود اپنے ہاتھ سے کرنا پڑے اور بیع مبرور یعنی ایسی تجارت یا کاروبار جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہو

اسلام کی معاشی قناعت پسندی

دینی و اسلامی مزاج و مذاق سے ناآشنا و بیگانہ کسبی و معاشی ذہنیت کا عام رنگ یہ ہوتا ہے کہ ایک کاروبار یا ایک جگہ آدمی کی تجارت اچھی خاصی کامیابی کے ساتھ چل بھی رہی ہو تو بھی قانع نہیں رہتا۔ اور حرص کی نظر و نیت ادھر اُدھر دوڑتی رہتی ہے کہ اور کیا کام کروں کہاں مال پہنچاؤں جو اور نفع ہو۔ یہ بجائے خود کوئی حرام نظر و نیت نہیں تاہم کسب کے معاملہ میں اسلام کے قناعت پسندانہ مزاج و مذاق کے اتنی منافی ہے

کہ ایک صحابی حضرت نافع رضؓ فرماتے ہیں کہ :-

" میں اپنی تجارت کا مال شام و مصر بھیجا کرتا تھا پھر ایک مرتبہ عراق بھیجا۔ اس کے بعد ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں پہلے اپنا مال تجارت شام بھیجا کرتا تھا اس دفعہ عراق کی طرف بھیج دیا ہے حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو یہ تم نے کیا کیا! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہاری روزی کی ایک راہ نکال دی ہو تو اس وقت تک اس کو نہ چھوڑو جب تک اتنا فرق نہ آجائے کہ نفع ہونا بند ہو جائے یا نقصان آنے لگے "

ظاہر ہے کہ جائز تدابیر سے زیادہ نفع کیلئے دوڑ دھوپ کو اسلام نے حرام نہیں کر دیا ہے لیکن جب کسی ایک ذریعہ معاش و کسب سے اچھا خاصا کام چل رہا ہو اور آسودگی کے ساتھ گذر ہو رہی ہے تو پھر ضرورت سے زیادہ اس میں انہماک اور نیت کو ادھر اُدھر ڈانواں ڈول کرتے رہنا یقیناً اسلام کی معاشی قناعت پسندی کے خلاف ہے یہ تو اس خدا چھوڑی حرصی معاشیات ہی کا رنگ ہو سکتا ہے جس کے پیشِ نظر کوئی معاد نہیں اور اس لئے قدرتاً معاش ہی کی بلندی و ترقی میں مرنے کھپنے کے سوا اس کا نصب العین ہو ہی کیا سکتا ہے۔

باقی جس کی نظر کسی بلند تر ابدی زندگی پر ہو اس کا رنگ تو یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی کو خطرہ میں ڈالنے والے کسی مستقل ذریعۂ کسب میں حرصی انہماک تو الگ رہا اتفاقی طور پر بھی اگر کوئی حرام و ممنوع نہیں صرف مشتبہ چیز وہ بھی دانستہ نہیں نادانستہ اور دھوکے سے پیٹ میں چلی گئی تو معلوم ہوتے ہی نکال باہر کرتا ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرتبہ کوئی کھانے کی چیز اپنے غلام سے لے کر کھالی۔ غلام نے عرض کیا کہ آپ کو معلوم بھی ہے یہ کیا ہے؟ پوچھا کیا ہے؟ کہا میں نے جاہلیت میں ایک شخص کے لئے کہانت کی تھی اور یہ کام میں اچھی طرح جانتا نہ تھا۔ دھوکا دیدیا تھا۔ وہ شخص ملا اور اس کہانت کے بدلے میں یہ دیا تھا۔ جو آپ نے کھالیا۔ آپ نے فوراً ہی حلق میں انگلی ڈال کر جو کچھ پیٹ میں گیا تھا باہر نکال دیا۔

اسی طرح حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مرتبہ کسی نے دودھ پلا دیا جو آپکو بہت اچھا معلوم ہوا۔ دریافت فرمایا کہ یہ کہاں سے ملا؟ کھلانے والے نے عرض کیا کہ فلاں جگہ زکوٰۃ کے اونٹوں کا دودھ لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا مجھ کو بھی دیا گیا یہ وہی دودھ ہے۔ آپ نے بھی یہ سنتے ہی حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دی۔

تجارت کی ترغیب کی بجائے اس کے مفاسد سے ترہیب

اسی کتاب البیوع کی ایک فصل میں خاص طور پر تاجروں کے بارے میں کچھ روایات نقل کی گئی ہیں ان میں نفس تجارت کی کوئی ترغیب و تحریص نہیں بلکہ اس کے مفاسد سے ڈرایا گیا ہے، مثلاً فرمایا گیا کہ "تاجروں کا حشر فاسقوں، فاجروں، یا جھوٹوں اور دغا بازوں کے ساتھ ہوگا، بجز ان کے جنہوں نے جھوٹ فریب وغیرہ کی بدعنوانیوں سے پرہیز رکھا۔"

ایک روایت جس میں تاجروں کا ذکر مدح کے ساتھ ہے وہ بھی نفس تاجر ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ تجارت میں راست بازی اور امانت داری کا اہتمام چونکہ نہایت دشوار ہے اس لئے "صادق و امین" تاجروں کا اجر بھی اتنا ہی

عظیم رکھا گیا ہے کہ فرمایا "ان کا حشر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا" پھر بھی تجارت چونکہ ہے ہی ایسی چیز کہ امانت وصداقت کا اہتمام رکھنے والوں کا بھی لغزشوں سے بچنا آسان نہیں ہوتا اس لئے خطاب خاص کے ساتھ ارشاد ہوا کہ "اے تجارت کرنے والو تم سے تجارت میں کچھ نہ کچھ بیہودہ باتوں اور قسم کھانے کا گناہ تو ہو ہی جاتا ہے لہذا اس کے کفارہ کے لئے کچھ نہ کچھ صدقہ بھی کرتے رہا کرو۔

سود کے اسلامی مفہوم کی وسعت سے کیسی تنگیاں

کتاب البیوع ہی میں ربا یا سود کا باب بھی آتا ہے اس میں تو لین دین اور کاروبار کے لئے بہت سی ایسی قیدیں اور تنگیاں ملتی ہیں جن کا بنا ہنا کیا بظاہر سمجھ میں آنا بھی دشوار ہی ہے ایک جنس کی اچھی بری چیزوں میں کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ ایک بالکل معقول معاملہ معلوم ہوتا ہے مثلاً خراب گیہوں دے کر بدلے میں اچھے گیہوں کچھ کم لینا۔ لیکن اسلام کی نظر میں یہ بھی سود اور حرام ہے۔ ایک مرتبہ حضرت بلال رضؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں برنی (نام کے کچھ کھجور لے کر حاضر ہوئے آپ نے دریافت فرمایا کہاں سے لائے عرض کیا کہ ہمارے پاس کچھ خراب قسم کے کھجور تھے وہ دو صاع (جو ایک پیمانہ ہے) دے کر یہ برنی کھجور ایک صاع خرید لئے آپ نے فرمایا اے یہ کیا غضب کیا یہ تو بالکل سود ہے ایسا نہ کیا کرو یا جب کبھی ایسا کرنا ہو تو (اس کی جائز صورت یہ ہے) کہ خراب کھجور بیچ کر ان کے داموں سے اچھے خرید لیا کرو" بادی النظر میں یہ کیسی سراسر خلاف عقل تنگی و تحدید معلوم ہوتی ہے یہ تو صرف ایک مثال تھی ورنہ سود کے ماتحت شریعت نے

معاملات کی جیسی جیسی صورتوں کو داخل کر دیا ہے ظاہر نظر میں وہ بالکل بیجا قیود و تحدیدات ہی معلوم ہوتی ہیں۔

یہ کتاب البیوع کے مختلف ابواب سے اس امر کی کچھ مثالیں تھیں کہ اسلام میں کسب سے متعلق جو تعلیمات ہیں ان کی نوعیت کسب کی توسیع اور ترغیبی تعلیم کے بجائے درحقیقت اس کی بہت سی راہوں کو تنگ یا سرے سے بند کر دینا ہے یہاں تک کہ کتاب البیوع کے ذیل ہی میں بیع کی ممنوعہ صورتوں پر ایک مستقل جداگانہ باب، باب المنہی منہا عن البیوع " باندھا گیا ہے جس میں تنگی و تحدید کی اور بھی بہت سی اسی طرح کی صورتیں ملتی ہیں کہ

کیسی پابندیوں کی ۳۹ حدیثیں ایک ہی باب میں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزابنت سے منع فرمایا یعنی باغ یا کھیت میں جو پھل یا غلہ ابھی درختوں ہی میں لگا ہوا اس کو سوکھے یا توڑے ہوئے پھلوں یا غلہ کے عوض کسی پیمانہ کی ناپ سے فروخت کرنا منع ہے مثلاً توڑے ہوئے آم امرود وغیرہ کو درخت میں لگے ہوئے آم، امرود سے بیچنا، اسی طرح جب تک پھل درخت پر اچھی طرح نمایاں و ظاہر نہ ہوں ان کا بیچنا بھی ناجائز ہے کسی باغ کی فصل کا سال دو سال کے لئے بیچ ڈالنا بھی ممنوع ہے کہ اس میں تو پھل ابھی سرے سے آیا ہی نہیں۔ علیٰ ہذا خرید و فروخت کے معاملات پر ایسی پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں کہ کسب معاش کی من مانی آزادیاں ختم ہو جاتی ہیں

ایک باب احتکار کا ہے یعنی کھانے پینے کی ضروریات زندگی کو مزید نفع کی خاطر گراں ہونے تک روکے رکھنا۔ جو اس زمانہ میں کون چھوٹا بڑا دوکاندار اور تاجر نہیں کرتا لیکن رسول اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ

جس نے چالیس دن (بھی)، کھانے پینے کا سامان گرانی کی نیت سے روکے رکھا تو اس نے خدا سے اور خدا نے اس سے اپنا رشتہ توڑ لیا" دوسری حدیث میں ہے کہ بدترین آدمی احتکار یا ذخیرہ کرنے والا ہے کہ اگر خدا نے ارزانی کر دی تو غم زدہ ہو جاتا ہے اور گرانی کر دی تو خوش ہو جاتا ہے اور بھی جو ابواب اس کتاب البیوع میں ہیں ان کا مفاد بھی زیادہ تر کسب کے ذرائع و وسائل پر مختلف قسم کی شرطوں اور قیدوں کے لگ جانے سے لازماً ان کا محدود ہو جانا ہی نکلتا ہے یا پھر کسب کی جگہ وہی انفاق یا لینے کی جگہ نہ لینے اور دینے کی تحریص ہے مثلاً ایک باب "افلاس و انظار" کے عنوان سے ہے کہ اگر کوئی شخص افلاس و ناداری کی وجہ سے تمہارا قرض ادا نہیں کر پاتا تو اس کو یا سرے سے معاف کر دینے کی ترغیب ہے یا اتنا مفلس تو نہیں کہ سرے سے ادا نہ کر سکے لیکن وعدہ پر یا جلد ادا کرنے میں دشواری ہے تو اس کو مہلت و موقع دینے کی تاکید ہے فرمایا کہ جو چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کی مصیبت سے بچا لیں اس کو چاہیئے کہ تنگ دست کو مہلت دے یا بالکل ہی معاف کر دے، دوسری طرف قرضدار مرنے پر سخت سے سخت تہدید ہے حتیٰ کہ قرضدار مرنے والے کی آپ خود نماز جنازہ تک پڑھانا پسند نہ فرماتے تھے مطلب وہی کہ جہاں تک بن پڑے آدمی دے ہی کر مرے، لے اور لاد کر نہ لے جاتے، اگر خیرات و صدقات کی گنجائش نہیں تو کم از کم اپنا قرض جہاں تک اور جس طرح بن پڑے ادا ہی کر کے مرے ایک طرف قرض وصول کرنے والوں کو سختی کے بجائے زیادہ سے زیادہ نرمی برتنی چاہیئے بلکہ ہو سکے تو سرے سے نہ لے معاف ہی کر دے، دوسری طرف ادا کرنے والوں کو ادا کرنے یا دینے کے انتہائی اہتمام پر آمادہ کرنے کیلئے ایسا رویہ اختیار فرمایا کہ ایمان

والے کی روح کا نپ اُٹھے اور تا بہ امکان مرتے وقت ایک پیسہ کا بھی قرضدار نہ مرے۔ جب کوئی جنازہ نماز کے لئے آتا تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم خاص طور پر دریافت فرماتے کہ اس پر کچھ قرض تو نہیں؟ اگر معلوم ہوتا کہ ہے تو پھر دریافت فرماتے کہ اثاثہ اتنا چھوڑا ہے جس سے ادا ہو جائے اگر اس کا جواب نفی میں ملتا تو بہ نفس نفیس نماز نہ پڑھاتے، کون مومن اس محرومی کا تصور بھی کر سکتا ہے، آج بھی مسلمان کو یہی سوچنا چاہیئے کہ گویا حضورؐ تشریف فرما ہیں اگر ہم قرضدار مرتے ہیں تو کتنی بڑی محرومی کو خریدتے ہیں کہ حضورؐ ہماری نماز پڑھانا پسند نہ فرماتے۔ ایمان کی نشان تو یہ ہے کہ حضور نماز جنازہ پڑھانے والے ہوں تو ایسی موت پر ہزاروں زندگیاں قربان۔ شہید کا درجہ کتنا بڑا اور کتنا اجر ہے کہ اس کے سب گناہ خون شہادت سے دھل جاتے ہیں مگر حدیث ہی میں ہے کہ قرض کا گناہ شہید کا بھی معاف نہیں ہوتا اور سب معاف ہو جاتے ہیں۔

کتاب البیوع کے تمام ابواب سے بھی کسب سے زیادہ انفاق ہی کی ترغیب نکلتی ہے

اور بھی کتاب البیوع میں مختلف عنوانات کے ذیل میں جتنے ابواب ملتے ہیں ان کی حدیثوں میں لینے (یا کسب) کے بجائے دینے (یا انفاق) ہی کی ترغیب زیادہ نکلتی ہے، شرکت و وکالت کے ابواب میں ہے کہ جب دو آدمی کوئی کاروبار شرکت کے طور پر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کا تیسرا شریک میں ہوتا ہوں (یعنی ان کی مدد کرتا ہوں) جب تک کوئی ان میں سے اپنے ساتھی یا ساتھی سے خیانت نہیں کرتا، جہاں کسی نے خیانت کی کہ میں درمیان سے الگ ہو جاتا ہوں (یعنی خیر و برکت اٹھا لیتا ہوں) خیانت کی حقیقت ظاہر ہے کہ کسی کا حق لے لینا

یا مار لینا ہے اسی طرح غصب و عاریت کے باب میں متفق علیہ حدیث ہے کہ جس نے ایک بالشت بھی کسی کی زمین ظلم سے لے لی ہو گی تو قیامت کے دن اس کے گلے میں سات زمینیں لٹکائی جائیں گی اسی باب میں دوسری روایت ہے کہ کسی شخص کا مال بلا اس کی (پوری پوری) خوشدلی کے (کسی دباؤ مروت وغیرہ سے) لینا حلال نہیں" اسی بناء پر حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ آج کل چندے جس طرح مختلف اثرات کا دباؤ ڈال کر وصول کئے جاتے ہیں اس کو سخت ناپسند اور ناجائز تصور فرماتے تھے لیکن کیا کہا جائے کہ اس معاملہ میں بڑے بڑے دینی مدارس اور اکابر علما تک کوئی احتیاط نہیں فرماتے بلکہ الٹے اس کو مستحسن خیال کیا جاتا ہے۔

اجارہ کے باب میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین شخص ہیں جن کے مقابلہ میں قیامت کے دن میں مدعی یا خصم ہوں گا ان میں سے ایک وہ ہو گا جس نے مزدور سے کام لیا اور اس کی مزدوری نہ دی، دوسری روایت میں فرمایا کہ مزدور کی مزدوری اس کے پسینہ خشک ہونے سے پہلے دیدیا کرو" یعنی جلد از جلد ادا کر دیا کرو، آبپاشی کے باب میں ہے کہ تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ بات کرے گا نہ رحمت کی نظر سے دیکھے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہو گا جس کے پاس پانی اپنی ضرورت سے زیادہ تھا مگر اس نے دوسرے ضرورتمند کو اس سے آبپاشی نہ کرنے دی اور فرمائے گا کہ جس طرح تو نے اس سے اپنا فاضل پانی روکا اسی طرح میں تجھ سے اپنا فضل روکوں گا"

عطایا کے باب میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ خیبر میں مجھ کو ایک ایسی زمین ہاتھ آئی جس سے زیادہ نفیس کوئی مال مجھ کو کبھی نہیں ملا۔ اس کے بارے میں آپ کیا حکم دیتے ہیں، فرمایا کہ

چاہو تو اصل زمین وقف کر کے اس کے منافع کو صدقہ قرار دیدو، حضرت عمرؓ نے ایسا ہی وقف کر دیا کہ اصل زمین نہ بیع ہو نہ ہبہ نہ میراث، اور اس کا منافع فقیروں پر، رشتہ داروں پر، غلاموں کے آزاد کرانے پر، مسافروں پر مہمانوں پر، اور اللہ کی راہ میں خرچ ہوتا ہے۔ اسی باب میں ہے کہ کسی چیز کو ہبہ کر کے واپس لینا ایسا ہی ہے جیسے کتا قے کر کے پھر کھا جاتا ہے۔ دوسری روایت میں ہدیہ دینے کی ترغیب اس طرح فرمائی کہ ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو کہ یہ آپس کی دشمنی اور کینہ کو دور کرتا ہے" لقطہ یعنی کسی کو کوئی گری پڑی چیز مل جائے تو اس کو اصل مالک تک پہنچانے کے لئے سال بھر تک انتظار و اہتمام کا حکم ہے۔

میراث و ترکہ یا فرائض کا باب بھی کتاب البیوع ہی کے ضمن میں آتا ہے جس کا حاصل ہی مال و جائداد کو نسل در نسل اس طرح تقسیم کرانا ہے کہ بس انداز مال حسب تعلق زیادہ سے زیادہ وارثوں تک پہنچ جائے اسی ذیل میں وصیت کا باب آتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو اللہ نے اتنا دیا ہے کہ وارثوں یا اپنوں کو محروم یا حق تلفی کئے بغیر غیروں کو بھی کچھ دے دلا سکے تو اس کے لئے وصیت کی اتنی تاکید ہے کہ دو راتیں بھی ایسی نہ گذارے کہ لکھا ہوا وصیت نامہ اس کے پاس موجود نہ ہو البتہ ایسی اور اتنی وصیت کی اجازت نہیں کہ اولاد وغیرہ اصلی و قریبی تعلق والوں کا حق مارا جائے، فرمایا کہ اپنے وارثوں کو تم خوشحال چھوڑ دو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں" اصل مقصود انفاق کا چونکہ خدا کی خوشنودی اور آخرت کی بہبودی یا اجر و ثواب ہے اس لئے اس کی وسعت اسلام میں یہاں تک ہے کہ خدا و آخرت کی نیت سے خود اپنی بیوی کو بھی آدمی جو کچھ دیتا اور

کھلاتا ہے اس پر بھی ثواب ملتا ہے البتہ وصیت وارثوں کے حق میں جائز نہیں رکھی گئی کہ ان کے حقوق تو خود شریعت نے تعیین کے ساتھ فرض کر دیئے ہیں اب اگر انہیں کو اور دے دلایا جاتا تو انفاق کی مناسب و ممکن زیادہ سے زیادہ توسیع کے اصول و مصلحت کے منافی ہوتا۔

فقہ میں

حدیثوں کی کم و بیش اسی کتاب البیوع کے مختلف ابواب زیادہ قانونی و عملی تبویب و تنقیح کی شکل میں فقہ کی کتابوں میں ہوتے ہیں جن کو اسلام کے منضبط معاشی احکام کہا یا اسلامی معاشیات کا لقب دیا جا سکتا ہے مگر ان کی نوعیت بھی بالذات حصولِ مال یا دولت کی پیدائش اور اس کے اسباب و ذرائع کی تعلیم و تحقیق نہیں ہوتی بلکہ وہی معاد کی نظر سے معاش کے ذرائع کی جائز و ناجائز حلال و حرام، مکروہ و مباح یا مستحب و مستحسن ہونے کی۔ بس اس معنی میں چاہو تو حدیث و فقہ کی کتاب البیوع کے ابواب و مسائل کو اسلامی معاشیات کے کسبی (یا مال و دولت کے کسب و پیدائش کے) مسائل کہہ لو، مگر ان کا مدعا نفس پیدائش دولت کیلئے ان معاشی وسائل کی تفصیل و تحقیق ہوتی ہے جو انسان اختیار کرتا اور کر سکتا ہے اور نہ ان کی تعلیم و ترغیب، بلکہ اصلاً معادی خیر و فلاح کے لحاظ سے معاشی وسائل پر بہت سی قیود و شرائط یا ایسی تحدیدات عائد کر دینا جن سے کسب مال یا پیدائش دولت اور حصول معاش کی وہ من مانی آزادیاں ختم ہو جاتی ہیں جن سے معاد کا بگاڑ ہو اور ان قیود و تحدیدات کی بدولت آدمی کو بار بار بجائے دولت پیدا کرنے

کے لئے کھونا پڑتا ہے۔
اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی معادی اور آجکل کی غیر معادی معاشیات میں مشرق و مغرب کی دوری ہے غیر معادی معاشیات میں اگر جائز و ناجائز کی کچھ شرطیں اور قیدیں لگائی بھی جاتی ہیں تو ان کا تعلق تمامتر اسی دنیا کی معاشی زندگی کے بناؤ بگاڑ سے ہوتا ہے بخلاف حلال و حرام کی اسلامی قیود و احکام کے کہ ان کا اصلی رُخ آخرت کی معادی زندگی کے بناؤ بگاڑ کی طرف ہوتا ہے ورنہ جو رب اور رزاق پانی زمین اور ہوا کی انسانوں سے بہت زیادہ اور بیشمار جاندار مخلوق کو بلا کسی معاشی جواز و ناجواز یا معادی حلت و حرمت کی قید و بند کے روزی پہنچاتا ہے کیا وہ ایک انسان ہی کی محدود آبادی کو معاشیات کی علمی و عملی ادھیڑبن میں ڈالے بغیر رزق رسانی سے عاجز تھا۔؟
غرض اسلام کی معادی معاشیات کی رو سے انسان کے لئے مال و معاش کے کسب کا مسئلہ بذات خود کوئی مسئلہ نہیں، اصل مسئلہ معاد کے لحاظ سے کسب معاش کی بعض خاص صورتوں کے عدم جواز یا حرمت کا ہے یعنی وہی کسب کے بجائے عدم کسب یا ترک کسب کا، ورنہ نفس کسب یا حصول رزق کے معاملہ میں ایک طرف اگر دیگر حیوانات کی طرح انسان کی رہنمائی بالکلیہ طبیعت و جبلت کے ماتحت نہیں رکھی گئی تو دوسری طرف عقلی رہنمائی کے ساتھ ایمانی راہ سے اتنا اطمینان دلایا گیا ہے کہ جب تک اپنے مقررہ معاش کا ایک ایک دانہ پورا نہ کرے گا مر ہی نہیں سکتا۔
مگر سوچنے کی بات ہے، کہ ایسی ضمانت کی صورت میں پھر انسان کو معاشی عقل و تدبیر کے جھگڑوں میں سرے سے ڈالا اور حلال و حرام کی زنجیروں میں کسا ہی

کھول گیا؟ اس سوال کے نہ سوچنے اور نہ سمجھنے سے معاش ہی نہیں اسلامی زندگی کے سارے شعبوں میں طرح طرح کی غلطیاں اور غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں کائنات میں انسان کا اسلام نے جو محل و مقام قرار دیا ہے وہ پیش نظر نہ رہنے سے اسلامی تعلیمات میں قدم قدم پر ٹھوکریں لگنا اور بہکنا ناگزیر ہے۔

اوپر تمہیدی ابواب کے ایک خاص باب میں اس کی تفصیل گذر چکی کہ اسلامی تعلیم کی رو سے انسان کا اصل منصب و مقام اس کائنات میں اپنے اور کائنات دونوں کے خالق کے خلیفہ عبد اور امین کا ہے اور فرائض امانت کی ادائی کے ساتھ ساتھ خلافت و عبدیت کی تربیت و ترقی کے لئے جس طرح ایک درجہ میں خلیفہ غلام یا امین کا مجبور و ماتحت ہونا اور رہنا ضروری ہے اسی طرح ایک حد تک مختار و آزاد ہونا بھی لازم ہے، خلافت و نیابت یا نمائندگی و وکالت کے حقوق و فرائض بجا لانے کے لئے جس طرح ایک طرف لابد ہے کہ جس کا نائب و وکیل ہے ہر قدم اس کی مرضی و منشار کے مطابق اٹھے۔ اسی طرح اس کو دوسری طرف اس قدم کو اٹھانے کا پورا اختیار بھی ہو جبر و اختیار کی اسی جامعیت میں بندہ کی بندگی یا عبدیت کی ترقی و تکمیل منحصر ہے امین یا خزانچی کے لئے خزانہ کی تقسیم اور اس میں تصرف کا اختیار حاصل ہونا بھی ناگزیر ہے اور اس تصرف و اختیار کو بالکلیہ مالک خزانہ کی مرضی و حکم کے موافق استعمال کرنے ہی میں امانت کی تکمیل و کمال ہے

انسان یا اس کا جو فرد بھی جبتک زندہ ہے اس کی زندگی کے سامان یا معیشت کی ضمانت و ذمہ داری تو اس کو اپنا خلیفہ بنانے والے اور عبدیت و امانت کا بوجھ ڈالنے والے نے بالکل اسی طرح لے رکھی ہے جس طرح کسی عبد یا غلام کی روزی یا ضروریات زندگی کی فراہمی تمام تر اس کے آقا

و مالک پر ہوتی ہے اور غلام کا کام آقا کی بے چون وچرا کامل اطاعت ہے ایسی کامل جس کو تھانہ بھون کے مجدد وقت اس حکایت سے خوب واضح فرمایا کرتے تھے کہ کسی نے کوئی غلام خریدا اس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے کہا آج سے جو آپ رکھیں، پوچھا کھاتے کیا ہو؟ کہا آج سے جو آپ کھلائیں بس یہی نوعیت اسلامی معاشیات میں حرام وحلال کی تحدیدات کی کہ سامان زیست یا رزق کا مہیا کرنا تو ہر طرح ربّ رزاق ہی کی ذمہ داری ہے لیکن ہماری عبدیت وبندگی کی تکمیل وترقی تمامتر اس میں منحصر ہے کہ اس سامان میں اپنے یا دوسروں کے لئے تصرف کا جو اختیار ملا ہے وہ بالکلیہ آقا ہی کی مرضیات واحکام کے تابع رہ کر استعمال ہو۔

انسان کی اس عبدیتی یا خلافتی وامانتی خلقت وفطرت ہی کا معاشی معاملات میں مقتضا ومطالبہ یہ ہے کہ معاشی اسباب ووسائل یا پیدائش دولت کے ذرائع میں افراد پر خارجی پابندیاں کم سے کم ہوں اور ارادی آزادیاں زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں تاکہ وہ اس ارادہ کو اختیاری طور پر آقا کی خوشی وخوشنودی کے ماتحت رکھ کر طاعت وبندگی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات تک عروج کر سکے۔

اس نظر سے بھی موجودہ لادینی معاشیات کا رجحان اسلام کی دینی معاشیات کی نقیض ونفی ہی ہے "قومی ملکیت" کے نام سے انفرادی ملکیت یا دولت ومعیشت کی پیدائش کے وسائل پر حکومتیں اس طرح غصبًا وجبرًا قابض ہوتی جاتی ہیں کہ افراد کے لئے خلافت وعبدیت کو فروغ دینے والے یا کسب وانفاق کے آخرت ساز مواقع اور آزادیاں کم سے کم ہوتی جا رہی ہیں خود ہمارے ملک (ہندوستان) میں اس کی تازہ

مثال خاتمۂ زمینداری ہے اس کی ایک صورت تو وہ ہے کہ حکومت نے زبردستی زمینداروں کی زمینیں چھین کر کاشتکاروں کو چھوٹے چھوٹے زمیندار بنا کر خود سب سے بڑی جابر و قاہر زمیندار و جاگیردار بن بیٹھی۔ اور دوسری "بھودان" کی وہ تحریک ہے جو مثلاً ونوبا بھاوے نے گاندھی جی کے مذہبی رجحانات کے رنگ میں اختیار کی کہ زمینداروں کو اس کی ترغیب دیجائے کہ وہ خود اپنے ارادہ و اختیار، خوشی و خوشدلی سے "دان" یا خیر و نیکی کا کام جان کر اپنے زیادہ حاجتمند بھائیوں کو دیدیں۔ معاشی اصلاح کا پہلا یا حکومت کا راستہ لادینی بلکہ دین دشمنی کا ہے اور دوسرا دین و مذہب کا۔

زمینداروں یا جاگیرداروں کے ظلم و زیادتی کی نہ واقعیت سے انکار ہے نہ اصلاح کی ضرورت سے، گفتگو اصلاح کے طریقہ میں ہے اور گو انسان اور انسانیت کو آج کل کی دین دشمن معاشیات و سیاسیات نے مسخ کرنے میں اپنی والی کوئی کسر لگی نہیں رکھی، تاہم انسان بہرحال انسان ہے حکومت نے جو زور و زر جبر و قانون کی راہ سے زمینداری کے سلب کرنے میں لگایا وہی اگر بھودان مشن کو کامیاب بنانے میں لگاتی تو نسبتاً بہت کم زور و زر کے صرف سے بہت زیادہ خوشدلی کے ساتھ یہی اصلاح انجام پاتی اور یہی زمیندار اپنے اختیار و خوشی سے ایثار و قربانی کرکے دوسروں کا معاشی معیار بلند کرنے کے ساتھ خود اپنا معادی معیار یا کم از کم اخلاقی و انسانی معیار کتنا اونچا کر لیتے اور فریقین کے سینہ میں ایک دوسرے سے بغض و عداوت قتل و غارت کی جو آگ بھڑکا دی گئی ہے اس کی جگہ باہمی ایثار و اعتماد، اعانت و محبت اور ہمدردی و خیرخواہی کے چشمے ابلنے لگتے ابھی اسی بدنام و رسوا زمینداری و جاگیرداری کے خاتمہ پر ہمارے مشہور

صاحب علم وقلم مولانا گیلانی سلمہٗ نے اسلامی نقطۂ نظر سے ایک سلسلہ مضامین[1] میں جو عالمانہ بحث فرمائی ہے اس کی تفصیلات سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو عمق کی بات یہی نکلتی ہے کہ پیغمبر اسلام ؐ نے بھی زمینداروں کو حاکمانہ وجابرانہ قوانین بنا کر نہیں بلکہ رضاکارانہ طور پر اس کی ترغیب دی تھی کہ جو زمین ان کی ضروریات یا کاشت سے فاضل ہو وہ اپنے بھائیوں کو خوشی سے بلا معاوضہ کاشت کے لئے دیدیں۔

اسی کی فرع اسلامی وغیر اسلامی معاشیات کا یہ اصولی فرق بھی ہے کہ غیر اسلامی معاشیات تو اپنی معراج کمال ایسی غیر فطری دنیا بنانا جانتی ہے کہ سرمایہ داروں یا دولتمندوں سے مال و دولت زبردستی چھین جھپٹ کر اور امیر و غریب کے تفاوت کو مٹا کر سب کو اس درجہ تک برابر کر دیا جائے کہ اوسط درجہ کی معاشی ضرورتوں کی مد تک کوئی کسی کا محتاج ہی نہ رہے یعنی افراد کی انفرادی واختیاری خیر و خیرات اور میراث کا دروازہ سرے سے بند ہو جائے اور آدمی اس معاملہ میں اپنی رضاکارانہ یا مختارانہ خلافت و عبدیت کی تربیت و تہذیب سے مطلقاً محروم ہو جائے کیا عجب کہ یہ اس انتہا تک جا کر رہے کہ صدقات وخیرات کا لینے والا ڈھونڈھے نہ ملے جس کو بخاری شریف کی کئی روایتوں میں قرب قیامت کی ایک علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ سب لوگ اتنے مالدار ہو جائیں گے کہ صدقہ یا زکوٰۃ لینے والا ڈھونڈھے نہ ملے گا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تقوم الساعۃ حتی یکثر فیکم المالُ	قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی جب تک مال کی اتنی زیادتی نہ ہو جائے کہ وہ بہا بہا پھرے حتیٰ کہ مالدار آدمی

---

[1] ... اعظم گڈھ بابت ماہ ....

فیفیض حتیٰ یھم رب	کو فکر پڑ جاتے گی کہ اس کا صدقہ کون
المال من یقبل صدقتہ	قبول کرے گا جس کو دینا چاہیگا وہ
وحتی یعرضہ فیقول	یہ کہہ کر رد کر دے گا کہ مجھ کوئی ضرورت
الذی یعرضہ علیہ	نہیں ہے۔
لا ارب لی	

....

بخاری کی دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ

تصدقوا فانہ یأتی	لوگو صدقہ کرو کیونکہ ایک زمانہ ایسا
علیکم زمان یمشی	آنے والا ہے کہ آدمی اپنا صدقہ
الرجل یصدقتہ فلا	وزکوٰۃ لئے پھرے گا اور کوئی
یجد من یقبلھا۔	لینے والا نہ ملے گا۔

(باب الصدقۃ قبل الرد)

....

غرض آج معاشی نصب العین جو اس درجہ تک عام معاشی آسودگی و مساوات کو قرار دے لیا گیا ہے کہ کوئی کسی سے اتنا کم اور نیچا نہ رہنے پائے کہ اس کا محتاج و دست نگر ہو یہ اسلام کی نظر میں غیر مطلوب ہی نہیں بلکہ یہ غیر فطری حالت سرے سے اس دنیا اور انسان کے ختم ہو جانے (قیامت) ہی کا پیش خیمہ ہو گی جب اس نے اپنی تخلیقی غرض و غایت یعنی اختیاری ـــ یا خلافتی و امانتی ـــ فطرت کی تکمیل و تحقق اور عبدیت و بندگی۔ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ کا راستہ خود ہی اپنے اوپر بند کر لیا۔ اور اپنی آفرینش کے مقصد کی راہ آپ ہی مار دی۔ تو پھر وہ اور اس کے لئے زمین و آسمان جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اس کے باقی رہنے کا جواز ہی کیا رہ جاتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ انسان کے سارے انسانی کمالات کا منبع اس کی باطنی نیت ارادی آزادی اور اختیاری عمل ہے کوئی کسی محتاج و فقیر کو روٹی کا ایک ٹکڑا یا تانبے کا ایک پیسہ بھی نیک نیتی و خوشدلی سے دیدے تو یہ اس نے ہمدردی کا اخلاقی اور خدا ترسی کا دینی فرض ادا کیا، باطنی و اخروی دونوں اعتبار سے کچھ نہ کچھ ترقی کی۔ لیکن ایک شخص سے اگر کوئی مشٹنڈا فقیر زبردستی سو روپیہ چھین لے یا حکومت چھین کر کے فقیروں میں بانٹ دے تو خود اس شخص کو نہ پیسہ بھر وہ اخلاقی و روحانی تربیت و ترقی نصیب ہو گی اور نہ وہ ان فقیروں کی کسی رضاکارانہ اعانت و ہمدردی کے اجر کا مستحق ٹھہرےگا اس لئے جو معاشی دعوت اور پروگرام حاکمانہ طاقت کے زور و جبر سے قوم و افراد کی معاشی سطح کم و بیش برابر کر دینا غریبی و امیری کی اونچ نیچ کو سرے سے ختم کر دینا یا سب کو اتنا غنی بنا دینا چاہتا ہے کہ ہر ایک کے پاس اپنی موٹر کار ہو اور ہر ایک کی آمدنی آٹھ سو روپیہ ماہوار ہو" تو وہ درحقیقت امیر و غریب سرمایہ دار و نادار سب ہی پر انسانیت کے ان اخلاقی و روحانی یا دینی و اخروی کمالات کا دروازہ بند کر دینا چاہتا ہے، جو غنی و فقیر ہر ایک اپنے اپنے مرتبہ و محل کے لحاظ سے حاصل کر سکتا ہے اور دینی لحاظ سے تو معاشی دائرہ میں ایک طرف قناعت و توکل، صبر و رضا وغیرہ اور دوسری طرف ان انفاقی فضائل و کمالات کے لئے گنجائش ہی کتنی رہ جاتی ہے جن کی تحسین و ترغیب سے کتاب و سنت دونوں کی تعلیمات بھری ہیں۔

اسلام نے انسان کی جو انسانیت یا تکوینی فطرت "خلافت" قرار دی ہے اس کی تشریعی تکمیل و تربیت یہ اس کے ممکن ہی نہیں کہ زندگی کے تمام دائروں اور شعبوں میں افراد کو جبر و قانون سے نہیں بلکہ اپنے انفرادی اختیار

و رضا سے خیر کو اختیار کرنے اور شر کو ترک کرنے کی زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور خارجی پابندیاں کم سے کم ہوں بس اتنی کہ کسی فرد کی انفرادی آزادی دوسرے کی انفرادی آزادی میں مخل نہ ہو، اس لئے اسلامی حکومت کا کام انفرادی آزادی کی اس حد تک نگرانی اور روک تھام کرنا ہے کہ معاشرہ کا ہر ہر فرد اپنے اپنے محل و مقام کے اعتبار سے اپنی اپنی انسانیت کی تکمیل میں دوسروں کی مداخلت و مزاحمت سے محفوظ رہے۔

مثلاً معاشی دائرہ میں ایک طرف حکومت کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس کے شہریوں میں ایک فرد بھی اتنا تنگ دست نہ رہنے پائے کہ جب نماز کی نیت باندھے تو یہ فکر لگی ہو کہ کل بال بچے کیا کھائیں گے"

شب چو عقد نماز بر بندم   چہ خورد بامداد فرزندم

دوسری طرف وہ اغنیاء یا مالداروں کو اتنی آزادی نہ دے گی کہ وہ عیاشی و اوباشی یا لہو و لعب اور مسرفانہ عادتوں میں من مانے طور پر اپنا مال اڑاتے رہیں ساتھ ہی ان کے مال سے کم از کم اتنا وہ قانونی و جبری طور پر وصول کرلے گی جو دوسروں کو "چہ خورد بامداد فرزندم" کی حد تک فاقہ کش و تنگ دست نہ ہونے دے مگر سرمایہ داری و جاگیرداری کو اپنی چڑھ بنا کر حکومت کو اس کا حق بالکل نہیں کہ وہ زائد دولت رکھنے والے افراد کی زائد دولت سلب کرکے ان کو فضائل و کمالات کے ان انفاقی مواقع سے محروم کر دے جو وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کام لے کر انفرادی طور پر حاصل کر سکتے تھے اور جس سے ان کے اصل انسانی جوہر یا اختیاری فطرت و خلافتی منصب کی تربیت و ترقی ہوتی تھی البتہ حکومت کو اس کا حق ہی نہیں اس کا فرض ہے کہ شراب و کباب، رقص و سرود، سینما اور تھیٹر جوا اور گھوڑ دوڑ بلکہ بیڑی اور سگریٹ تک کے بھی بے شمار رائج الوقت فضولیات

کو قانوناً نا جائز کر دے، جن سے امیروں کو اپنا زائد از ضرورت روپیہ ہی نہیں بلکہ فقیروں کو اپنی بھیک تک صحیح انفاق کے بجائے اسراف یا فضول خرچیوں میں اڑانے کی ترغیب و تحریص ہوتی ہے اور جس سے معاشرہ کا دینی و روحانی ہی قوام نہیں بگڑتا بلکہ دنیوی و جسمانی نظام بھی درہم برہم ہوتا ہے پھر اسلامی ریاست زائد دولت کی تقسیم کا ایک ایسا فطری قانون وراثت رکھتی ہے جس سے ایک طرف آدمی کو اس کی مسرت و راحت حاصل رہتی ہے کہ اس کی کمائی خود اسی کے اہل و عیال اعزہ و اقرباء کے کام آئے گی اور دوسری طرف بڑی سے بڑی دولت یا سرمایہ و جاگیر آپ سے آپ قدرتی طور پر نسل در نسل تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے

اس کے علاوہ اسلامی مزاج و مذاق کے معاشرہ میں زندگی قدرۃً فضولیات سے پاک ہو کر ضروریات تک محدود ہو جاتی ہے کیونکہ آخرت پر نظر رکھنے والا یا عاقبت اندیش انسان تعیش و تنعم میں اس سے زیادہ منہمک ہی نہیں ہو سکتا جتنا کہ اسٹیشن پر ریل کا مسافر ہوتا ہے کہ اسٹیشن پر اگر آرام سے بھی لیٹا بیٹھا ہو اور گاڑی کے اندر کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ مل رہی ہو تو پائدان پر کھڑے کھڑے راستہ گذار لینے ہی کو مسافر خانہ کے آرام پر ترجیح دیتا اور منزل کھوٹی کرنا مشکل ہی سے پسند کرتا ہے اس کو ساری فکر وہاں کے آرام و آسائش کی لگی رہتی ہے جو اصل وطن ہے اور جہاں ساری عمر بسر کرنا ہے وہ ضروریات سفر سے فاضل اپنے روپیہ پیسہ کو ایسی چیزوں میں خرچ کرنا چاہیگا جو وطن کی مستقل زندگی میں زیادہ کار آمد و راحت رساں ہو۔

یہی انفرادی و اختیاری انفاق کی وہ ذہنیت ہے جو اسلام کی انفاقی معاشیات اپنے معاشرہ کے افراد میں پیدا کرنا چاہتی ہے اور جو دینی ہی نہیں دنیوی

اعتبار سے بھی تمام معاشی مفاسد و امراض کا کلی و اصولی علاج ہے کتاب و سنت کی اس معاشی تعلیم نے بڑے بڑے دولتمند اور سرمایہ دار صحابہ میں جو اور جیسی انفاقی ذہنیت پیدا کر دی تھی اس کا اندازہ ذیل کی مثالوں[۱] سے ہو گا۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں حضرت ابو مسعود انصاری اسی عام ذہنیت کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ جب صدقہ کی آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام بازاروں میں جاتے اور محنت و مشقت سے جو کچھ ہاتھ آتا اس کو خیرات کر دیتے۔" یعنی کمانے کی محنت و مشقت بھی زیادہ تر آخرت کے کاموں میں خرچ کرنے کے لئے اٹھاتے تھے۔

(۱) " ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ایک حاجتمند صحابی سے فرمایا کہ اس وقت اگر میرے پاس دس ہزار درہم بھی ہوتے تو سب تم کو دیدیتی، اتفاق کی بات کہ اسی شام کو حضرت معاویہؓ نے ان کی خدمت میں اتنی ہی رقم بھیجی، فرمایا کتنی جلد میری آزمائش ہو گئی اور فوراً ان صحابی کو بلا کر پورے دس ہزار کے دس ہزار ان کو دیدیئے۔ اور بھی جو کچھ مل جاتا خیر و خیرات ہی میں جاتا۔ بخاری ہی میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر نے ان کو اتنی فیاضی سے روکنا چاہا تو اتنی ناراض ہوئیں کہ ان سے نہ بولنے کی قسم کھالی"

(۲) حضرت اسماء کے پاس صرف ایک لونڈی تھی اس کو فروخت کر کے قیمت گود میں رکھے بیٹھی تھیں کہ ان کے شوہر حضرت زبیرؓ آتے اور یہ رقم انہوں نے مانگی حضرت اسماء نے جواب دیا کہ

---

[۱] جو احقر کے عزیز عزیزی مولوی عبد القیوم سلمہٗ نے اپنی چھوٹی سی کتاب التجارۃ فی الاسلام نام میں جمع کر دیئے ہیں جو آسانی سے یکجا مل گئے اور صرف کچھ حذف و اضافہ یا تقدم و تاخر سے کام لینا پڑا۔
(جزاہ اللہ تعالیٰ)

میں تو اس کو خیرات کر چکی ہوں۔

(۳) حکیم ابن حزامؓ دار الندوہ کے ایوان خاص کے مالک تھے جس کو حضرت امیر معاویہ رضؓ کے ہاتھ ایک لاکھ میں فروخت کیا اور سب خیرات کر دیا۔

(۴) حضرت سلمان مدائن کے گورنر تھے پانچ ہزار دینار تنخواہ تھی جب تنخواہ ملتی سب کی سب خیرات کر دیتے، خود چٹائی بن کر اپنی گذر کرتے۔

(۵) ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ اتفاق سے ایک دولت مند صحابی مالک ابن جبلہ ادھر سے گذر رہے تھے سن کر بیہوش ہو گئے، ہوش آیا تو آستانہ مبارک پر حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے باپ آپ پر قربان! کیا یہ آیت سونا چاندی جمع کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے آپ نے فرمایا ہاں! عرض کیا کہ شام ہوتے ہوتے ایک درہم و دینار بھی باقی نہ چھوڑونگا اور ایسا ہی کیا۔

(۶) حضرت معمر بن سعد کا یہ رنگ تھا کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے قرض تک لینے میں دریغ نہ فرماتے، ایک غزوہ میں فوج کے کھانے کا بندوبست قرض ہی سے کیا تو حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت عمر رضؓ نے روکنا چاہا کہ اس طرح تو یہ اپنے کو برباد کر ڈالیں گے، ان کے والد حضرت سعد کو جب یہ معلوم ہوا تو آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ ابن قحافہ اور ابن خطاب سے مجھ کو کون بچائے

یہ میرے بیٹے کو بخیل بنانا چاہتے ہیں۔"

جس طرح جدید معاشیات اور معاشی نظریات نے انسان کی کسبی ذہنیت کو اتنا اندھا کر دیا ہے کہ اس کی سعی و فکر، دوا دوش اور انہماک کی بدولت خود اس دنیا میں دل کا چین و آرام برباد ہو جاتا ہے اسی طرح اسلامی معاشیات کی پیدا کی ہوئی انفاقی ذہنیت میں بعض اوقات صحابہؓ اپنے حال و مآل کو نظر انداز کر کے اتنے غلو سے کام لیتے کہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو ناراض ہو کر روکنا بھی پڑتا تھا۔ مشہور واقعہ ہے کہ :-

" ایک صحابی انڈے برابر سونا لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ ایک کان میں مجھ کو ملا ہے اور میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے آپؐ نے اعراض فرمایا پھر وہ داہنی طرف اس کو لے کر آئے اور یہی عرض کیا آپ نے منہ پھیر لیا۔ پھر بائیں جانب آئے آپؐ نے پھر توجہ نہ فرمائی آخر وہ پشت کی طرف آئے اس دفعہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اس زور سے ہاتھ مارا کہ ان کی گردن پر سخت چوٹ آئی اور فرمایا کہ تم لوگ اپنا سارا مال صدقہ کر دیتے ہو اور پھر بھیک مانگتے ہو، بہترین صدقہ وہ ہے کہ صدقہ کے بعد بھی آدمی کے پاس کچھ بچ رہے۔"

جب لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی آیت اتری کہ " تم اس وقت تک نیکی کو ہرگز نہ پا سکو گے جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو۔" بخاری میں ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں سب سے زیادہ اپنے اموال میں بیرحاء (کنویں کا نام) کو محبوب رکھتا ہوں اور اس کو خدا کی راہ میں خیرات کر کے ثواب کا امیدوار ہوں۔

حد یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنا معمول ہی بنالیا تھا کہ جو چیزیں پسند ہوتیں ان کو اللہ کی راہ میں دیدیتے۔ ایک بار سفر حج میں اپنی اونٹنی کی چال پسند آئی تو اس سے اتر پڑے اور غلام سے کہا کہ اس کو قربانی کے جانوروں میں داخل کردو۔

زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو خود صاحب شریعۃ علیہ السلام والتحیۃ نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ چھانٹ چھانٹ کر سب سے اچھا مال نہ وصول کیا کریں مگر دینے والوں کا جو حال تھا اس کا آج کے کسی معاشیات والے تصور بھی کیا کرسکتے ہیں کہ وہ اپنا بہتر سے بہتر مال ہی اس ٹیکس میں دینے پر اصرار کرتے تھے۔ کسی صحابی نے اپنا بہترین اونٹ زکوٰۃ میں دینا چاہا تو محصل نے انکار کردیا لیکن ان صحابی نے نہایت منت وسماجت کی اور کہا کہ میں خود بالکل اپنی خواہش وخوشی سے دے رہا ہوں آپ اس کو بیت المال میں داخل کردیں۔

کسب کے بجائے انفاق پر اس حرص واصرار کا راز

ایک ہی تھا کہ نظر سے خدا اور آخرت کا خیال کسی معاملہ میں اوجھل نہ ہوتا تھا۔ مدینہ طیبہ میں جب مسجد کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین حاصل کرنا اور اس کی قیمت ادا کرنا چاہی تو حضرات انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے یہی جواب دیا کہ "ہم اس کی قیمت صرف اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں"۔ آج بھی جن کی نظر اس قیمت پر ہے ان کا رنگ یہی ہے۔

سلسلۂ تجدید کی کتابوں کی اشاعت وفروخت اور ان کے لئے دوڑ دھوپ حساب وکتاب اور امانت کی خدمت پاکستان کے جن بزرگ دوست نے سب سے زیادہ کی ان سے میں نے لاکھ اصرار کیا کہ کمیشن قبول کرلیں جس کی

تعداد سینکڑوں تک جاتی تھی مگر ان کا جواب بار بار اس قسم کا آتا رہا کہ اس کو میری آخرت کے لئے رہنے دیں، آخر مجھی کو ہار ماننا پڑی

دین و اسلام کی قیمت و حقیقت خدا و آخرت پر نظر کے سوا آخر اور رہے ہی کیا۔ اس لئے اسلامی معاشیات میں نہ جاگیردار و زمیندار ہونا جرم ہو سکتا ہے نہ سرمایہ دار و مالدار ہونا۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو وہ جس محنت و مشقت سے مال و دولت پیدا کرے گا اس سے بہت زیادہ جوش و خروش اور خود اپنی خوشی و اختیار سے اس کو نیک راہوں میں لٹاتا اور خرچ کرتا رہیگا تو پھر حکومت و ریاست کو جاگیرداری و سرمایہ داری کو زور و جبر سے مٹانے کے لئے خود اس زور و جبر پر کروڑوں کا سرمایہ صرف کرنے کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے اس کا کام تو اپنا سارا زور دنیا طلبی اور خدا فراموشی کو مٹانے پر لگا دینا ہے پھر تو مال یا دنیا جتنی بھی ہوگی سب عین دین بن کر رہیگی، فقراء صحابہ نے اغنیاء صحابہ کے جب اس فضل کو محسوس کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمایا کہ پھر یہ تو خدا کی دین شے ہے۔ اور خود بڑے بڑے صحابہ میں کیسے بڑے بڑے سرمایہ دار و مالدار موجود تھے اس کا اندازہ بھی التجارۃ فی الاسلام ہی سے منقول چند واقعات سے لگالیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ نے وفات کے وقت ایک ہزار اونٹ، تین ہزار بکریاں، سو گھوڑے اور لاکھوں اشرفیاں چھوڑیں مگر ساتھ ہی وصیت فرمائی کہ پانچ ہزار اشرفیاں خدا کی راہ میں خرچ ہوں، باقی زندگی میں تو ہزاروں اونٹ گھوڑے اور نقد

---

[۱] باب الذکر بعد الصلوٰۃ۔ مشکوٰۃ شریف [۲] از مولوی عبدالقیوم سلمہٗ

اسلام کی خدمت و حفاظت میں لگانے ہی رہے ۔

حضرت ابو طلحہ رض نے اپنی زمین یا زمینداری کا ایک حصہ حضرت عثمان غنی رض کے ہاتھ سات لاکھ درہم میں فروخت کیا اور ایک ہی رات میں تقسیم کر دیا۔ اس پر بھی بائیس لاکھ درہم دو لاکھ دینار (اشرفیاں) اور تین کروڑ درہم کی جائداد چھوڑی ۔

حضرت زبیر کی چار بیبیوں میں سے ہر ایک کے حصہ میں گیارہ گیارہ لاکھ درہم ترکہ میں آئے اور یہ حصہ شرعی تقسیم کی رو سے پورے ترکہ کا صرف تبیسواں تبیسواں جزء تھا۔ باون لاکھ کی جائداد چھوڑی ۔ ایک مکان چھ لاکھ درہم میں بکا۔

حضرت سعد بن وقاص رض کے صرف نقد کی زکوٰۃ پانچ ہزار درہم نکلتی تھی ۔ اور ڈھائی لاکھ نقد چھوڑے [۱]

حضرت عبداللہ بن مسعود رض کا صرف نقد ترکہ ۹۰ ہزار درہم تھا

بس اسلامی معاشیات یہی ہے کہ ایک طرف حلال و حرام کی تمیز کے ساتھ لوگوں کے لئے اپنی اپنی صلاحیتوں کے موافق آزادانہ کسب کی تمام راہیں کھلی ہوں اور وہ ان صلاحیتوں سے پورے ذوق و شوق کے ساتھ کام لے سکیں ، دوسری طرف کسب سے بھی بڑھ چڑھ کر خدا و آخرت کے لئے انفاق پہ حریص ہوں اسی کا نام وہ انفاقی ذہنیت ہے جس کا اسلام اپنے پیروں

---

[۱] آج بھی بنانے والے اپنی سرمایہ داری کو دین ہی کا سرمایہ بنا رہے ہیں کراچی میں مولانا ابن موسیٰ میاں سلمہ کے یہاں دو ہفتہ سے زائد قیام میں اس کی ایک متوازن جھلک نظر آئی دین و دنیا دونوں کے ماشاء اللہ بڑے دولتمند ہیں اور دونوں کی دولتمندی کا اندازہ اس ایک ہی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ۲۵،۲ ہزار سالانہ صرف زکوٰۃ ادا فرماتے ہیں ۔

سے مطالبہ کرتا ہے اس کے بعد قومی ملکیت کا نام لے کر نہ انفرادی کسب و ملکیت کو قدم قدم پر غیر فطری زنجیروں میں جکڑنے کی حاجت رہتی ہے اور نہ انسان کی اصلی انسانیت، اختیاری و خلافتی فطرت کا گلا گھونٹنے کی۔ بلکہ اس کی تربیت و تکمیل کے لئے افراد کو ہر سمت میں کھلی فضا میسر آسکتی ہے اور ہر شخص کو اپنی شخصیت PERSONALITY کے ارتقاء و تحقق کے لئے بے روک ٹوک مساوی مواقع مل سکتے ہیں اور اشتراکیت و سرمایہ داری سب کے مفاسد آپ اپنی موت مر جاتے ہیں۔

معاشیاتِ ایمان

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ الآیۃ (حجرات ع ۲)

یہ گنوار لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہہ دو کہ (نہیں ابھی ٹھیک طور پر) تم ایمان نہیں لائے ہو البتہ یہ کہو کہ (انکار و بغاوت چھوڑ کر) ہم اسلام لے آئے (یعنی اطاعت قبول کرلی ہے) کیونکہ (جس کا نام ایمان ہے) وہ ابھی تمہارے دلوں میں اترا نہیں۔

عام ایمان

دین اور دینداری یا مذہبیت اور مذہبی زندگی کا ایک درجہ تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی جس اور جیسے مذہب کے گھر گھرانے، معاشرہ یا ماحول میں پیدا ہوتا ہے فضا کے خارجی اثر سے اس مذہب کی روایات و اعمال اور رسوم و عادات کو کچھ نہ کچھ قبول و اختیار کرلیتا ہے اور جن عقائد و ایمانیات پر یہ اعمال و رسوم مبنی ہوتے ہیں ان کو گویا ضمنی طور پر مانتا رہتا ہے یا کم از کم صراحۃً انکار بہرحال نہیں کرتا ہم عام نسلی مسلمانوں کے اسلام و ایمان کی نوعیت یہی ہوتی ہے اسی طرح کسی ملک و معاشرہ میں کسی مذہب یا مذہبی تحریک کے غلبہ پا جانے سے جو لوگ دوسروں کی دیکھا دیکھی اس میں داخل ہوجاتے

ہیں اور اس کی عبادتوں وغیرہ کی پیروی کرنے لگتے ہیں ان کی حیثیت بھی خارجی اثر و تاثر ہی کی ہوتی ہے جیسی کہ فتح مکہ کے بعد عام عربوں کے قبول اسلام کی تھی مندرجہ صدر آیت میں اسلام کی اصطلاح کو اسی مفہوم میں استعمال فرمایا گیا ہے ایسے مسلمانوں کے دلوں میں شعوری طور پر ایمانیات کا ادراک و قبول تعلیم و تربیت کے ذریعہ پیدا یا داخل کیا جا سکتا ہے، اور ان کو "راسخ الایمان" بنایا جا سکتا ہے۔

داخل القلب ایمان

اس کے برخلاف دوسری صورت ان لوگوں کی ہے جن کے اندر دعوت و تبلیغ یا کوئی خاص تاثیر و تاثر پہلے پہل ہی ایسا زبردست ایمانی یعنی ذہنی و فکری انقلاب برپا کر دیتا ہے جس کے قبول کرنے میں آدمی بار رہا یکہ و تنہا بے یار و مددگار ہوتا ہے پھر بھی یہ قلبی و ذہنی انقلاب بجائے خود اتنا قوی و قاہر ہوتا ہے کہ ماحول و معاشرہ کی شدید سے شدید مخالفت و عداوت سے بھی مغلوب و متاثر نہیں ہوتا۔ مکی دور میں ایمانی سبقت کرنے والے سابقین اولین کے ایمان کی نوعیت یہی تھی۔ یہ ایمان اتنا راسخ و مضبوط ہوتا ہے کہ اپنے خلاف نسلاً بعد نسل کی راسخ فکری و عملی زندگی کو اس طرح دفعۃً بے دخل کر دیتا ہے جس طرح زبردست آندھی بڑے بڑے تناور درختوں کو دم کی دم میں اکھاڑ پھینکتی ہے اکابر صحابہ کی جاہلی زندگی میں یکایک کایا پلٹ ہو کر جس طرح وہ سراپا اسلامی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی تھی، یہ کرشمہ ان کے دلوں میں ایمان کے گھر کر جانے یا قلوب میں داخل ہو جانے والے قلبی انقلاب اور ذہنی و فکری کایا پلٹ ہی کا تھا جو نسلی مسلمانوں کو نسلاً بعد نسل کی ایمانی وراثت و روایت سے بھی نصیب نہیں ہوتا۔

اس انقلاب کے انفرادی کرشمے چھوٹے بڑے یوں بھی کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ حیدرآباد میں ایک بڑے پائیگاہی (شاہی خاندان) کے نواب نہ معلوم کب سے شراب کے اتنے عادی کہ دن رات نشہ سے چور رہتے تھے اچانک ان کے قلب کی کایا کچھ ایسی پلٹی کہ ایکدم توبہ کرلی یعنی خدا کی طرف پلٹ گئے جو توبہ کی لفظی و معنوی حقیقت ہے، سُنا کہ ڈاکٹروں نے لاکھ سمجھایا ڈرایا کہ اس طرح دفعۃً چھوڑ دینے سے مرجائیگا۔ مگر انھوں نے ایک نہ مانی اسی حال میں حج کی تیاری کردی اور قلب میں داخل ہوجانے والے ایمان کی توبہ نے ان کو اتنا پاک کردیا تھا کہ ارضِ پاک (مدینۃ النبی ؐ) نے ہمیشہ کے لئے ان کو اپنے سینہ میں داخل کرلیا۔

مکتوب القلب ایمان

سورۂ مجادلہ کے آخر میں اسی قلب میں داخل ہوجانے والے ایمان کو قلب میں لکھدینے یا ثبت کردینے سے تعبیر فرمایا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے باپ بیٹوں، بھائیوں، کنبہ، قبیلہ تک کا دین کے معاملہ میں دوست نہیں رہتا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ۔ موقع کے لحاظ سے اسلام و ایمان کے اس فرق کی کچھ تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ اوپر کے ابواب میں رزق و معاش سے متعلق جو بحثیں گذری ہیں۔ ان کا تعلق زیادہ تر ایسے ہی اسلام سے ہے جس میں

ایمان دل میں اتنا جاگزیں نہیں کہ اسلامی تعلیمات کو محض خدا اور رسول یا کتاب و سنت پر بے چون و چرا ایمان کی دولت و قوت سے قبول کر لیا جائے قلب میں داخل ہو جانے والے ایمان کی شان تو بس اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا ہوتی ہے اس کو اسلامی زندگی کی کسی راہ پر لگنے لگانے کے لئے عقلی یا کلامی رنگ کی لمبی چوڑی باتوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی، خدا اور رسول کے کسی امر و نہی کو قبول کرنے کے لئے اس داخلی ایمان کی طاقت بجائے خود اتنی زبردست ہوتی ہے کہ کسی خارجی تائید و توثیق کی حاجت قطعاً نہیں رہتی۔

اس لئے خیال ہوا کہ مجدد وقت کی اس "داخل القلب" ایمان والی کچھ معاشی تجدیدات و اصلاحات کو ایک مستقل و مفصل باب میں "معاشیات ایمان" کے عنوان سے الگ پیش کر دیا جائے اس طرح معاش کی یہ بوقت واحد "اسلامی و ایمانی" تجدیدات انشاء اللہ ایک طرف خارجی اسلام والوں کے لئے داخل ایمان کی طرف دعوت کا اور دوسری طرف تھوڑا بہت داخلی ایمان رکھنے والوں کے لئے مزید حلاوت ایمان کا سامان ہوں گی۔

باتونی ایمان

اپنا حال تو مدت سے بلا مبالغہ یہ ہے کہ ایمان کی جو حلاوت و تازگی حضرت علیہ الرحمۃ کی چیزوں کو پڑھنے میں نصیب ہوتی ہے اس کے مقابل میں کیا کہوں کہ زبان و قلم کے بڑے بڑے مشاہیر کی اسلام اور اسلامی مسائل پر تقریروں، تحریروں سے دماغ تو وقتی طور پر کچھ مرعوب و متاثر ہو جاتا ہے لیکن دل ویران کا ویران ہی رہتا ہے زبان و قلم کی ان خدمات کی بجائے خود نافعیت سے حاشا وکلا انکار نہیں۔ بلکہ وقت کے فتنوں اور تقاضوں کو دیکھتے ہوئے وَلَمَّا یَدْخُلِ

الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ والوں کی زبان سے اَسْلَمْنَا کہلاتے رہنا بھی بڑی اور بہت بڑی خدمت ہے تاہم کوئی دینی و معادی کیا اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی دنیوی و معاشی انقلاب بھی اس وقت تک برپا نہیں ہو سکتا جبتک داخل القلب ایمان والوں کی ایک معتدبہ جماعت خصوصاً علمائے امت اور رہبرانِ ملت میں پیدا اور کھڑی نہ ہو، خشک باتونی یا کلامی اسلام سے قلب میں داخل ہو جانے یا دل میں اتر جانے والے ایمان کے وہ آثار و ثمرات رونما نہیں ہو سکتے جو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کی زندگیوں اور کارناموں میں ہم پڑھتے ہیں اور زیادہ تر خالی زبان و قلم سے ان کی داد دیتے رہتے ہیں۔

دماغ سے زیادہ دل کی تواضع

بہرحال آئندہ صفحات میں خود حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ کے ارشادات و اقتباسات زیادہ ملیں گے اور ان سے پڑھنے والوں کی دماغ کے ساتھ دل کی تواضع زیادہ مقصود ہوگی، یوں تو اسلام اور اسلامی زندگی کے اکثر شعبوں کی ضروری اصلاحات و تجدیدات پر حضرت سے مستقل کتابیں اور رسائل بھی تحریر فرماتے ہیں۔ ورنہ حضرت کا سارا تحریری و تقریری سرمایہ دراصل تمامتر اصلاحی و تجدیدی ذخیرہ ہی ہے اور بہت زیادہ یہ ذخیرہ ہزاروں صفحات کے مواعظ و ملفوظات اور تربیۃ السالک میں پھیلا ہوا ہے، معاشی اصلاحات و تجدیدات زیادہ تر مختلف مواعظ میں ملتی ہیں۔ خصوصاً احکام المال، خیر المال للرجال، مظاہر الاموال، افناء المحبوب اور اشرف العلوم وغیرہ میں علم معاش کی مختصر سے مختصر تعریف چونکہ علم المال سے کی گئی ہے اس لئے پہلے ایک بسوط

وعظ احکام المال ہی کے نام سے لیجئے، اس مال سے متعلق معاشیات کے دو بنیادی مسئلوں۔ کسب مال و انفاق مال۔ پر گفتگو ہے ارشاد ہے کہ مال میں دو ہی تصرف ہیں ایک اس کا حاصل کرنا، دوسرے اس کا صرف کرنا اسی کو زیادہ روزمرہ کی زبان میں آمد و خرچ سے تعبیر فرمایا ہے۔

باطل خوری

اوپر معاشیات انفاق کے مستقل باب میں مفصل طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ عام معاشی زندگی خصوصًا جدید معاشی رجحانات کے برعکس اسلام کی معاشی تعلیمات کا سب سے عجیب و غریب انوکھا پہلو یہ ہے کہ وہ کسب کے بجائے اصل میں عدم کسب کی معاشیات ہے، یعنی کسب کی بہت سی راہوں کو وہ بند کرتا اور حصول دولت کی بیسیوں صورتوں کو ممنوع و حرام قرار دیتا ہے قرآن مجید کی کلی اصطلاح و تعبیر ان کے لئے "اکل بالباطل" یا باطل خوری کی ہے اس باطل خوری کی حرمت و ممانعت کا جن آیات میں حکم ہے ان ہی میں سے ذیل کی یہ پہلی آیت احکام المال کا عنوان ہے کہ

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ ع ۲۳)	آپس میں اپنے مالوں کو باطل طور پر مت کھاؤ اور ان کے (جھوٹے مقدمے) حکام کے پاس اس غرض سے نہ لیجاؤ کہ لوگوں کا کچھ مال ناجائز طریقہ سے ہڑپ کر جاؤ درآنحالیکہ تم (اپنے جھوٹ کو) جانتے ہو۔

زراعت، تجارت، صنعت و حرفت کے جو عام و جائز ذرائع کسب ہیں

ان میں سے بھی جو کثیر صورتیں اسلام نے ناجائز یا باطل ٹھہرا دی ہیں ان سے بچنے والے تو اب اچھے اچھے روزہ نماز والوں میں بھی کم ملتے ہیں موجودہ قوانین در قوانین کی پیچیدگیوں عدالتوں پر عدالتوں کی کثرتوں اور پیشہ ور وکیلوں کی بدولت جھوٹی مقدمہ بازیوں اور انصاف کے نام سے طرح طرح کی ظلم رانیوں نے باطل خوریوں کے جو بے شمار دروازے کھول دیئے ہیں اور جن کی تاریخ میں کوئی مثال معلوم نہیں ان کو دیکھ کر اب سمجھ میں آتا ہے کہ باطل خوری کے ذیل میں خصوصیت کے ساتھ مقدمہ بازیوں سے کیوں روکا گیا ہے۔

باطل خوری کی چوریاں

باقی مجدد وقت کی تجدیدی نظر نے باطل خوری کی جیسی جیسی چوریوں کو پکڑا ہے ان کا تو سرے سے باطل ہونا ہی بڑے بڑے اتقیاء وصلحاء تک کی نظروں میں عملاً باطل ہو چکا ہے، مثلاً کتنوں کا تقویٰ اس کو خاطر میں بھی لاتا ہوگا کہ ریل میں جتنا سامان بلا محصول لیجانے کی اجازت ہے اس سے زیادہ بے تکلف نہ لیجاتے ہوں، یا ڈاک میں جتنے وزن کی اجازت ہے اس سے ماشہ دو ماشہ بڑھ جانے کو بڑے سے بڑا متقی بھی باطل خوری جانتا ہو۔ لیکن آگے اسی آیت کے بیان میں حضرت کی اصلاحی و تجدیدی نگاہ سے دیکھئے کہ اسلام نے اپنے پیرؤں کو باطل خوری سے کتنا بچایا ہے اور ہم مسلمان دن رات کیسی کیسی بے احتیاطیاں اس معاملہ میں بے دھڑک کرتے رہتے ہیں۔

"ریل میں ان بے احتیاطیوں کا مشاہدہ ہوتا ہے اس طرف توجہ ہی نہیں کہ مقررہ تعداد سے زیادہ اسباب لیجانا چاہیئے یا

نہیں، بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کفار کا قانون ماننا ضروری تھوڑا ہی ہے۔ مگر خوب سمجھ لیجئے کہ یہ کوئی قانون ملکی نہیں جو یہ عذر کیا جائے بلکہ یہ قانون اجارات کے متعلق ہے اگر بحیثیتِ سلطنت اس کا ماننا ضروری بھی نہ ہو تو اجارہ کی حیثیت سے ماننا ضروری ہے کیونکہ شرائط اجارہ میں سلطنت اور غیر سلطنت برابر ہیں جن شرطوں پر اجارہ قرار پائے ان شرطوں کو ماننا واجب ہے ..... جب قانون مقرر کر دیا کہ مثلاً پندرہ سیر سے زیادہ کسی کو اسباب بلا کرایہ لے جانے کی اجازت نہیں تو اگر تھوڑا بھی اس سے زیادہ ہوگا تو بوجہ اس کے کہ غیر کی حق تلفی ہے ہرگز جائز نہ ہوگا

"بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ کفار کا مال ہے چاہے جس طرح تصرف کرو، یہ غلطی ہے بعض لوگوں نے یہ وجہ بھی گھڑلی ہے کہ بہت سے حقوق ہمارے گورنمنٹ کے ذمہ رہ گئے ہیں ہمیں جائز ہے کہ ان کو خفیہ طور سے وصول کر لیں اول تو ساری ریلیں گورنمنٹ کی نہیں بہت سی کمپنی کی ہیں۔ دوسرے اگر ساری گورنمنٹ کی ہوں تو کیا ہر شخص کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے اور جن کے حقوق ہوں بھی تو کیا اس کا حساب ان کے پاس ہے کہ کتنے حق ان کے گورنمنٹ کے ذمہ ہیں اور کتنے گورنمنٹ کے ان کے ذمہ، یہ سب تاویلیں ہیں۔

ایسا ہی تقوے اور احتیاط کا مقتضاء تو یہ ہے کہ اگر ثابت بھی ہو جائے کہ اس کا حق گورنمنٹ کے ذمہ ہے تب بھی

حفاظتِ نفس کا مقتضا یہی ہے کہ ایسا نہ کیا جائے کیونکہ نفس کو جیسی عادت ڈالی جائے ویسے ہی پڑجائے گی اگر اس کی عادت ڈالی گئی تو اس کا خوگر ہو جائے گا۔ اور آئندہ حد سے تجاوز کرے گا اور جہاں قطعاً جائز نہ ہو گا وہاں بھی اس عادت پر کاربند ہو گا نفس کو تو ذرا سا بہانہ چاہیئے۔

محض تعلیم نہیں عمل

یہ اصلاحی تعلیم حضرت کی محض تعلیم ہی نہ تھی نہایت شدت سے اس پر عمل بھی تھا آگے ہی فرماتے ہیں کہ:۔

"گو ہمارے حقوق بھی گورنمنٹ کے ذمہ ہوں تب بھی (احتیاط اس میں ہے کہ) ایسا نہ کریں میرے پاس کثرت سے ایسے خطوط آتے ہیں جن پر یا تو ڈاک خانہ کی مہر ہی نہیں ہوتی یا ٹکٹ سے بچی ہوتی ہے اگر میری نیت بری ہو تو ان ٹکٹوں سے منتفع ہو سکتا ہوں کہ دوسرے خطوں پر لگا کر بھیجدوں مگر شریعت اس کی اجازت نہیں دی ہے بس ایسے ٹکٹوں کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔"

معادی ذہنیت

انسان فطرۃً مال کا جیسا حریص ہے اور باطل خودی کے مواقع جیسے قدم قدم پر ملتے رہتے ہیں ان سے رکنا جب ہی ممکن ہے کہ معاشی زندگی کے منافع و مفاد کے ہر قدم پر معادی منافع و مضار یا خدا و آخرت کا خوف و خیال ساتھ ساتھ لگا ہو، جب تک یہ معادی ذہنیت خدا کی اطاعت

کی نہ پیدا ہو، محض نام کی اسلامی حکومت بھی اپنی رعایا یا شہریوں میں باطل خوری کو نہیں روک سکتی۔ بخلاف اس کے معاوی ذہنیت غیر اسلامی حکومت اور غیر مسلموں تک سے معاملات میں اپنے مالی و معاشی منافع و فوائد سے قطع نظر کر کے جس طرح اندھیرے اجالے ہر چھوٹی بڑی باطل خوری سے بچا سکتی ہے، اس کا اندازہ بھی حضرت ہی کے ایک مشہور واقعہ سے کیجئے جو احکام المال ہی میں آگے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ :۔

ایک دفعہ میں سہارنپور سے کانپور جا رہا تھا۔ سہارنپور سے پونڈے ساتھ لیجانے کو خریدے جو وزن میں زیادہ تھے ان کو تلوانا چاہا۔ ریل کے بابو نے کہا کہ تھوڑے تو ہیں لے بھی جاؤ میں نے کہا یوں تو آپ کی اجازت معتبر نہیں اور پھر اگر راستہ میں کوئی تولنے لگے؟ بولے میں گارڈ سے کہدوں گا میں نے کہا یہ گارڈ کہاں تک جائیگا کہا غازی آباد تک، میں نے کہا آگے کیا ہوگا؟ کہا یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہدیگا اور وہ کلکتہ تک جاتے گا اور کانپور راستہ ہی میں پڑے گا میں نے کہا کہ کانپور کے بعد کیا ہوگا؟ اس نے کہا آگے تو آپ کو جانا نہیں[1]۔"

حکیمانہ تبلیغ

اب حضرت حکیم الامت کا جواب سنیئے، جس کی طرف

---

[1] اس کا مقابلہ اسلامی حکومت کا دعویٰ لے کر اٹھنے والے پاکستان کے ایک ہائی کمشنر کے متعلق ۲۶ر اگست ۵۲ء کی اس اخباری خبر سے کریں کہ فلاں صاحب پر جو ابھی تک ہندوستان کے مدار المہام دہائی کمشنر تھے کسٹم کی عدالت نے سات روپیہ جرمانہ کیا ہے الزام یہ ہے کہ انھوں نے ایکہزار کی مالیت کا کپڑا دوائیں اور سنگار کی چیزیں ناجائز طور پر ہندوستان سے پاکستان لانے کی کوشش کی تھی"

اس حکیمانہ گفتگو سے اصل میں خود بابو کو متوجہ فرمانا تھا، فرمایا کہ "ابھی سفر ختم نہیں ہوا۔ آخرت کا سفر باقی ہے اگر وہاں پکڑ ہوئی تو کیا ہوگا؟۔ کسی اور سلسلہ میں اس واقعہ کے ذکر میں پڑھا کہ یہ جواب سن کر اسٹیشن کے غیر مسلم بابوؤں وغیرہ کی آنکھیں کھل گئیں کہ مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں۔ آگے ارشاد ہے کہ:۔

میں یہ واقعہ بیان نہ کرتا کہ کوئی کہے اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں مگر میری غرض یہ ہے کہ واقعات سننے سے قلوب میں اثر خوب ہوتا ہے ورنہ میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ شخص ہوں، پھر بھی الحمدللہ اس کا خیال ہے تو جو متقی و پرہیزگار ہیں وہ کیوں نہ خیال کریں گے"

اہل علم کی بے عملی

لیکن اب ایسے متقی و پرہیزگار عوام میں کیا علما و خواص میں بھی چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے کتنے ملتے ہیں، ملتے بھی ہیں تو دین کی بڑی بڑی درسگاہوں میں ایسے علم دین حاصل کرنے والے کہ کسی سفر میں حضرت ڈیوڑھے میں تھے تو کوئی عقیدتمند جو تیسرے میں سفر کر رہے تھے حضرت کی خدمت میں دو ایک اسٹیشن تک آبیٹھے، جب اتر کر اپنے درجہ میں جانے لگے تو حضرت نے فرمایا کہ:۔

تم نے اتنی مسافت درمیانہ درجہ میں قطع کی ہے اور تمہارا ٹکٹ تیسرے کا ہے تم اس (زائد کرایہ) کو ادا کر دینا اور آسان ترکیب یہ ہے اتنی مسافت کا جس قدر کرایہ درمیانہ درجہ کا تیسرے درجہ سے زائد ہے اس کا ٹکٹ اسی لائن کا خرید کر چاک کر دینا بس ادا ہو جائیگا

اس پر وہ علم دین کے طالب علم صاحب جو حضرت ہی کے درجہ میں تھے، دیکھئے

اپنی منطق کے زور سے "علم دین" ہی سے کیا کام لیتے ہیں؟ کہنے لگے۔
"اس کی کوئی ضرورت نہیں، فقہ کا مسئلہ ہے کہ منافع غصب مغصوب نہیں ہوتے (یعنی ان پر ضمان یا تاوان عائد نہیں ہوتا) مثلاً کوئی شخص کسی کے گھوڑے پر زبردستی سوار ہو کر چلا جاتے تو اس کا کرایہ نہ دینا پڑے گا۔ ہاں اگر مغصوب عین ہو اور اس کو تلف کر دے تو ضمان (تاوان) لازم آتا ہے"
اب حضرت فرماتے ہیں کہ

بے عملی کا فتویٰ

ان کی یہ بات سن کر مجھ کو حیرت ہو گئی کہ جب اہل علم ہی ایسے فتوے دیں گے تو عوام کی کیا حالت ہو گی ایسے ہی لوگ فقہ کو بدنام کرتے ہیں۔ اب جو فقہ ہی کا قائل نہیں اس سے تو ہماری گفتگو نہیں، اور جو قائل ہے وہ خود فقہ کی کتابیں کھول کر دیکھ لے کہ فقہاء کا اس سے کیا مقصود ہے؟
اصل یہ ہے کہ اس موقعہ پر دو مسئلے جدا جدا ہیں ایک یہ کہ منافع مغصوب کے تلف کرنے کا گناہ ہو گا یا نہیں؟ اور ایک یہ کہ اس پر ضمان لازم آئے گا یا نہیں؟ تو فقہاء گناہ کی نفی نہیں کرتے صرف ضمان کی نفی کرتے ہیں، یعنی یہ نہیں کہتے کہ گناہ نہیں ہو گا، گناہ ضرور ہو گا لیکن ضمان نہیں لازم آئے گا۔" (ص ۱۰)

لما یدخل الایمان فی قلوبکم کا نتیجہ

ان دو جدا جدا مسئلوں کا جدا جدا نظر نہ آنا درحقیقت نتیجہ ہے خدا

و آخرت پر نظر نہ رہنا یہ نتیجہ درحقیقت وہی وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ والے اسلام کا ہے جب تک قلب میں ایمان داخل ہو کر زندگی کے سارے اعمال و افعال میں خدا کی رضاء و ناراضی یا آخرت کی فلاح و بربادی پر نظر نہ ہو۔ اسی وقت تک گدھے کی پیٹھ پر خالی دین کی کتابیں لاد دیتے سے نہ گناہ و ثواب کا صحیح تصور دل میں جگہ پاتا ہے اور نہ صحیح دین یا دینی زندگی پیدا ہوتی ہے ؎

علم را بر تن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود

ایمان جب دل میں گھر کر لیتا ہے

تب ہی زندگی کی دوسری سرگرمیوں کی طرح مال و معاش کے کسب و حصول میں بھی قدم قدم پر گناہ و ثواب طاعت و معصیت کا سوال چونکاتا اور مالی و معاشی منافع و فوائد کے بہت سے ایسے وسائل و ذرائع سے روکتا رہتا ہے جو ایمانی تقاضوں کے منافی ہوتے ہیں، اس طرح اسلام کی معاشیات کسب کی ترغیب کی بجائے اس عدم کسب کی تعلیم بن جاتی ہے، قرآن و حدیث میں کسب کا اگر کسی درجہ میں امر یا اجازت ثابت بھی ہے تو وہ کسب حلال یا ابتغاء فضل کی قید کے ساتھ، جو حقیقت میں حرام و باطل کسب کی بہت سی صورتوں کی ممانعت یا عدم کسب ہی کی تعلیم ہے، ورنہ پھر تو بقول حضرت مجدد ہی کے ڈاکو کا نام کاسب رکھ کر اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ کی حدیث کا مصداق بنایا جا سکتا ہے، [1]

---

[1] علاج الحرص ص۱۸

کسب سے زیادہ حرص

جدید معاشی تصورات کی بنیاد سچ پوچھو تو کسب سے زیادہ حرص پر ہے، اس چیز کو پکڑ کر حضرت نے کسب کے غلط معنی کی اصلاح علاج الحرص نام کے ایک مستقل بیان میں فرمائی ہے جس کا عنوان وہی حدیث ہے جس میں ابن آدم کو مال کا اس درجہ حریص فرمایا گیا ہے کہ اگر اس کے پاس مال کی دو وادیاں بھی بھری ہوں تو تیسری کے لئے ضرور تڑپتا رہیگا اور اس کے پیٹ کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز بھر نہیں سکتی۔

وادی کہتے ہیں اس نشیبی زمین کو جس میں پانی بہتا ہو جیسے ندی نالہ تو اس لفظ میں زیادہ مبالغہ ہے کہ اگر اس کے پاس چاندی سونا اس کثرت سے ہو کہ پانی کی طرح بہتا ہو تب بھی وہ زیادہ کا طالب رہیگا چنانچہ اگر اس کے پاس دو وادیاں بھی ہوں تو تیسری کا طالب ہوگا جس کا مفہوم یہ ہے کہ تین بھی ہوں تو چوتھی کی تلاش میں رہے وقس علیٰ ہذا ۔ (ص ۳)

اور یہ سلسلہ قبر تک جاری رہیگا۔

گفت چشم تنگ دنیا دار را	یا قناعت پر کند یا خاکِ گور

حریصوں کی طلب آزادی وحکومت

لیکن جدید دنیا داروں کی جدت یہ ہے کہ انہوں نے مال و معاش کے اس حرصی کسب و طلب ہی کا نام ترقی رکھ دیا ہے حتیٰ کہ مجدد وقت کی عمیق تجدیدی نگاہ میں تو آج کل آزادی کے نام سے طلب حکومت کے جو فتنے

دنیا میں برپا ہیں ان کی تہ میں براہ راست یا بواسطہ حرصِ مال ہی کار فرما ہے بلکہ حرصِ جاہ بھی۔ اس لئے کہ جو طبقہ حکومت و آزادی کی طلب میں پیش پیش ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی نظر اپنی ذاتی یا زیادہ سے زیادہ بعضوں کی اپنی قومی۔ اور اسلام کا نام لینے والوں تک کی اپنی ہی یا بہت سے بہت مسلمان نام قوم کی / مالی و جاہی حرص یا نام نہاد ترقی کے سوا کسی اور چیز پر ہوتی ہے کونسلوں اور ممبریوں کے کتنے طالب ایسے ملیں گے جن کو روپیہ یا ماہانہ الاؤنس کے نام سے جو کچھ مل جاتا ہے اتنی آمدنی بھی کسی اور راہ سے نہیں ہو سکتی اور عوام کو اکسا کر اور ان کا نام لے لے کر جو نعرے لگائے جاتے ہیں چونکہ ان کی بنیاد زیادہ تر مال و جاہ کے حرص پر ہوتی ہے، ہر شخص اور ہر پارٹی اپنا مطلب پورا کرنا چاہتی ہے اس لئے ان سے امن و امان کے بجائے انفرادی و اجتماعی قومی اور بین الاقوامی لڑائی جھگڑے ہی زیادہ کھڑے رہتے ہیں۔ مال و جاہ کی اس حرص و ہوس کی ذہنیت کے ساتھ

ترقی اسلام کے نام سے کفر کی ترقی

جب رعایا سلطنت کے خواب دیکھے گی دیا لیڈر اس کو دکھلائینگے
تو اس کا نتیجہ بجز ہلاکت کے کچھ نہیں[۱] اور باوجود یکہ اس خواب کا
منشاء محض حرص ہے اور کچھ نہیں مگر یہ لوگ اس کو دین سمجھتے ہیں

---

[۱] (ابھی ۵ ار مئی ۱۹۴۶ء کو مشرقی بنگال (نرائن گنج) میں جو ہولناک فساد ہوا جس میں سینکڑوں جان سے مارے گئے بچوں اور عورتوں تک کو نہ چھوڑا گیا۔ گاؤں کے گاؤں پھونک دیئے گئے یہ سب حکومت کا خواب دیکھنے والے لیڈروں اور سیاسی پارٹیوں ہی کا سیاسی کھیل کہا جاتا ہے!

اور اس کا نام ترقی اسلام رکھا ہے نام کے بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا نتائج و آثار کو دیکھنا چاہئے کہ اس ہوس خام کے نتائج و آثار کیا ہیں۔ اس سے ترقی اسلام کو ہوتی ہے یا کفر کو " (ص ۸)

ترقی کی اس راہ سے اسلام کو ترقی ہوتی ہے یا کفر کو، اس کو دن دوپہر کی روشنی میں آج ہم ہندوستان اور ہندوستان سے بڑھ کر خود پاکستان میں دیکھ سکتے ہیں کہ کفر و انکار فسق و فجور کی جو گرم بازاری اور شریعت اسلام کی جو رسوائی خود اپنوں کے ہاتھوں آج اس خطہ میں ہو رہی ہے وہ شاید ہی کسی کفرستان میں غیروں کے ہاتھوں ہوتی ہو، کیا یہ نتیجہ اس کے سوا کسی اور بات کا ہے کہ جن لوگوں نے اسلام کا نام لے کر پاکستان بنایا ہے ان کے اندر اسلام کے درد سے کہیں زیادہ خود اپنی مالی و جاہی حرص و ہوس کام کر رہی ہے[1] اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ

آج کل کی ترقی کی تعلیم دراصل پریشانی کی معلم ہے

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ آج کل جو لوگ ترقی متعارف کے معلم ہیں وہ درحقیقت (انفرادی و اجتماعی ہر طرح کی) پریشانی کی تعلیم دیتے ہیں کیونکہ جس چیز کا نام انہوں نے ترقی رکھا ہے اس کی حقیقت محض حرص ہے اور جو لوگ ترقی سے مانع ہیں وہ راحت

---

[1] اب مبیضہ کی نظر ثانی کے وقت پاکستان سے بڑھ کر مصر میں مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اسلام کی داعی جماعت اخوان المسلمون کے ساتھ جو کافرانہ سلوک نام کی مسلمان حکومت کی طرف سے ہو رہا ہے وہ اسی کی بنا اس مرض کے سوا کیا ہے کہ حکومت پر قبضہ سے جو مالی و جاہی منافع حاصل ہیں ان میں رخنہ نہ پڑے!

(اور امن وامان) کے معلم ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں شریعت کے موافق چلو اس میں دین و دنیا کی سب راحت ہی راحت ہے، شریعت پر چل کر پریشانی پاس نہیں آسکتی"

حرص تمام پریشانیوں کی جڑ

بہر حال حرص تمام پریشانیوں کی جڑ ہے .... اور ایسا مرض ہے کہ اس کو ام الامراض کہنا چاہئے کیونکہ اس کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں اگر لوگوں میں حرص نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دباتے پھر ان فسادات کی بھی نوبت نہ آئے (نہ انفرادی نہ اجتماعی نہ قومی نہ بین الاقوامی)

بدکاری و بداخلاقی کی جڑ بھی حرص ہی ہے

بدکاری، چوری وغیرہ کا منشا بھی حرص ہی ہے کہیں حرص مالی، کہیں حرص لذات، نیز اخلاق رذیلہ کی جڑ بھی یہی حرص ہی ہے عارفین کا قول ہے کہ تمام اخلاق رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر کا منشا بھی ایک گونہ حرص ہی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ بھی حرص ہی کی ایک فرد ہے کیونکہ تکبر (اپنی بڑائی) طلب جاہ کا نام ہے تو یہ جاہ کی ہوس ہے بلکہ غور کیا جائے تو مال کی بھی حرص ہے طلب جاہ اس واسطے کی جاتی ہے کہ صاحب جاہ کو ضروریات معاش سہولت سے مل جاتی ہیں اس کی حاجتیں آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں جو کام دوسروں کا سیکڑوں کے

خرچ سے ہوتا ہے وہ صاحب جاہ کی زبان ہلنے سے ہو جاتا ہے۔

حرص ہی دراصل تمام گناہوں کا منشا ہے۔

اس لئے صوفیا نے صاحب جاہ کے آداب میں لکھا ہے کہ ایسا شخص اپنے حوائج کو ظاہر نہ کرے کیونکہ اس سے لوگ فکر میں پڑ جاتے ہیں ہر شخص اس کی حاجت کو پورا کرنا چاہیگا... امام غزالی رح نے جاہ کی حقیقت ملک القلوب (دلوں پر قبضہ) لکھی ہے اور ملکِ قلوب سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہمارے کام سہولت سے نکلتے رہیں۔ پس تکبر کا منشاء بھی حرص ہوا اور تکبر تمام رذائل کی جڑ ہے تو حرص منشا ہوا تمام معاصی کا، مشاہدہ ہے کہ نااتفاقی کا منشاء بھی حرص ہے اور تفاخر کا منشا بھی یہی ہے۔ کیونکہ مال و دولت کا دکھلانا جمع مال ہی کے بعد ہو سکتا ہے اور وہ جمع ہوتا ہے حرص سے ..... یہاں سے اس حدیث کا مطلب واضح ہو گیا کہ حُبُّ الدُّنیَا رَأسُ کُلِّ خَطِیْئَةٍ حب دنیا ہی کا نام حرص ہے

(ص ۱۱، ۱۲)

حرص کا نام کسب

عرض یہی کرنا ہے کہ کسب معاش کے جدید رجحانات و تصورات میں جائز و ناجائز، حلال و حرام، حق و ناحق کی تمیز کے بغیر باطل خوریوں کا ہر طرف جو دور دورہ ہے وہ اسلامی معاشیات کی رو سے دیکھا جاتے تو دراصل حرص کا نام کسب یا زندگی کا کافور رکھ دیا گیا ہے اور اس لئے مذکورہ بالا احادیث جسمیں ابن آدم کی انتہائی حرص کو ظاہر فرمایا گیا ہے کہ لَوْ کَانَ لِابْنِ

أَدْ مَرْ وَادِيَاتٍ مِنَ الْمَالِ الخ) اسی کے دوسرے ٹکڑے میں اس حرص کا ایمانی علاج یہ تجویز فرمایا گیا ہے کہ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰی مَنْ تَابَ یعنی جو اس معاملہ میں توبہ سے کام لے گا اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا اس علاج کی تفصیل آگے حکیم الامت رح کی زبان سے سنیں۔

حرص کا علاج نبوی ؐ

توبہ کی حقیقت اور اس کے معنی ہیں توجہ الی اللہ.... اور ظاہر ہے کہ حرص کی حقیقت دنیا کی طرف توجہ اور میلان ہے اب اس توجہ کو دوسری طرف پھیر دیا جائے تو توجہ الی الدنیا باقی نہ رہے گی پھر جس چیز کی طرف توجہ کو پھیر دیا جاتے اگر وہ بھی محبوب ہو تو اس کی طرف توجہ اشد ہو گی اور اس سے توجہ الی الدنیا کا ازالہ بھی قوی ہوگا۔

اب سمجھو کہ حق تعالیٰ سے ہر شخص کو فطری تعلق ہے اور ذات حق کی طرف ہر ایک کو طبعی میلان ہے فقط مسلمان ہی کو نہیں کافر کو بھی کیونکہ انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے تو کسی سبب سے ہوتی ہے وہ اسباب یہ ہیں، حسن و جمال، جود و نوال (سخاوت و بخشش) یا فضل و کمال۔ اور جس میں یہ اسباب قوی ہوں گے اس سے محبت بھی قوی ہوگی، اور معلوم ہے کہ یہ اسباب بالذات حق تعالیٰ ہی میں ہیں دوسری اشیار میں بالعرض ہیں۔ بس یوں کہنا چاہئے کہ محبت و میلان حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہوتا ہے اور دوسری اشیاء کی طرف میلان محض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان میں

صفاتِ حق کا ظل ظاہر ہو رہا ہے "

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی توحید پر ایمان کے معنی ہی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ جتنی صفات کمال ہیں بالذات و براہ راست صرف خدا ہی کی ذات کے لئے ثابت ہیں مخلوقات میں جہاں کہیں جو کچھ بھی جمال و کمال پایا جاتا ہے وہ حق تعالیٰ ہی کی صفات کا عکس و پرتو یا اس کی عطا و دین ہے فقیر کی جھولی میں دو چار پیسے کیا دو چار سو روپئے یا اشرفیاں بھی پائی جائیں تو بھی وہ اپنی ذات میں فقیر ہی ہے اور غنی وہی ہے جس نے فقیر کی جھولی بھری ۔ اس لئے توحید جو انسان کی فطرت ہے اگر اس فطرت کو مسخ نہ کر لیا گیا ہو تو غیر پر نظر بالذات کیسے پڑ سکتی ہے ۔ خامی نظر ہی کی ہے اور دنیا کی

"ان چیزوں پر نظر کا منحصر ہو جانا اسی لئے ہے کہ (جہل و غفلت کی وجہ سے) لوگوں کو خبر ہی نہیں کہ یہ اوصاف کمال حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے اندر ہیں جس وقت یہ معلوم ہو گا کہ حضرت حق ہی محسن اعظم اور وہی حسین و جمیل اور صاحب فضل و کمال ہیں اور مخلوقات میں محض ان کا ظل ہے اس وقت (آپ سے آپ) ہر شخص حق تعالیٰ ہی کی طرف مائل و متوجہ ہو گا، پس حضورؐ کے علاج کا حاصل یہ ہوا کہ اپنی توجہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دو، اور چونکہ حق تعالیٰ سے طبعی تعلق ہے اس لئے یہ توجہ اشد اور اکمل ہو گی ۔ تو جتنی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گی اتنی ہی دنیا سے توجہ ہٹے گی" (ص ۳۹)

جب یہ معلوم ہو گیا کہ مال و دنیا کی حرص و ہوس کا علاج صرف ایک ہی ہے کہ آدمی کی توجہ کا رخ خدا و آخرت کی طرف پھیر جاتے اور توجہ تمام تر قلب کا فعل ہے تو جبتک خدا و آخرت پر ایمان ہمارے قلب میں داخل نہ ہو اس وقت

تک ان کی طرف قلبی توجہ کیسے ہوگی، اس لئے جو لوگ نماز روزہ وغیرہ خالی قالب کے ظاہری اعمال ہی کو دینداری سمجھ لیتے ہیں اور قلب کی اصلاح نہیں کرتے کراتے ان کے اندر دنیا کی حرص و ہوس اور دوسرے بہت سے قلبی و اخلاقی امراض بدستور دوسروں ہی کی طرح باقی رہتے ہیں لہذا جن لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ:۔

خدا طلبی میں غلطی

توجہ الی اللہ یا (خدا طلبی) بس یہ ہے کہ نماز پڑھئے، روزہ رکھئے اور احکام شرعیہ بجا لائیے، ان لوگوں نے محض ظاہری اعمال پر اکتفا کیا۔ یہ لوگ دل یا قلب سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے، پھر وہ سوچتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں پھر بھی اس میں برکت و نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی۔ معصیت کا تقاضا کیوں نہیں مضمحل ہوتا۔ چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہوں میں مبتلا پائیں گے"۔

اسی طرح دوسری طرف بہت سے لوگ اس غلطی میں گرفتار ہیں کہ ظاہری اعمال کو غیر ضروری سمجھ لیا ہے ان کے نزدیک

توجہ الی اللہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو یہ لوگ ذکر و شغل اور مراقبات کو ہی لے بیٹھے، نماز، روزہ، تلاوت اور نظر بد وغیرہ گناہوں سے بچنا چھوڑ دیا مگر ان کو بھی برکت و نورانیت (وہی قلبی ایمان کی کیفیت) حاصل نہ ہوئی کیونکہ ایسے لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہوتے اور دل میں شدید

تقاضا پاتے ہیں۔"

ظاہر کا اثر باطن پر

حالانکہ یہ نہ صرف نفسیاتی مسلمات میں داخل ہے بلکہ روزانہ کا تجربہ ہے کہ ظاہر کا اثر یا ردِ عمل باطن یا قلب پر بھی ہوتا ہے مثلاً تم کسی سے دوستی یا دشمنی کا ظاہری برتاؤ کرو یعنی عملاً اس کے ساتھ وہی معاملہ کرو جو دوست یا دشمن کے ساتھ کرتے ہو تو بالآخر آہستہ آہستہ اس سے قلب بھی متاثر و منفعل ہو کر رہے گا۔ یعنی دل میں بھی اس سے محبت یا نفرت پیدا ہونے لگے گی، اذکار و اشغال کی تدابیر کا مدعا یہی ہے کہ دل میں خدا رس بس جائے اور بظاہر ذاکر و شاغل لوگوں کے دل میں خدا کا دھیان جم بھی جاتا ہے مگر ساتھ ہی خدا کی نافرمانیاں یا معاصی جاری رہتے ہیں۔ بات وہی ہے کہ دل میں تم کسی کا لاکھ دھیان جماتے رہو لیکن عمل و برتاؤ اس سے ناخوشی یا دشمنی کا رکھو، برابر اس کے کہنے کے خلاف کرتے اور چلتے رہو تو یہ دھیان محض اس کے نام و صورت کا ہوگا دل میں اس سے محبت و دوستی کی کیفیت پیدا نہ ہوگی۔ جس طرح کائنات کی دیگر موجودات کا حال ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں قدرت نے ایسی پیوستگی رکھی ہے کہ افعال و آثار میں ظاہر و باطن، جسم و روح، قلب و قالب بھی ایک دوسرے سے ایسے مربوط ہیں کہ نہ قالب بغیر قلب کے درست رہ سکتا ہے اور نہ قلب بلا قالب کے۔ اس حقیقت کو آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ بلا شبہہ:۔

ہر حقیقت کی ایک صورت ہوتی ہے۔

توجہ الی اللہ کی حقیقت تو

یہی ہے کہ خدا کی طرف دل متوجہ ہو، مگر ہر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صحیح صورت وہی ہے جو خود اللہ، یا شریعت نے بتلائی۔ پس دونوں کو جمع کرنا چاہئے کہ دل سے حق تعالیٰ کی طرف توجہ ہو اور ظاہری اعمال شرعیہ کے پابند رہو، طاعات کو بجالاؤ، معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو، نگاہ کو روکو، اور نامحرموں کی باتیں بھی نہ سنو، اس کے بعد بھی قلب کی نورانیت نہ حاصل ہو تو ہم پر ہنسنا، میں وہی کہتا ہوں جو ایک صاحب طریق (عارف رومی) نے کہا ہے کہ ؎

چشم بند ولب بہ بند وگوش بند گر نہ بینی نور حق بر ما بخند

یعنی آنکھ وزبان کان سب کو گناہوں سے بند کر لو، پھر اگر قلب میں خدا کے تعلق کی نورانیت یا وہی "داخل القلب" ایمانی کیفیت پیدا نہ ہو تو جتنا چاہے ہم پر ہنس لینا۔ بہر حال

"اس وقت غلطی یہی ہو رہی ہے کہ بعض تو اعمال ظاہرہ کے تارک ہیں اور بعض اعمال باطنہ کے تارک ہیں اس لئے توجہ الی اللہ کامل طور سے حاصل نہیں ہوتی دونوں کو جمع کرنا چاہئے پھر انشاء اللہ کامیابی ہو کر رہے گی" (ص۲۰م)

غرض آج کل کی کسبی جو در اصل حرص معاشیات ہے، اور جس کی بدولت ہر طرف ہر طرح کے انفرادی واجتماعی فسادات ہی فسادات برپا ہیں اس کا علاج صرف بالضد ہو سکتا ہے کہ دل میں ایمان جاگزیں ہو کر خدا وآخرت یا دین کی طرف پوری پوری توجہ ہو تب ہی دنیا کی حرص وہوس

دور ہو کر کسب معاش یا حصولِ دولت کے طریقوں میں اعتدال و توازن پیدا ہوگا۔ خاتمۂ بیان پر ایک شبہ کا جواب دیا گیا ہے جو حقیقت میں محض حرصی ذہنیت کا پیدا کیا ہوا شبہ ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اس حدیثِ (بالا) سے تو زیادتِ مال کے حرص کی مذمت معلوم ہوتی ہے اور نصِ قرآن سے اجازت معلوم ہوتی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ (یعنی یہ کوئی گناہ کی بات نہیں کہ تم اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرو) یہ آیت (دراصل) احکام حج کے متعلق ہے، جاہلیت میں لوگ حج کو ایک میلہ سمجھتے تھے اس لئے حج کے زمانے میں باہر سے لوگ تجارت کی نیت سے آیا کرتے تھے جب اسلام آیا اور مسلمانوں کو خلوص کی تعلیم دی گئی تو صحابہ کو شبہ ہوا کہ شاید سفرِ حج میں مال تجارت لیجانا خلاف خلوص ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کا رزق جو تفسیر ہے، فضل کی طلب کرو

سفرِ حج میں تجارت

حق تعالیٰ کی بھی کتنی بڑی رحمت ہے کہ خاص اپنے دربار کو آتے ہوتے بھی تجارت کی اجازت دیدی۔ بھلا اگر تم کسی بادشاہ یا ادنیٰ حاکم سے ملنے جاؤ اور ساتھ ہی تجارتی مال بھی لیجاؤ تو اس کو یہ کتنا ناگوار ہوگا اس کے

دل میں تمہاری اس ملاقات کی کچھ وقعت نہ ہوگی بلکہ کان پکڑ کر دربار سے نکال دیگا کہ تم ہم سے ملنے نہیں بلکہ سوداگری کرنے آئے تھے مگر حق تعالیٰ نے اجازت دیدی کہ سفر حج میں تجارت کرنا گناہ نہیں۔" (ص ۳۴)

آگے اس بارے میں حضرت کی دو بڑی فقیہانہ و مجددانہ تفصیلات بہت یاد رکھنے کی ہیں کہ اس آیت سے اصلاً تو صرف اجازت نکلتی ہے ۔

یہ تجارت مستحب بھی ہے

مگر قواعد فقہ سے ایک صورت میں یہ تجارت مستحب بھی ہے جب یہ نیت ہو کہ اس سے رقم بڑھے گی تو سفر حج میں سہولت ہوگی اور فقراء کی بھی امداد کریں گے ۔ رہا یہ امر کہ اس صورت میں خلوص ہوگا یا نہیں اس کے جواب میں تفصیل ہے ۔

وہ یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہے اور تجارت تابع ، جس کی علامت یہ ہے کہ اگر تجارت کا سامان نہ ہوتا تب بھی حج کو ضرور جاتا تو اس صورت میں خلوص محفوظ ہے اور ثواب حج بھی کم نہ ہوگا اور اگر حج و تجارت دونوں کی نیت برابر درجہ میں ہے تو اس صورت میں تجارت جائز تو ہے مگر خلوص کم ہوگا اور جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حج کے ساتھ ایک فعل مباح کو منضم و شریک کیا ہے ۔ اگر تجارت اصل مقصود ہے اور حج تابع ہے تو اس صورت میں گناہ ہوگا اور یہ شخص (مخلص نہیں) ریا کار ہوگا کیونکہ مخلوق کو دھوکہ دے رہا ہے کہ جاتا ہے تجارت

کے لئے اور ظاہر کرتا ہے کہ حج کو جارہا ہوں
رہا یہ کہ اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو تو اس صورت میں مال تجارت لیجانا افضل ہے یا نہ لے جانا تو اگر زادِ راہ بقدر کفایت موجود ہو تو افضل یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ لیجائے کیونکہ اس میں خلوص زیادہ ہے اور اگر زاد راہ بقدر ضرورت ہے بقدر کفایت نہیں اور نیت تجارت تابع تو اس نیت سے کہ سفر میں سہولت و اعانت ہوگی مال تجارت کا لیجانا اس کے لئے موجب ثواب ہے (ص۳۵)

بڑی حکیمانہ تحقیق اور اسلام کا بڑا معاشی کمال

اس فقیہانہ و حکیمانہ تحقیق و تفصیل سے ہم اور بھی بہت سے ایسے معاشی مشاغل کے جواز و اباحت یا استحباب و افضلیت کا فیصلہ کر سکتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح دینی مشاغل کے ساتھ شریک ہوتے ہیں مثلاً آجکل دین و ملت کے بہت سے علمی و قلمی خادم ہیں کہ ان کا ذریعۂ معاش بھی علم و قلم ہی کی خدمات تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف یا اخبار و رسائل ہوتے ہیں اکثر ایسے حضرات دین کی علمی و قلمی خدمات کو بھی بطور پیشہ ہی اختیار کرتے ہیں۔ اگر وہ تحقیق بالا کے تحت اپنے عمل و نیت کی تصحیح کر لیں تو دنیا کے نفع کے ساتھ دین کے گھاٹے سے محفوظ ہی نہیں بلکہ اس کا بھی برابر کا نفع کما سکتے۔ بلکہ تھوڑی سی ہمت کے ساتھ کام لے کر اپنی معاش کو بھی عین معاد بنا سکتے ہیں۔ اسلام کی معاشی تعلیمات کا بڑا کمال یہی ہے کہ آدمی اگر حرص و ہوس کا بندہ نہ بن جائے اور معاش کو معاد کے تابع

یا مزید ہمت کرکے معاد ہی کا ذریعہ بنالے تو دنیا عین دین بنجاتی ہے

جدید معاشی کسب اسلامی کسب کی ضد ہے

اس طرح دیکھا آپ نے کہ اسلام کی معادی معاشیات کا کسب جدید سراسر غیر معادی معاشیات کے اندھا دھند حریصانہ کسب وطلب سے کتنا مختلف بلکہ ضد ہے۔ اسلامی کسب کی یہ صحیح نوعیت وحقیقت سمجھ لینے کے بعد حدیث وآیت میں کوئی اختلاف وتعارض سرے سے رہتا ہی نہیں کیونکہ حدیث میں طلب معاش سے منع نہیں کیا گیا ہے جو مدلول ہے بالا آیت کا بلکہ اس میں انہماک اور زیادتِ حرص سے منع کیا گیا ہے (ص ۳۵) جو لازمی نتیجہ ہے معاشیات وسیاسیات سب کو دین وآخرت سے آزاد اور الگ کرنے کا۔

قرآن نے کسب کے بجائے ابتغاء فضل کی اصطلاح کیوں اختیار کی

دوسری بات زیادہ غور کی یہ ہے کہ قرآن مجید نے مطلق کسب وطلب کے بجائے ابتغاء فضل کی اصطلاح اختیار فرمائی ہے اور خدا کا فضل ظاہر ہے کہ صرف وہی کسب معاش ہوسکتا ہے جو تمام تر خدا کی رضا اور اس کے احکام کے تحت وتابع ہو یعنی

"آیت میں طلب مال کی مطلقاً اجازت نہیں ہے بلکہ اس قید کے ساتھ اجازت ہے کہ وہ ابتغاء فضل کا مصداق ہو اور ابتغاء (طلب) معاش، ابتغاء فضل میں اس وقت داخل ہوسکتا ہے جبکہ اس میں ابتغاء رضا (خدا کی رضا جوئی) بھی ہو جس کا قرینہ

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض جگہ ابتغاء فضل کے ساتھ ذکر اللہ کو
بھی بڑھایا ہے، سورۃ جمعہ میں فرمایا وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ
اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ o
تو یہاں اذکروا اللہ کثیرا کا بڑھانا بتلا رہا ہے کہ طلب معاش
کو ابتغاء فضل جب ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ ذکر اللہ ہو
ورنہ ابتغاء فضل نہیں بلکہ ابتغاء فضول ہے بلکہ طلب نقصان ہے
اور جو شخص طلب معاش میں ابتغاء رضا کر رہا ہے وہ گناہ کا نہیں
بلکہ عین، ثواب کا کام کر رہا ہے اور حدیث میں اسی طلب کی
ممانعت ہے جو اس حد سے متجاوز ہو۔ (ص ۲۵)

گلاب اور پیشاب ملانے کی دانشمندی

یعنی جو خدا کی رضا جوئی سے خالی اور کسب بذات خود ہی مطلوب و مقصود
ہو، اور غیر اسلامی یا غیر معادی معاشیات کی خاص خصوصیت یہی ہے جس کے
بعد دنیا کی اس حریصانہ اور دین کی تحاجویانہ معاشیات میں تطبیق یا ان
کے ملانے کی کوشش گلاب اور پیشاب کو ملانے کی دانشمندی کے سوا
کیا کہی جا سکتی ہے اسلامی معاشیات کو آج کل کی حرصی معاشیات سے
ملانے والوں کو خود اسلام کی کتاب سے لے دے کر سب سے بڑی دلیل یہی
سورۃ جمعہ کی ابتغاء فضل والی آیت ملتی ہے ایک دوسرے بیان اشرف
العلوم میں حضرت اسی آیت پر گفتگو کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

اہل حرص و ہوا کی قرآن فہمی

بعضے اہل ہوا صرف اس آخری ٹکڑے

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ) کو لے لیتے ہیں کہ قرآن میں تلاشِ رزق کا حکم ہے بس رات دن اسی میں مشغول رہنا چاہئے گویا تمام قرآن میں ان کو یہی حکم پسند آیا..... اوپر کی آیات کے احکام وَذَرُوا الْبَیْعَ (تجارت چھوڑدو) اور فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (دوڑو خدا کی یاد کی طرف) تو پسند نہ آئے۔ صرف آخر میں وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ پسند آیا۔ یہ نفس بڑا ہی مطلب کا ہے، انتخاب اعمال میں نفس کا یہی خاصہ ہے ایسے لوگوں کے باب میں شیخ (سعدیؒ) نے کہا ہے۔

زسنت نہ بینی درایشاں اثر — مگر خواب پیشیں ونانِ سحر

یعنی ان کو صرف دو سنتیں پسند آئیں ایک قیلولہ (دوپہر کے کھانے کے بعد سونا) اور سحر کا کھانا۔ ایسے ہی ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس سے پوچھا گیا کہ تم کو احکام میں کیا پسند ہے؟ کہا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا کھاؤ پیو، پھر پوچھا گیا دعاؤں میں کیا پسند ہے کہنے لگا رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ لے رب ہمارے لئے آسمان سے خوان نازل فرمائیے"۔(ص۳۰)

کیا عرض کیا جائے کچھ ایسی ہی پسند جدید معاشیات کے جوڑ پر ہمارے بہت سے اہل علم وقلم کے اسلامی معاشیات پر مقالات ومجلدات تیار کر دینے والوں کی ہے۔

ایک خاصے صاحب علم نے اسلامی معاشیات پر دو جلدوں میں بڑی ضخیم کتاب لکھی ہے جس میں یہاں تک کمال فرما دیا ہے کہ قرآن میں اگر یہ ہے

کہ آخرت میں جنت والوں کا لباس ریشم کا ہوگا تو اس کو دیوی اسلامی معاشیات میں سلک انڈسٹری (ریشم سازی) کی دلیل بنا دیا[1]۔ اسی طرح جنتیوں کا زیور اگر سونے چاندی اور موتیوں کا ہوگا تو یہ خود قرآن سے زیور سازی کی صنعت کی سند ہوگئی۔ حالانکہ شریعت نے ریشم کا استعمال مردوں کے لئے سرے سے حرام کیا ہے، زیور میں صرف چاندی کی انگوٹھی کی اجازت دی ہے اور عورتوں کے لئے بھی ترغیب و تحریص زیور پر زیور لادنے کی اتنی اور اس لئے بہرحال نہیں کہ زیور سازی کے کاروبار کو فروغ دینا مقصود ہو بلکہ عورتوں کے حق میں بھی ناپسندیدگی ہی زیادہ فرمائی گئی ہے اور لیجئے چونکہ اہل جنت کے لئے ایسے تخت اور صوفوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن پر ریشمی قالین اور مخمل کے نہالیچے بچھے ہوں گے اس لئے قرآن اور اسلام قالین بافی اور فرنیچر سازی کا معلم ہوگیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جوتا سازی بھی آج کل کی ایک بہت بڑی صنعت ہے باٹا کا کارخانہ تو گویا تمام دنیا میں مشہور ہے قرآن پاک میں بھی جوتوں کا ذکر ہے، موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے تو انہیں حکم ہوا کہ اپنی جوتیاں اتار کر آؤ۔ بلاشبہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو" لہٰذا باٹا کے کارخانے کھولے جائیں کہ کوہِ طور پر کوئی ننگے پاؤں نہ چلا جاتے، انا للّٰہ۔

غضب پر غضب یہ کہ عاد و ثمود کی جو قرآن کی مشہور و مسلّم مغضوب و معذب قومیں ہیں اور جن کو اس دنیا میں ان کی سرکشیوں اور فساد انگیزیوں

---

[1] حالانکہ متفق علیہ حدیث ہے کہ "دنیا میں ریشم وہی پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں" (یلبس الحریر فی الدنیا من لاخلاق لہ فی الآخرۃ)

کے خمیازہ میں سخت سخت عذاب دیئے گئے اور ان کے بڑے بڑے تعمیری وصنعتی کارنامے کچھ کام نہ آئے بلکہ آج کل کی سائنسی وصنعتی ترقیوں اور ایجادوں کی طرح یہی چیزیں الٹے ان کے طغیان وسرکشی اور بالآخر عذاب وہلاکت کا سبب بن گئیں، سورۂ الفجر میں ان قوموں کے ان ہی کارناموں کا ذکر فرما کر فرمایا کہ آخر کار تمہارا رب ان پر اپنے عذاب کا کوڑا برساکر رہا۔ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ط

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے قوم عاد ارم بڑے بڑے ستونوں والی قوم کے ساتھ کیا کیا، جن کا مثل (اپنے زمانہ کے) شہروں میں پیدا نہ تھا۔ اور (اسی طرح) قوم ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں پہاڑ کے پتھروں کو کاٹ کر (ان سے بڑی بڑی عمارتیں بنا رکھی تھیں) اور میخوں والے فرعون کے ساتھ کہ ان سب نے شہروں میں اودھم مچار کھا تھا (جس کی سزا میں آخر کار) تمہارا رب ان پر عذاب کا کوڑا برسا کر رہا۔ یقیناً تمہارا رب (ایسے فسادیوں کو چھوڑا نہیں کرتا، ان کی گھات میں رہتا ہے (موقع ومصلحت کے موافق سزا دیتا ہے)

آپ دیکھتے ہیں کہ ان آیات کا مطلب اور لب ولہجہ کسی ترغیب

وتحسین کے بجائے کیسی سخت تنبیہ وتہدید کا ہے۔ مگر ہمارے اسلامی معاشیات کے مصنف نے ان ہی آیتوں کو دو تعمیری صنعتوں، کوہ کنی سنگ تراشی اور ستون سازی کے لئے بطور قرآنی تعلیم کے نقل کر دیا ہے اور پھر

"ان چند صنعتوں کا تذکرہ تو بطور مثال کیا گیا ہے۔ ورنہ تلاش سے اور بھی مصنوعات کے متعلق قرآن مجید سے اشارے نکالے جا سکتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں جن مصنوعات کا ذکر ہے اگر ان ہی کو اکٹھا کر لیا جائے تو ایک بڑی لمبی فہرست بن سکتی ہے"

اور حاشیہ پر ایک سرسری فہرست درج بھی ہے جس میں اصنام (بُت)، تماثیل (مجسمے یا اسٹاچو) اور خمر (شراب) تک کی مصنوعات کو گویا قرآنی معاشیات کے اشارات قرار دید یا گیا ہے، اگر قرآن میں کسی چیز کا ذکر واشارہ ہی اس کی تعلیم وتحسین کے لئے کافی ہے تو پھر قرآن میں شیطان وابلیس، فرعون وقارون، شداد وہامان اور ابولہب وابوجہل سب ہی کے بڑے بڑے کارناموں کا ذکر ہے ان سب ہی کی اتباع پر قرآن کو گواہ بنا لیا جا سکتا ہے۔

اسلامی معاشیات کے ایک مصنف کو مخلصانہ مشورہ

قرآن مجید سرے سے نہ معاشیات کی کوئی کتاب ہے، نہ معاشی تعلیم وتحصیل اسلام اور اسلام کی کتاب کا بالذات کوئی موضوع۔ معادیات جو دین و اسلام کا اصل موضوع ہے اس کے ضمن میں بھی معاشی زندگی سے متعلق جو ہدایات آگئی ہیں وہ بجائے خود اسلامی معاشیات کا ایک نظام مرتب کر دینے

اور غیر اسلامی معاشیات کے مقابلہ و موازنہ سے اس کی برتری دکھلانے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ اور ماشاء اللہ خود مصنف نے یہ خدمت اس کتاب میں خاصی کامیابی سے انجام دی ہے مگر خدا جانے گلاب کے قرابے میں پیشاب کے یہ قطرے کیوں ملا دیئے ہ بس وہی مغرب زدہ ذہنی مرعوبیت کہ ہم اپنے دینی تفوق و برتری کے دلائل کو بھی ان ہی کی لادینی منطق کی خراد پر دانستہ یا نادانستہ چڑھا دیتے ہیں کاش کتاب کے آیندہ ایڈیشن کو مصنف ان خرافات بلکہ تحریفات سے پاک کر دیں۔

صریح تحریف

یہ تو درمیان میں ایک ضروری بات نکل آئی کہ ہمارے آجکل کے مشاہیر اہل علم و قلم بھی معاشیات و سیاسیات کی بحثوں میں خصوصًا اسلامی تعلیمات کی برتری ثابت کرنے میں آتنی دور نکل جاتے ہیں کہ بعض مرتبہ کتاب و سنت کی صریح تحریف تک جا پہونچتے ہیں اور اسلام کی معاشی تعلیمات میں ان کو کُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ پیو) ہی زیادہ دکھائی دینے لگتا ہے یعنی دین کو تمام تر دنیا بنا دینا ہی سب سے بڑی دینی خدمت بنا لیتے ہیں، حالانکہ اسلام کی اصل روح اس کے برخلاف دنیا کو سرتاسر دین بنا دینا ہے قرآن مجید نے کسب معاش کے لئے "ابتغاء فضل" کی جو تعبیر اختیار فرمائی ہے دیکھئے کہ مجدد وقت اسی کی تفسیر و تفہیم میں ایک جگہ اسلام کی اسی روح کی کیسی تجدید فرماتے ہیں،

"وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ، میں عجیب بلاغت ہے کہ خالی فضل نہیں فضل اللہ فرمایا یعنی رزق کو رزق سمجھ کر حاصل نہ کرو بلکہ خدا کا فضل سمجھ کر حاصل کرو کہ اس میں خدا سے تعلق ہے، سبحان اللہ کیا تعلیم ہے کہ دنیا طلبی میں بھی (خدا طلبی یا) خدا سے تعلق رکھو محض دنیا کا قصد نہ کرو بلکہ اس کے ساتھ خدا کے تعلق کو ملا لو"

منکرین تصوف کے سننے کی بات

بھلا اس خدا طلب معاش طلبی کا جوڑ عہد جدید کی اس معاشیات سے کہاں تک مل سکتا ہے جس کے خود اکابر کی نظر میں اس عہد کی بڑی خصوصیت دنیا طلبی کا غلبہ ہے[1] - اسی آیت کے ذیل میں حضرت نے عرفان یا تصوف کا جو تجدیدی خلاصہ بیان فرمایا ہے وہ بھی تصوف کے منکرین و معاندین کے لئے خاص طور پر سننے کا ہے کہ

"عارفین (صوفیاء) کی تعلیم کا بھی یہی خلاصہ ہے وہ یہی چاہتے ہیں کہ (دنیا کے) ہر کام میں خدا سے صحیح تعلق باقی رہے اور اسی تعلق کے سبب عارف کو نعمت سے جتنی محبت ہوتی ہے اتنی غیر عارف کو نہیں ہوتی کیونکہ عارف یہ سمجھتا ہے کہ اس (نعمت) کو محبوب سے تعلق ہے اور اسی اصل پر طالب کو شیخ سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ ماں باپ سے بھی نہیں ہوتی ہے[2] کیونکہ وہ موصل الی اللہ ہے اور اسی حیثیت سے عارف کو اپنے ہاتھ پاؤں (یا جسم و جسمانی تعلقات) سے بھی محبت ہوتی ہے اور ان کی بہت حفاظت کرتا ہے جیسے سرکاری مشین کا نوکر مشین کو اس حیثیت سے تیل دیتا ہے کہ وہ سرکار کی چیز ہے خراب ہوئی تو جواب طلب ہوگا"

---

[1] دیکھو اوپر معاشیات و معیشت کی حیثیت کا باب

[2] حضور شیخ المشائخ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرما دیا کہ وہ مومن ہی نہیں جن کو مجھ سے اپنے والد اور اولاد سے بڑھ کر محبت نہ ہو" (او کما قال)

مطلب یہ کہ سچے صوفیا ریا عارفین دنیا کی چیزوں کو بھی دنیا نہیں بلکہ دین یا خدا کے تعلق سے استعمال کرتے ہیں لیکن اس پر دنیا پرست "لطنی فلسفہ" دالے خوش نہ ہوں کہ

اچھا اب ہم بھی یہی سمجھ کر خوب جلوے مانڈے اور مٹھائیاں کھایا کریں گے (یا معاشی معیار بلند کرنے کا شور مچایا کریں گے) تو خوب سمجھ لو کہ یہ بات کہیں محض سمجھنے سے تھوڑا ہی ہوا کرتی ہے بلکہ وہ تو ایک حال ہے کہ یہ سرکاری چیزیں ہیں اور اس حال کا معیار یہ ہے کہ (ہاتھ پاؤں وغیرہ) جوارح نافرمانی میں مشغول نہ ہوں کیونکہ یہ سرکاری چیزیں خلاف قانون استعمال نہیں کی جاتی ہیں تو جب یہ حال ہو جائے تو ایسا شخص جو کچھ کھائے گا وہ عبادت ہے دودھ کھائے وہ بھی عبادت ہے حلوہ کھائے وہ بھی عبادت ہے"

اس لئے کہ اس سے اس جسم یا جسمانی اعضاء و جوارح کی پرورش ہوتی ہے جو معبود کی اطاعت و فرمانبرداری میں کام آئیں - اسی کو کہتے ہیں :-

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — رفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اور انہی اہل معرفت کے لئے حدیث میں ہے کہ

اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی سرمہ لگاتے تھے کیوں؟ اس لئے کہ آنکھ سلامت رہے تاکہ راستہ چل سکیں مسجد میں جماعت کے لئے حاضر ہو سکیں، بیت اللہ کے حج کو جا سکیں" (ص ۳۹)

کوئی تاجر بغداد میں اتنا قیمتی کپڑا لایا کہ خلیفہ نے بھی اس کو خریدنے کی ہمت نہ کی۔

وہاں کوئی بزرگ تھے غالباً حضرت غوث اعظم انہوں نے وہ خرید لیا بادشاہ کو خبر پہنچی تو نہایت ناگوار ہوا وزیر کو حکم دیا کہ شاہ صاحب کو پکڑ لاؤ ہماری اہانت کی جب وزیر شاہ صاحب کے یہاں پہنچا تو دیکھا کہ اس کپڑے کی عبا بیونتی جا رہی ہے اور اس میں ایک کلی کم ہے تو شاہ صاحب نے حکم دیا کہ اچھا ایک کلی ٹاٹ کی لگا دو، یہ حال دیکھ کر وزیر نے خلیفہ سے جا کر کہا کہ جس کی نظر میں ٹاٹ اور قیمتی کپڑا برابر ہو۔ اس کو آپ نہیں پکڑ سکتے"

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے اس حقیقت کے متعلق اور ایک آسان سی بات فرمائی کہ عارف ان نعمتوں میں آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ کرتا ہے .... فقہا نے بھی اسی کے قریب قریب اس کو خوب سمجھا ہے چنانچہ چار انگل حریر کے جواز کی دلیل ہدایہ میں بیان فرمائی ہے یکون انموذجاً حریر الجنۃ تاکہ حریر جنت کا نمونہ ہو جاتے اور باری تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی اسی بناء پر ہے کہ ــــ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۵ کہ ان نعمتوں کے بارے میں رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نعمائے آخرت کی رغبت واجب ہے تو جو متعین ہو گا اس رغبت کا وہ بھی مرغوب ہے تو جسے جنت کے لباس کی رغبت ہو اس کے واسطے چار انگل حریر کا استعمال مستحسن ہو گا" (ھ ۱۴)

"غرض جس چیز کا خدا سے تعلق ہو اس کو خدا کا تعلق سمجھ کر حاصل کرو، آگے فرماتے ہیں وَاذْکُرُوا اللہَ کَثِیْرًا خدا کا ذکر زیادہ کیا کرو جس میں یہ تعلیم ہے کہ اگرچہ تلاش رزق فضل اللہ سمجھ کر کرو

مگر اس میں بھی غلو زیادہ نہ ہونا چاہئیے۔ بلکہ ذکر (یا خدا کی یاد) کی حیثیت اس میں بھی غالب رہنا چاہئیے اسی لئے ابتغاء رزق میں انہماک نہ ہونا چاہئیے"

دینی ولادینی معاشیات کا تضاد

ابتغاء فضل کی یہ حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد خود سوچو کہ اسلامی معاشیات کے اس غیر انہماکی کسب رزق کو غیر اسلامی معاشیات کے اس حرصی کسب سے کیا تعلق ہے جس کے انہماک میں آدمی اپنی ساری زندگی کو کھپا اور رات دن کو ایک کر دیتا ہے۔ اسلام کسب معاش یا طلب مال کی اجازت اس لئے دیتا ہے کہ اس سے زندگی کی حفاظت ہو اور وہ زندگی خدا طلبی میں لگائی جائے، بخلاف اس کے لادینی معاشیات کی منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ کھانا جینے کے لئے ہے اور جینا پھر الٹ کر کھانے یا معاشی فکر ہی میں کھپے رہنے کے لئے دینی اور لادینی معاشیات کے اس تضاد کو واضح کرنے کے لئے آگے ہی شیخ سعدیؒ کے اس مشہور شعر کو نقل فرمایا ہے۔

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است   تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

معاش کیلئے جدید تعلیم

اشرف العلوم میں اصل گفتگو یہ ہے کہ علوم میں سب سے اعلیٰ و اشرف علم کون ہے؟ اس سلسلہ میں جدید یا انگریزی تعلیم کا بھی ذکر آگیا ہے کہ اس کو مال و معاش اور راحت و عزت کے حصول کا آج کل بڑا ذریعہ یقین کیا جاتا ہے اس لئے اس کی حقیقت و حیثیت کا سمجھ لینا بھی ایک بڑی اہم معاشی

اصلاح و تجدید ہے جس میں ان لوگوں کی غلطی بتلائی گئی ہے جو
ترقی معاش کے ذرائع (یا علوم) کو علوم دینیہ پر ترجیح دیتے ہیں اور
اس ترجیح کو ثابت کرنے کے لئے ان کے فضائل قرآن و حدیث سے
ثابت کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص تلاش رزق کے لئے کوئی
زبان انگریزی وغیرہ حاصل کرے تو فی نفسہ جائز ہے مگر خواہ مخواہ
اس کے فضائل قرآن و حدیث سے ایسے شدومد سے ثابت کرنا یہ تو قرآن
کی تحریف ہے"

ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ کا مطلب

جیسے بعض لوگوں اس میں اتنا غلو کیا کہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً
وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً تک کو حصول انگریزی کی دلیل بناتے ہیں۔
دعویٰ کرتے ہیں کہ حسنہ میں انگریزی زبان بھی داخل ہے کیونکہ آدمی
بدوں اس کے دنیا میں اچھی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ اس دلیل کا مدار
اس پر ہے کہ حسنہ سے مراد کثرت مال و اسباب اور وسعت عیش ہو
...... سو یہ دعویٰ ہی قرآن کی محض تحریف ہے، دیکھئے میں قرآن کی
تفسیر قرآن ہی سے کرتا ہوں اور دعویٰ کرتا ہوں کہ حسنہ سے مراد کثرت
مال نہیں حالت حسنہ ہے جس کا اول مصداق تو حسنات طاعات
ہیں کہ اس میں ان کی توفیق کی دعا مانگی ہے اور اگر دنیا ہی کی حالت
حسنہ (اچھی حالت) مراد ہو۔ تب بھی مراد دنیوی راحت و اطمینان ہے
اور وہ کثرت مال سے نہیں بلکہ اعمال صالحہ سے ہوتی ہے

مزہ دار زندگی کا قرآنی وعدہ

چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ ہی فرماتے ہیں۔
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً یعنی جو شخص بھی خواہ مرد خواہ عورت عمل نیک کرے اور مومن بھی ہو تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے دنیا میں بھی لذیذ و پاکیزہ زندگی دیں گے۔

اور ظاہر ہے کہ اعمالِ صالحہ سے کثرت مال کا حصول ضروری نہیں پس حیات طیبہ سے بھی کثرتِ مال ہرگز مراد نہیں ہو سکتی بلکہ وہی راحت و اطمینان کی (قلبی) حالت مراد ہے جس کا حق تعالیٰ نے اعمال صالحہ پر وعدہ فرمایا ہے، اور اسی لئے دعا سکھلائی گئی ہے (صفحہ ۳۴) کہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔ یعنی اے اللہ ہمیں دنیا میں ان "اعمال حسنہ" کی توفیق دے کہ جن پر آپ نے حیات طیبہ کا وعدہ فرمایا ہے دنیا میں بھی ان کی بدولت "حالت حسنہ" یا اچھی حالت عطا فرمائیے اور آخرت میں بھی ان اعمال حسنہ کی بدولت اچھا بدلہ عطا فرمائیے۔

اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ پاکیزہ (پر لطف) زندگی یعنی اطمینان و راحت قلب کثرت مال سے نصیب نہیں ہوتی جس کا دل چاہے اندرونی حالت مالدار عاصی کی اور نادار مطیع کی مشاہدہ کرلے، مشاہدہ خود بتلائے گا کہ انکی نیکی بڑھنے سے گو مال کی کثرت ہو جائے اگرچہ آج کل اس میں بھی کلام ہے۔

کلام کیا آئے دن اخباروں میں خبریں آتی رہتی ہیں کہ سو سو اسو کی جگہ کا بھی

استشہار ہو تو بعض دفعہ ایم اے، اور ایل ایل بی والوں تک کی درخواستیں آجاتی ہیں۔ اور پھر بھی جگہ سب کو کیسے مل سکتی ہے حتی کہ حکومتوں کے لئے ان انگریزی خوانوں کی بے کاری ایک مستقل دردِ سر بن گئی ہے غرض ظاہری مال وجاہ کے اعتبار سے دنیا تو سینکڑوں انگریزی دانوں میں اب ایک آدھ کی بھی ذرا خواہ مشکل ہی سے بنتی دیکھی۔ البتہ آخرت ننانوے فی صد بلکہ نوسو ننانوے فی ہزار کی بگڑ جاتی ہے کہ ایمان یا عقائد تک درست نہیں رہ جاتے۔ باقی

خدا کے نافرمان خصوصًا مسلمان کو مزہ دار زندگی نہیں نصیب ہو سکتی

اعمال صالحہ کی توفیق تو بہت ہی کم ہوتی ہے (جس پر قرآن نے اچھی زندگی کا ذمہ لیا ہے) معاصی پر دلیری زیادہ ہو جاتی ہے اور دعوے سے کہتا ہوں کہ خدا کے نافرمان کو راحت قلب حاصل نہیں ہو سکتی بالخصوص اگر وہ مسلمان بھی ہے، بلکہ یہ راحتِ قلب اور حیاتِ طیبہ انہیں مطیع لوگوں کو حاصل ہے جن کو آپ مفلس وقلاش سمجھتے ہیں مگر ان کی حالت یہ ہے کہ ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم — شہاں بے کمر و خسروان بے کلہ اند

اور اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

در سفالیں کاسۂ رنداں بخوارے منگرید — کیں حریفاں خدمت جام جہاں بیں کردہ اند

آگے حضرت حکیم الامت رحمہ ان بے تخت وتاج بادشاہوں کی بادشاہی کا راز بتلاتے ہیں کہ:۔

بے غم زندگی کا راز

یہ حضرات اپنی رائے کو رائے حق میں فنا کر دیتے ہیں اور یہ ایسی ترکیب ہے کہ اس سے جب چاہے

فقیر بھی غنی ہو جائے وہ یہ کہ تم اپنی رائے سے کوئی تجویز نہ کرو کہ نوکر وفادار ہونا چاہیئے، بیوی کو مطیع ہونا چاہیئے ان باتوں میں کوشش اصلاح کی تو کرو، مگر اپنی رائے و تجویز پر (نتائج کے لحاظ سے اصرار) مت کرو پھر جو پیش آوے گا ناگوار نہ ہوگا اور اس پر غم نہ ہوگا۔ کیونکہ غم کی حقیقت ہے خلاف توقع (یا خلاف تجویز پیش آنا) جب توقع ہی نہ رہی تو غم کیسا ایسے شخص کو ہر حالت پاکیزہ اور بے غم زندگی نصیب ہوگی اور یہی حسنہ کا حاصل ہے۔

فقیری میں بادشاہی

یہ تو حضرت نے دین وعرفان کا وہ گر بتایا جس سے دنیا ہی جہاں تک بن سکتی ہے جنت بن جاتی ہے، اور الحمدللہ کہ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ایک نہیں ایسے فقیر بادشاہوں میں اللہ تعالیٰ نے فقیری اور بادشاہی کے جمع اضداد کا مشاہدہ کرایا۔ نظر والوں کے لئے دنیا اب بھی ان حسنۂ دنیا والوں سے خالی نہیں، خود یہ عاجز و عاصی، نہ فقیر نہ بادشاہ لیکن ایک دعویٰ ہمیشہ ذاتی تجربات و مشاہدات کی بناء پر کیا کرتا ہے کہ اول دن سے جنید و شبلی بنجانے کی نہ تکلیف نہ توقع، تاہم کچے پکے ایمان کے ساتھ تھوڑی بہت جتنی بھی اعمال صالحہ کی زندگی تم اختیار کرلوگے اسی قدر دل کے سکھ چین اور راحت و طمانیت کو بالکل نقد انقد اس دنیا میں بھی حاصل کرلوگے۔ میں توان انگریزی دانوں یا نئی تعلیم والوں سے بھی جن کو دنیا کا جاہ و مال، ان کی برادری والوں سیکڑوں بلکہ ہزاروں سے زیادہ حاصل ہے کہتا ہوں کہ ذرا اس کے ساتھ ایمان وعمل صالح کو بقدر چاشنی ہی شریک کر دیکھو کہ تمہاری دنیا بھی اس کے طفیل کتنی مزہ دار

ہوجاتی ہے اور جنہوں نے یہ چاشنی شریک کرلی تجربہ یہی ہوا کہ پھر وہ الحمدللہ اس راہ میں برابر ہی بڑھتے چلے گئے۔ پیچھے نہیں ہٹے۔

اصلیت اگر نہیں تو دھوکا ہی سہی اللہ بہت نہیں تو تھوڑا ہی سہی

چین ہی چین

اس غیر مولوی اور غیر مسٹر کو عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلق کی بدولت حیدر آباد میں یونیورسٹی کے اندر اور باہر اور کئی مثالیں حیدر آباد کے باہر ایسے مسٹروں کی معلوم ہیں جن کو ایمان و عمل صالح کی کچھ چاٹ لگ گئی پھر انہوں نے دنیا اور اس کے جاہ و مال کی حقیقت ان نام نہاد مولویوں سے کہیں زیادہ جان اور پالی۔ نام نہاد اس لئے کہ حضرت مجدد ہی فرمایا کرتے تھے کہ مولوی نام عربی داں کا نہیں عالم با عمل کا ہے باقی جس مولوی نے اپنے علم کے ساتھ عمل صالح کی قدر بھی پہچان لی اس کا کہنا ہی کیا "نورٌ علیٰ نور" آگے ہی فرماتے ہیں کہ ہماری عربی (یعنی وہی علم با عمل والی عربی) میں تو یہ ہے کہ اعمال صالحہ کرو بس چین ہی چین ہے (ص ۴۴)

انگریزی دانوں اور ان کی دیکھا دیکھی بہت سے ملانوں کو آج کل کی سر اپا فسادات سیاسیات نے ایک بڑا روگ نام نہاد حریت یا آزادی کا لگا دیا ہے جو حقیقت میں نام ہے مال و جاہ کی دہری حرص کا جس میں سچی آزادی — نہ انفرادی نہ اجتماعی — کا دور دور نام و نشان نہیں۔ سچی اور صحیح آزادی تو احکم

---

[1] دکن کے حکیم الشعراء حضرت امجد کا یہ شعر معارف مئی ۱۹۵۴ء میں پڑھ کر میں تو پھڑک گیا اور بہت دیر تک غنغناتا رہا واقعی اللہ کا تھوڑا تعلق بھی بہت ہے بڑی سے بڑی سلطنت سے بھی بڑی دولت یہی ہے

الحاکمین کی حکومت و بندگی کو قبول کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔

خدا کی غلامی ہی میں سچی آزادی و حریت

جو لوگ حریت حریت پکارتے پھرتے ہیں وہ حریت بھی دراصل اسی میں ہے کہ ہم کامل طور پر خدا کی بندگی (غلامی) کریں

گر تو خواہی زندگی بندگی کن بندگی کن بندگی

واللہ اگر تم آزادی چاہتے ہو (خواہ شخصی یا قومی) تو خدا کی غلامی کرو اس غلامی میں تمہیں دوسرے ہم جنسوں کی غلامی سے آزادی ہو جائے گی۔ اور فطری طور پر تو تم غلامی سے کسی حال میں نہیں بچ سکتے اور جب نہیں بچ سکتے تو انہی کی غلامی کیوں نہ قبول کرو جن کی غلامی بادشاہوں کا بھی فخر ہے اور ان کی غلامی کے معنیٰ یہ ہیں کہ شریعت سے آزاد نہ ہو (ص۸۵)

کسب معاش اور تعلیم جدید

اشرف العلوم میں بیان علم دین کی اشرفیت یا تمام دیگر علوم سے اُس کے اعلیٰ و اشرف ہونے کا ہے اسی سلسلہ میں انگریزی تعلیم اور اس کی معاشی حیثیت کا ذکر آگیا۔ اور اسی سلسلہ میں عنوان کی آیت وَاَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا ؕ سے عام دین کا زندقی ابتغاء فضل کے مقابلہ میں "فضل عظیم" ہونا ثابت فرما کر فرماتے ہیں کہ

فضل عظیم صرف علوم دینیہ، البتہ جب کمائی (کسب) مطلق فضل

ہے تو اس کے حاصل کرنے کے لئے اسی کے مناسب علوم کی بھی ضرورت ہوگی۔ بشرطیکہ وہ شریعت کے اندر ہوں تو ایسے علوم بھی حاصل کرنا جائز بلکہ لغیرہٖ مستحسن ہوگا۔ جبکہ ایسے علوم خود مقصود بالذات نہ ہوں بلکہ آخرت کا واسطہ ہوں کیونکہ دنیا واسطہ ہے آخرت کے لئے خود مقصود نہیں .... اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ دنیا کے علوم وہی جائز ہوں گے جو مقصود (آخرت) کے مزاحم نہ ہوں (ص۱۵؟)

معاشی خارش

مسئلہ کی پوری تحقیق و تجدید حضرت مجدد کے ایک مختصر مگر بڑے منطقی و مدلل رسالہ "تحقیق تعلیم انگریزی" میں ملے گی، جس میں جدید یا انگریزی تعلیم کی موجودہ صورت اور اس کے نتائج کے مد نظر تحقیقی فیصلہ فرمایا گیا ہے۔ معادی معاشیات میں کسب معاش کے لئے کسی علم و عمل کی اجازت کا فیصلہ انسان کی معادی وابدی زندگی کے بناؤ بگاڑ ہی کی بناء پر ہو سکتا ہے اسی لئے تو قرآن کریم نے کسب معاش کے لئے "ابتغاء فضل" کا عنوان اختیار فرمایا ہے کہ اللہ کا فضل وہی کسب ہو سکتا ہے جس سے دنیا چاہے بظاہر بگڑ جائے مگر آخرت نہ بگڑنے پائے، کہاں اسلام کی ابتغاء فضل والی یہ معاشیات اور کہاں آجکل کی حرصی معاشیات جس کی بنیاد ہی خدا و آخرت کے انکار پر ہے شَتَّانَ بَيْنَهُمَا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آج کل کے خدا چھوڑے مال و معاش میں آدمی شخصی یا قومی جتنی ترقی کرتا جاتا ہے اتنی ہی اس کی حرص اور تیز ہو جاتی ہے بقول حضرت حکیم الامتؒ یہ مال و معاش کا کسب نہیں خارش ہے

جیسے خارش والا کہا کرتا ہے کہ ذرا اور کھجلا لوں پھر نہ کھجلاؤں گا مگر جتنا

کھجلاتا ہے اس کی خارش بڑھتی جاتی ہے

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم　　　باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

اس کا علاج

اور اس معاشی خارش یا حرص کا علاج وہی ہے جو اوپر علاج الحرص والی حدیث میں معلوم ہو چکا یعنی توبہ یا خدا و آخرت کی طرف توجہ، لہذا اہمت کی بات تو خود حضرت مجدد کے الفاظ میں یہ ہے کہ بس اسی وقت سے ان دھندوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ،، مگر مجدد تھانوی وقت کے مجدد سے بھی بڑھ کر وقت کے سب سے بڑے طبیب حاذق اور حکیم الامت بھی ہیں اسی لئے مریض کی کمزوری و کم ہمتی پر نظر فرما کر ارشاد ہے کہ

> اگر دنیا کی طرف توجہ کم کرنے پر اس وقت قدرت نہیں اور (غیر ضروری) تعلقات کو چھوڑ نہیں سکتے تو پھر صورت یہ ہے کہ اس سلسلہ کو بھی چلنے دو اور اس کے ساتھ دوسرا سلسلہ توجہ الی اللہ کا بھی شروع کر دو، انشاء اللہ ناکامی نہ ہوگی۔

کیونکہ جیسے جیسے ایک طرف توجہ بڑھتی جائے گی دوسری طرف خود ہی کم ہوتے ہوتے بالآخر حد و اعتدال پہ آجائے گی یہی جدید خارشی معاشیات و کسبیات کا واحد علاج ہے۔

اور معاشیات انفاق کے باب میں یہ امر پوری طرح واضح کیا ہے کہ کسب مال و معاش یا جدید تعبیر میں پیدائش دولت کے رجحانات، معاشی مصالح کی بناء پر انسان کے خود خالق نے افراد و اقوام سب کی خلقت و فطرت ہی میں اتنے قوی رکھ دیئے ہیں کہ ان کی مزید تقویت و تحریص کی ضرورت

قطعاً نہیں رہتی ضرورت اگر ہے اور ضرور ہے اور بہت زیادہ ہے تو ان خلقی رجحانات کو حرص سے بچانے کی، قرآن و حدیث کا ذکر ہی کیا اسلامی معاشیات کی اس ضرورت پر نظر رکھنے والے ہمارے اکابر معلمین اخلاق غزالی و سعدی وغیرہ بلکہ کچھ نہ کچھ اسلامی احساس رکھنے والے عام شعراء تک نے زرطلبی کی تعلیم و تحریص کو آج کل کے ترقی پسند شعراء کی طرح اپنا شعار نہیں بنایا ہے مال و دنیا کی حرص و طلب کی مذمت اور قناعت و توکل کی تعریف ہی زیادہ کرتے رہے

پیٹ کی جدید ترین دعوت

یہ تو خاص خصوصیت جدید تعلیم و ترقی کی ہے کہ انسان و انسانیت کی ترقی تمامتر اسی دنیا اور اس کے مال و متاع کی ترقی بن کر رہ گئی ہے یہاں تک کہ معاشیات جدیدہ کے بندوں کا معبود اعظم عملاً وہی ۔کارل مارکس۔ بن گیا جس کی تحقیقات عالیہ معاشیہ کی رو سے انسان صرف معاشی حیوان قرار پایا یعنی اس ۵، ۶ فٹ کے دو پیروں پر کھڑے چلنے والے جانور کے اندر بھی جو کچھ ہے بیٹ ہی پیٹ ہے ۔انسان کا دل و دماغ اور انسانیت کی ہزاروں سال کی تاریخ صرف پیٹ کے گرد طواف کرتی رہی اس کی ساری اخلاقی و روحانی تہذیبی و تمدنی بیداری و شعور ہمیشہ پیٹ ہی کے خوابوں کی گونا گوں تعبیروں کا نام رہا ہے ۔اور کیسی حیرت و حسرت کی بات ہے کہ پیٹ کی اس جدید ترین دعوت و دعایت، کمونزم سوشلزم، یا اشتراکیت و اشتمالیت وغیرہ پر لبیک کہنے والوں میں بھی بہت زیادہ جدید تعلیم کے مسلمان ہیں ۔ حتیٰ کہ ان کے بعض بڑے اہل قلم اسلامی معاشیات کی معراج اسلامیت و اشتراکیت کا قلم کے زور سے جوڑ ملانے میں جانتے ہیں ۔

معاشی ہیضہ کا علاج

حالانکہ اسلامی معاشیات کی رو سے اس وقت سب سے بڑی خدمت اس معاشی ہیضہ کے علاج کی ہے کہ انسان نام اقبال کی تعبیر میں ایسے پیٹوں کا ہو کر رہ گیا ہے جو زمین کی پیٹھ پر روٹی کی تگ و تاز میں لڑھکتے پھرتے ہیں۔ "شکمہا ہر زمانے در تگ و تاز"۔ حکیم الامت نے علاج الحرص میں در اصل اسی شکمی تگ و تاز کے علاج کی طرف متوجہ فرمایا ہے جو اسلام و انسانیت کے پیامبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تجویز فرمایا ہے اس تجویز میں پہلے "بطنی حرص" کے نفس مرض کو زبانِ نبوت کے اس بلیغ انداز میں واضح فرمایا گیا ہے کہ آدمی کے پاس مال و متاع یا سونے چاندی کی دو وادیاں بھی بہہ رہی ہوں تو بھی وہ تیسری کے لئے اور اسی طرح تیسری کے بعد چوتھی کیلئے اور چوتھی کے بعد کے لئے تڑپتا اور مرتا ہی رہیگا اور اس کا جو صرف ایک ہی علاج ہے وہ بتایا گیا ہے کہ فکر و نظر کو مال و دنیا سے بلند کر کے خدا کی طرف یا جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے کہ مال سے مآل یعنی دنیا سے آخرت کی طرف پھیر دیا جائے کہ دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے"، تب ہی جا کر یہ ہوگا کہ مال و معاش کو آدمی سر سے پیر تک اپنا سارا وجود بنا لینے کی جگہ پاؤں کی جوتی بنا کر اس کی صحیح جگہ پر رکھ سکے گا۔

اسلامی معاشیات کی منطق

غرض اسلامی معاشیات یا علم المال کی منطق کا ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ کسب مال کی اجازت تو بلا شبہ ہے لیکن حرص مال کی قطعاً نہیں۔ دوسرا مقدمہ کسب کے حرصی یا حرام و باطل ذرائع کی نشاندہی اور ان سے روکنا

یا نہی وممانعت ہے بلکہ جائز وحلال ذرائع کی ترغیب واجازت کا حاصل بھی ذرائع کسب کی تحدید اور لازماً حرام وباطل ذرائع کی ممانعت ہے احکام المال میں لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ کی قرآنی آیت کے تحت اسلامی معاشیات کی تجدید واصلاح کے اسی دوسرے مقدمہ پر بحث فرمائی گئی ہے اگر ایک طرف حرص مال اور دوسری طرف اس حرص سے پیدا ہونے والی پیدائش دولت یا اکلِ باطل پر پہرا بٹھا دیا جائے تو معاشیات کے کسبی فسادات کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔

باطل خوری میں عوام نہیں خواص بھی مبتلا ہیں

مجدد تھانویؒ کی نگاہ تجدید نے باطل خوری کے صرف معلوم ومشہور ذرائع کسب۔ سود رشوت وغیرہ کی اصلاح پر قناعت نہیں فرمائی ہے بلکہ خصوصیت کے ساتھ ایسی باطل خوریوں پر متنبہ فرمایا ہے جن کا عام مسلمانوں ہی کی نہیں اسلام کے خاص نمائندوں بلکہ اخص خواص۔ علماء ومشائخ تک کی نظروں میں باطل ہونا ہی سرے سے باطل ٹھہر چکا ہے، جب رہبری راہ گم کرچکا ہو تو پیچھے چلنے والے جدہر بھی بھٹک کر نکل جائیں نکل جانا چاہئے مگر پہلے باطل خوری کے عام ومعلوم ذرائع کی نسبت کچھ سن لیں اور اس سے پہلے بھی کلام الٰہی کی اس سلسلہ میں اعجازی تعبیر کا کچھ تفسیری لطف حاصل کرلیں کہنا تو یہ چاہئے کہ دوسروں کے مال کو باطل یا ناحق طریقہ سے نہ کھاؤ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یوں کہ "اپنے مالوں کو باطل طور پر نہ کھاؤ"، بھلا اپنا مال باطل طور پر کون کھاتے گا؟

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل کی عمیق ولطیف تفسیر

خدا تعالیٰ نے (اَمْوَالَکُمْ) (اپنا مال) اس طرح فرمایا کہ انسان کو اپنا مال زیادہ محبوب ہوتا ہے ورنہ پرائے مال کو اپنا مال بنانے کی کوشش ہی کیوں کرتا تو چونکہ انسان کو غیر کے مال سے چنداں محبت نہ تھی اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسے عنوان سے کہا جاتے جو داعی ہو (غیر کے مال کی بھی) حفاظت کا اسلئے اموالکم فرمایا۔ کہ غیر کا مال بھی ایسا ہی سمجھو جیسے اپنا اس کی ایسی ہی حفاظت کرو جیسی اپنے مال کی کرتے ہو۔ اگر کوئی اعتراض کرے یہ تو شاعری ہے کہ غیر کے مال کو اپنا سمجھو غیر کے مال کو غیر کا ہی سمجھا جائے گا اپنا کیسے سمجھ سکتے ہیں،، احکام المال صہ۱۷۱

لیکن جس دل میں خدا و آخرت پر ایمان نے جگہ کر لی ہے اس کے لئے اسلام کی ایمانی معاشیات کا بے تکلف کھلا ہوا جواب یہ ہے

"کہ غیر کا مال غیر ہی کا ہے واقعی اپنا نہیں مگر لَا تَاکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ فرمانے سے اشارہ اس (ایمانی حقیقت کی) طرف ہے کہ جب کسی کا مال تلف کرو گے تو (اس کے وبال میں) تمہارا مال تلف ہوگا۔ خواہ دنیا میں یا آخرت میں۔ اس معنی کر کے دوسرے کا مال تلف کرنا (انجام کار) اپنا ہی مال تلف کرنا ہے اکثر تو یہ دنیا ہی میں ہو جاتا ہے کہ جو کوئی دوسرے کا مال تلف کرتا ہے تو اپنا بھی تلف ہو جاتا ہے اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت میں ضرور ہی ہوگا

(احکام المال صہ۱۷۱)

باطل خوری کے واقعات و نتائج

آدمی اگر خود اپنے دوستوں عزیزوں اور پاس پڑوس والوں ہی کے واقعات و تجربات پر غور کرے تو "مال حرام بود جائے حرام رفت" کی مثالیں اکثر اسی دنیا میں ملتی رہتی ہیں۔ آگے حضرت نے خود اپنے تجربہ کی کچھ ایسی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔

کہ جو لوگ مال وجوہِ باطلہ سے حاصل کرتے ہیں دنیا میں بھی ان کا بھلا نہیں ہوتا۔ کانپور کا قصہ ہے کہ مسجد میں مدرسہ تھا اس کے لئے کچھ زمین کی ضرورت تھی، مسجد کے پاس ایک شخص رہتے تھے جو چنداں مالدار نہ تھے لیکن تھے خاندانی شخص ان کا بہت بڑا مکان تھا ان سے تھوڑی زمین مسجد کے لئے لینی چاہی انہوں نے انکار کر دیا بلکہ اور مسجد ہی کی زمین دبالی۔

ایک بزرگ تشریف لائے ان سے اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ زمین ان کی زمین لینے گئی ہے جس کو اپنے ساتھ لے کر آئے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس شخص پر غربت آگئی حتی کہ ساری زمین فروخت کرنا پڑی جس کو مسجد والوں نے خرید لیا۔ حضرت یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آپ کسی کو نقصان پہنچائیں اور آپ کا نقصان نہ ہو۔" (ص ۱۵۱)

سب سے بڑی باطل خوری کا نتیجہ "محق"

اس کے بعد پہلے اسلامی معاشیات کی رو سے اکل بالباطل کی کچھ معلوم و مسلم صورتوں کا بیان ہے۔ سرفہرست سب سے بڑی باطل خوری سود کا معاملہ ہے

جس کے بارے میں ہے کہ یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا (کہ اللہ سود کی کمائی کو مٹا دیتا ہے) سودی مال جمع ہوتا ہے اور ایک دن مٹ کر رہتا ہے حقیقۃً تو مٹتا ہی ہے مگر صورۃً بھی مٹتا ہے ..... اس کے بہت سے واقعات ہیں ...... اگر کہیں ظاہراً نہ مٹے تو ادر طریقہ سے مٹتا ہے۔ محق (یا مٹنے) کی قسمیں مختلف ہیں ایک یہ کہ مال جاتا رہے، چوری وغیرہ ہو جائے یہ تو ظاہری محق ہے۔

باطنی یا معنوی محق

کی سب سے عبرتناک صورت یہ ہوتی ہے کہ مال جو دنیوی اعتبار سے بھی بذات خود مقصود قطعاً اور کسی درجہ میں بھی نہیں، زندگی کی ضرورتوں اور حاجتوں اور راحت و عزت کے اسباب فراہم کرنے کا محض واسطہ ہے مگر سودخوار بارہا حرص وطمع یا بخل اور ننانوے کے پھیر میں پڑ کر خود روپیہ کو مقصود بنالیتا اور اس کے واسطہ سے عزت و راحت حاصل کرنے کے بجائے خود اس کو بڑھانے اور جمع کرنے میں لگ جاتا ہے اور اسی کا غم کھاتے کھاتے مرجاتا ہے اسی طرح سودی مال کے محق یا مٹنے کی قسمیں مختلف ہیں

○ ایک یہ کہ مال جاتا رہے چوری وغیرہ ہو جائے یہ تو ظاہری محق ہے
معنوی محق وہ ہے کہ سود والا اپنے مال سے خود منتفع نہیں ہوتا
فاقہ بھر بھر کر عمر ختم ہو جاتی ہے

بات یہ ہے کہ سود لینے کا بڑا محرک خود روپیہ کی محبت ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ بخل ہوتا ہے اس لئے سود خوار
جتنا سود لیتا جاتا ہے اتنا ہی بخل بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ خود اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرتا یہ حالت ہوتی ہے کہ

سخیاں زاموال بر می خورند بخیلاں غم سیم و زر می خورند

بڑی پر لطف حکایت

ایک دوست نے کسی ایسے ہی سود خوار بنئے کا لطیفہ سنایا کہ وہ سخت بیمار پڑا، بچنے کی امید نہ رہی۔ لڑکوں نے دوا علاج پر ہزار دو ہزار خرچ کر دیئے زندگی تھی بچ گیا۔ جب اچھا ہو کر دوکان پر پھر بیٹھا تو دوستوں عزیزوں نے مبارک باد دینا شروع کی مگر وہ کچھ خوش نہ معلوم ہوتا۔ کسی نے پوچھا کیا بات ہے سیٹھ جی، پھر سے زندگی ملی مگر آپ کچھ مغموم ہی دکھائی دیتے ہیں؟ کہا بھائی اتنا روپیہ پیسہ دوا درمت میں خرچ ہو گیا پھر بھی مرنا ذمہ! مطلب یہ کہ اگر لگے ہاتھوں اس خرچ میں مر بھی جاتا تو کم از کم دوبارہ مرض الموت اور موت ہی کا خرچ بچ جاتا اب پھر مرتے وقت بیماری و موت کا خرچ دوبارہ ہوگا!

خود روپیہ پیسہ کو مقصود بنا لینے والوں کی یہاں تک فطرت مسخ ہو جاتی ہے کہ بجائے خرچ کرنے کے ان کو زیادہ جمع کرنے کے اس تصور ہی میں آنے لگتا ہے کہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے

> ایک ماسٹر تھے سو روپیہ ان کی تنخواہ تھی اور خرچ صرف پانچ روپیہ کرتے تھے لوگوں نے کہا میاں تمہاری اتنی تنخواہ ہے تکلیف سے کیوں گذارتے ہو؟ کہا کہ مجھکو اس تصور میں کہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے ایسا حظ آتا ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے" (احکام المال ص۱۵)

بخل کا فلسفہ ایک اور اسی رنگ کے دین کے مشہور عالم اور دنیا کے دولتمند کا لطیفہ کیا فلسفہ سننے کے لائق ہے کہ جب بازار جاتے تو مختلف

بڑی بڑی چیزوں کی قیمت دریافت کرتے مگر خریدتے ایک چیز بھی نہ تھے۔ کسی نے پوچھا کہ یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ فرمایا اس سے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ جتنا روپیہ میرے پاس ہے جو قیمتی سے قیمتی چیز اس کے اندر ہوتی ہے میں خیال کر لیتا ہوں کہ جب چاہوں اس کو خرید لے سکتا ہوں۔ لیکن اگر خریدتا رہوں اور روپیہ ختم ہو جائے تو یہ مسرت پھر کیسے نصیب ہوگی بس جو چیز لی روپیہ اسی میں پھنس کر مقید ہو گیا اس کی مطلقیت کا لطف کہاں رہا۔

ابھی ۱۹۵۴ء) بمبئی کی ایک خبر پڑھی کہ کوئی آدمی ایک موٹر خانہ میں مرا تو اس کی جیب سے ۴، ۵ ہزار کے اور بکس سے تین لاکھ کے نوٹ نکلے! مگر ان لاکھوں میں خود اس کا حصہ کسی دوسرے کے موٹر خانہ میں پڑے رہ کر مرجانا تھا۔ اس سے بڑھ کر دنیوی محق کیا ہوگا؟

یہ تو ظاہری و معنوی محق کی انفرادی مثالیں یا صورتیں تھیں لیکن عہد جدید کی مالیات و معاشیات نے سود اور بینکاری کو پوری پوری قوموں اور حکومتوں کی زندگی میں وبائی جراثیم کی طرح جیسا پھیلا دیا ہے جس کی بدولت حدیث والی پیشین گوئی سامنے آگئی ہے کہ:۔

"ایک زمانہ ایسا آجائے گا کہ سود خواری سے کوئی بچ نہ سکے گا جو سود نہ بھی کھائے گا اس کو بھی اس کا دھواں یا غبار ضرور لگ کر رہیگا"

کون کہہ سکتا ہے کہ اس عہد کی گذشتہ عالمگیر و عالم سوز جنگوں، اس کے بعد کوریا اور ہند چین کی لڑائیوں کا سلسلہ اور سب سے بڑھ کر آئندہ کی جنگی تیاریوں میں جو اربوں کھربوں روپیہ آتش بازی کی طرح نذر آتش ہوا اور برابر ہوتا جا رہا ہے یہ اس دور کی عالمگیر سود بازی ہی کی خدا و قدرت کی طرف سے "محق" کی عالمگیر صورت و سزا نہیں؟ کیونکہ یہی بے شمار دولت اگر جنگوں کے بجائے صحیح

معاشی ترقیوں میں لگائی جاتی تو پھر بھی دنیا کے بیشتر حصوں کے کیا وہ معاشی ولدر دور نہ ہو جاتے جن کا آج رونا ہے ؟ اور کیا زندگی کی واقعی ضروریات کی وہ قلت وکمی جو بڑی بڑی حکومتوں کے دور کئے ابتک دور نہیں ہو رہی ہے سود خواروں کی لائی ہوئی جنگوں کے بعد ہی نہیں آئی۔

باطل خوری کی دوسری عام صورت

جو آج کل سب سے زیادہ ناقابل علاج ہو رہی ہے رشوت خوری ہے اس کا خمیازہ بھی اکثر افراد واقوام سب کو اسی دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے، فرماتے ہیں کہ لوگ رشوتیں لے لے کر مال جمع کرتے ہیں پھر دیکھئے اس کا کیا حشر ہوتا ہے ؟

رشوت کا دنیوی انجام

خود میرے ایک عزیز پولیس میں ملازم تھے خوب رشوتیں لے کر روپیہ جمع کیا تھا۔ آخر سرکار کی طرف کسی معاملہ میں مقدمہ قائم ہو گیا، جتنا کمایا تھا سب اس میں لگ گیا حتی کہ گھر کا زیور بھی نہ رہا۔

مگر آدمی حرص وہوس میں اندھا ایسا ہوتا ہے کہ اس حشر کو اپنی حرکتوں کا حشر سمجھتے ہی کتنے ہیں خود ان صاحب اندھاپن دیکھئے کہ

خدا خدا کر کے اس مقدمہ سے جان بچی، اس کے بعد پھر اسی طرح جمع کیا اور اس کے نوٹ ایک پرانے تکیہ میں سی دیئے کہ اسے چور کیا لیں گے۔ ایک روز وہ تحقیقات کو گئے تھے کہ مکان میں آگ لگ گئی۔ گھر والوں نے قیمتی اسباب اٹھا اٹھا کر باہر پھینکا اس تکیہ کا کسی کو خیال بھی نہ آیا۔

جب وہ آئے تو معلوم ہوا کہ گھر میں آگ لگ گئی۔ پوچھا کہ میرا تکیہ کہاں؟ گھر والوں نے کہا کہ جو قیمتی چیزیں تھیں وہ مشکل سے بچائیں وہ پرانا تکیہ بھی کوئی حفاظت کے قابل تھا"۔

غرض اس طرح پھر سب کمائی جاتی رہی۔ اور اسی کمائی سے کچھ جائداد خرید لی تھی جو مال کے ساتھ جان بھی لے گئی اس کا قصہ یہ ہوا کہ کسی کاشتکار پر نالشن کی تھی اس مقدمہ کے سلسلہ میں اس کاشتکار نے ان حضرت کو قتل کر دیا۔ یہ انجام ہوتا ہے ایسے مالداروں کا۔

اس کے برخلاف جو حرام حلال راہوں سے روپیہ جمع کرنے کے پھیر میں نہیں پڑتا سیدھے سیدھے طریقوں سے جو کچھ مل جاتا ہے اس میں موٹا جھوٹا جو کچھ میسر آجاتا ہے کھا پی کر گذر کر لیتا ہے گو اس کی آمدنی کم ہوتی ہے بس معمولی سا کھا پہن لیتا ہے مگر رات کو مزے سے پاؤں پھیلا کر سوتا ہے، یہ اچھا یار شوت خوری جس کا حشر ابھی سن لیا۔ اس کے علاوہ

ایسے مال میں برکت نہیں

ہم نے دیکھا ہے کہ رشوت والے ہزاروں جمع کر لیتے ہیں مگر ایک دو پشت کے بعد کچھ نہیں رہتا۔ آج ایک شخص نوکر تو پچیس روپیہ کا ہے مگر حرام مال خوب سمیٹتا ہے (بظاہر) اولاد بھی ہے، مہمان بھی ہیں احباب بھی ہیں تندرستی بھی ہے، مکان کی تعمیر بھی ہو رہی ہے اپنی حالت پر نہایت خوش ہے، پھر تھوڑے دنوں میں کچھ بھی نہیں رہتا یہ کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ ایسے مالوں میں برکت نہیں ہوتی۔

برکت کی حقیقت

آگے برکت کی حکیمانہ حقیقت یاد رکھنے والی ہے لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں کہ برکت یہ ہے۔

"تھوڑا روپیہ (یا تھوڑی چیز) بہت ہو جائے حالانکہ یہ اس کی حقیقت نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر چیز ایک خاص کام کیلئے ہوتی ہے اس کام میں آنا تو برکت ہے اور اگر اس کام میں نہ آئے تو بے برکتی ہے مثلاً روپیہ اس لئے ہے کہ اس کے واسطے سے کھائیں پہنیں، دنیا کی راحت حاصل ہو اور اگر اس کام میں نہ لگے بلکہ فضول اڑ جائے تو بے برکتی ہے"

تو ایسے مال اکثر اپنے تن پر صرف نہیں ہوتے کہیں عطاروں کے ہاں جاتے ہیں کہیں ڈاکٹروں کی فیس میں خرچ ہوتے ہیں کہیں یار دوست کھا جاتے ہیں۔ ایک شخص اسی قسم کے تھے ان کی بیوی ہمیشہ بیمار رہتی تھی۔ ان کے صاحبزادہ پلنگ پر سوار تھے، صدہا روپے دواؤں، ڈاکٹروں اور طبیبوں میں صرف ہوتے تھے، پھر نوکر چاکر خوب کھاتے اڑاتے تھے چاروں طرف سے لوٹ ہو رہی تھی۔ یہ حالت تھی کہ مہینہ میں پانسو آتے وہ بھی تھوڑے، ہزار آتے وہ بھی تھوڑے، یہ اس قسم کے مال اتنی بڑی نحوست کی چیز ہیں۔ (ص ۱۷۱)

فرد ہی کی اصلاح میں سماج و حکومت کی فلاح

یہ رشوت کی انفرادی نحوست کے واقعات و اثرات تھے اور حضرت مجدد تھانوی رح کا اس اجتماعی شور و غل کے عہد میں اصل مذاق انفرادی اصلاح یا افراد سازی پر زور ہے کہ افراد ہی کی اصلاح اجتماعی یا سماجی و سیاسی فلاح کی استوار بنیاد ہے، جتنے اور جس نسبت سے افراد صالح و درست ہوں گے اتنا ہی اور اسی نسبت سے معاشرہ یا قوم و ملک کی مجموعی تعمیر بھی محکم و مضبوط ہو گی، آج ہم خود اپنے وطن ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ خصوصاً آزادی کے بعد سے، نہ صرف آزادی کی بہت سی نعمتوں سے محروم بلکہ غلامی کے دور سے بھی زیادہ جن بہت سی معاشی و غیر معاشی مشکلات میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ان پر قابو پانا دشوار ہو رہا ہے اس کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ حکومت کے ہر محکمہ اور ہر دفتر کے چھوٹوں بڑوں میں رشوت کی وبا غلامی کے زمانہ سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر پھیل گئی ہے۔ اگر رشوت بازیوں اور بدعنوانیوں کا اتنا زور نہ ہوتا تو جو اصلاحات اب لاکھوں کروڑوں کے مصارف اور برسوں کی مدت میں نہیں کامیاب ہو رہی ہیں وہ کروڑوں کے بجائے لاکھوں میں اور لاکھوں کے بجائے ہزاروں اور برسوں کے بجائے مہینوں میں انجام پا سکتی تھیں۔

حرام و حلال کی بحث کے بغیر نوچ کھسوٹ کا بازار

مگر نعرہ جب ہر حکومت سوتے جاگتے یہی لگا رہی ہو کہ معاشی اونچ نیچ کو کم سے کم کر کے سارے افراد کو ایک ہی معاشی سطح پر لا کھڑا کر دینا یا

سب کا معاشی معیار کم و بیش مساوی طور پر بلند کر دیتا ہے یہ انہونی بات کبھی ہو بھی تو اس وقت یا مستقبل قریب میں ہر شخص کو اپنی شخصی و انفرادی زندگی میں تو بہر حال ہوتی نظر نہیں آتی۔ دوسری طرف کسی دوسری زندگی یا مرنے کے بعد کسی جزا و سزا کے ایمان و یقین یا مذہب کا نام بھی حکومت کے ساتھ لینا شان نامذہبیت یا سکولرازم کے منافی ہو تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص بھی آخر جائز و ناجائز حرام و حلال کی بحث کے بغیر جس راہ اور جس ذریعہ سے بھی جہاں تک بن پڑے نوچ کھسوٹ کر اپنے معیار کو اپنے سے اونچوں کے برابر جلد از جلد مرنے سے پہلے کیوں نہ کر لے۔

وکالت کی دوکانداری

رشوت کی عام صورتوں کو تو عام مسلمان کیا غیر مسلم بھی رشوت ہی جانتے اور کہتے ہیں لیکن اسلامی معاشیات اس حرصی کسب مال یا حصول دولت کے دروازوں کو کہاں تک بند کرنا چاہتی ہے آگے اس کی بعض مثالیں اور سب سے پہلے وکالت و وکلاء کے پیشہ و طبقہ کی۔ سن لیں جس کو قوم و ملک کی ہمدردی کا اتنا دعویٰ ہے کہ لیڈری کہنا چاہئیے کہ بلیڈری کے ہم معنیٰ اور وکیلوں بیرسٹروں کی جاگیر بن گئی ہے۔

"قطع نظر اس کے کہ شریعت کے نزدیک (نفس وکالت کی آمدنی کیسی ہے خود ہمدردی کے بھی خلاف ہے اس کی تو یہاں تک کیفیت ہو گئی ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی (چوری پوری) دکانداری ہو گئی ہے..... کہتے ہیں کہ ہر پیشی پر پہلے اتنا لے لوں گا جب مقدمہ کروں گا۔ اس کا خیال ہی نہیں ہوتا کہ اس بچارے کو اتنا دینے کی

گنجائش ہے یا نہیں۔ بلکہ اگر وہ کہتا بھی ہے کہ کچھ کم کر دیجئے
تو کہتے ہیں کہ نرخ بگڑتا ہے یہ ہمدردی ہے پھر مقدمہ کی
پیروی پر تو لیتے ہی ہیں

غضب یہ

کرتے ہیں کہ رائے دینے کا بھی محنتانہ لیتے ہیں بلکہ بعضے جب بڑے
وکیل ہو جاتے یا ہائی کورٹ کی جج سے سبکدوش کر دیئے جاتے ہیں
تو خالی رائے دینے یا مشورہ ہی کو مستقل پیشہ بنا لیتے ہیں حالانکہ اسلامی
تعلیماتِ معاشی کی رو سے سرے سے

رشوت محض

شریعت میں رائے پر محنتانہ لینا جائز نہیں یہ رشوت محض ہے (ص ۲۵)
اس پر حضرت نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ
شریعت نے جس چیز کو متقوم (قیمت والی) نہیں قرار دیا
اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں مثلاً آپ کا حق شفعہ تھا آپ
نے سو روپیہ لے کر اس کو چھوڑ دیا تو یہ روپیہ واجب الاداء
(یعنی اس کا واپس کرنا واجب) ہے اور حق شفعہ بھی اب باقی
نہیں رہا۔ کیونکہ شریعت نے شفعہ کی کوئی قیمت نہیں مقرر
کی ہے یا مثلاً لڑکی کے عوض میں روپیہ لینا تو یہ حرام ہے کیونکہ
شریعت نے بیٹی (کو اس طرح فروخت کرنے) کی کوئی قیمت
نہیں رکھی ہے۔

یا مثلاً کسی نے حاکم سے سفارش کر دی اور پچاس روپیہ لے لئے یہ بھی حرام ہے اکثر لوگ رشوت مقدمات میں کچھ لینے کو کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی رشوت میں داخل ہیں حاکم سے سفارش کرنا بھی ایسا ہی فعل ہے کہ شریعت نے کوئی قیمت اس کی مقرر نہیں کی ہے ہاں جس میں کوئی محنت و مشقت ہو اس کی قیمت مقرر کی ہے۔

دینداروں کی رسوا کن رشوت

وکلاء تو خیر بالعموم نرے دنیا دار ہوتے اور دنیا دار ہی سمجھے جاتے ہیں لیکن بہت سے دین کو رسوا کرنے والے دیندار جو خالی دیندار ہی نہیں دین کے نمائندے خیال کئے جاتے ہیں وہ حب حرص کسب یا باطل خوری پر اتر آتے ہیں تو بے شرمی میں دنیا دار بھی پیچھے رہ جاتے ہیں محنت و مشقت ہی کی شرعی حقیقت کو واضح فرماتے ہیں ایک شاہ صاحب کا قصہ نقل فرمایا ہے جو خود حضرت کے علم میں بنگال کے کسی سفر میں پیش آیا کہ وہاں اُن

شاہ صاحب کی دعوت کی گئی اور کھانے کے بعد ان کو پچاس روپئے دیئے گئے وہ اس پر راضی نہ ہوئے آخر مشکل سے دو سو روپے پر صلح ہوئی بس دعوت کھانا بھی ایسی محنت و مشقت کا کام ہے جس کی کھلانے والے کو اجرت دینی پڑتی ہے"

مولود کا محنتانہ

اسی طرح ایک مولود خاں تھے جو مولود کا محنتانہ پانچ روپیہ لیا کرتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک دفعہ یہ حرکت کی کہ

"کرتا بہت پرانا ہوگیا تھا سوچا کہ کسی طرح نیا کرتا لینا چاہیئے ترکیب یہ کی کہ (مولود پڑھنے میں) ایک شعر پڑھا اپنے اوپر حال طاری کیا اور جھٹ سے اپنا کرتا پھاڑ ڈالا، میزبان کو شرم معلوم ہوئی کہ بلا کرتے کے رخصت کرے نیا کرتا بنا کر دینا پڑا ....
تو جیسے انہوں نے کرتا پھاڑنے (کی محنت) کا عوض لیا ان شاہ صاحب نے دعوت کھانے (کی محنت) کا عوض لیا۔"

دین کے ڈاکو

غرض یہ سب رشوت ہی کی طرح اور اس سے بھی بڑھ کر باطل خوری کی صورتیں ہیں بلکہ حضرت کے نزدیک تو یہ دین کے ڈاکو ہیں اور ان سے وہ ڈاکو اچھے ہیں جو جرأت کر کے بندوق تلوار سے لوٹ مار کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں اور یہ اپنے کو بے جرم جانتے ہیں اور وہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں اور یہ بالکل بے خطر ہوتے ہیں اس لئے وہ اچھے ہوں گے اور اور شاید قیامت میں ایسا ہی معاملہ ہو تو کچھ بعید نہیں جیسا کہ جامیؒ کا ارشاد ہے۔

گنہ آمرز زندانِ قدح خوار　　بطاعت گیر پیرانِ ریاکار

علماء کی رشوت

اسی سلسلہ میں اور بھی دین کے نام نہاد نمائندوں کی دین فروشی کی کچھ مثالیں بیان فرمائی ہیں کہ جیسے کسی مقدمہ میں کچھ راستے و مشورہ دینے کا محنتانہ لینا رشوت ہے اسی طرح علمار کے لیئے دین کے مسائل تبلانے کی قیمت لینا بھی جائز نہیں کیونکہ یہ دین فروشی ہے اور وہ حرام ہے۔ ایک مولوی صاحب نے تو بے باکی کی حد ہی کر دی کہ ہزار روپیہ لے کر پھیر پھار کے ایسی صورت نکالی کہ ساس سے نکاح جائز کر دیا اس کی کچھ تفصیل کے بعد ارشاد ہے کہ۔

یہود سے بڑھ کر تحریف

واللہ یہود نے بھی ایسی تحریف نہ کی ہو گی یہ ہے دین فروشی رشوت بھی لی تو کتنے برے طریقہ سے، سچا مسئلہ بتا کر بھی رشوت لینا جائز نہیں چہ جائیکہ دین میں تحریف کر کے (ص ۳۷)

حضرت مجدد کی اصلاحی رائے تو اس معاملہ میں یہ ہے کہ مثلاً کتابت کی اجرت لینا جیسے فرائض (وراثت کا مسئلہ) لکھنے میں

مفتی کو رشوت

مگر اس کے اثر پر بھی نظر کیجئے تو یہ بھی برائی سے خالی نہیں وہ اثر یہ ہے کہ میں نے خود دیکھا کہ لوگ مفتی سے فرمائش کرتے ہیں کہ مولانا فلاں وارث کا نام نہ لکھئے گا ایسی فرمائش اسی لئے

کرتے ہیں کہ کچھ دیتے ہیں ایک شخص نے خود میرے سامنے فرائض پیش کی اور کہا کہ جلدی مل جاتے اور ایک روپیہ میرے سامنے پھینکا اور کہا کہ یہ اس کا حق المحنت ہے میں نے کہا کہ اپنا کاغذ اٹھا لیجئے اور جائیے ۔۔۔۔ مجھ کو ان کے جلدی مچانے پر رنج نہیں ہوا بلکہ اپنے بھائیوں (علماء) پر رنج ہوا کہ نہ وہ لیتے نہ لوگوں کو ایسی جرأت ہوتی ۔ (ص۲۷)

اس جرأت کی حالت اور اس کی بدولت علماء کے ساتھ اچھے اچھوں کی تحقیر و تذلیل کے معاملہ کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اپنا ہی ایک تجربہ اور واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ

ایک صاحب رئیس بطور مہمان میرے یہاں تشریف لاتے ایسی حماقت کی کہ مجھ کو حیرت ہو گئی کہ اتنی معمولی بات کی بھی سمجھ نہیں تو ریاست کیا کرتے ہوں گے حرکت یہ کی کہ جب کھانا کھا چکے تو ایک روپیہ نکال کر میری طرف پھینکا کہ لیجئے جیسے بھٹیارے کے ہاں پھینک دیتے ہیں ۔۔۔۔۔ میں نے وہ روپیہ ان ہی پر پھینک مارا کہ آپ کو اتنی بھی تمیز نہیں ۔

علماء و مشائخ کی حرصی بے تمیزیاں

مگر یہ خمیازہ دراصل علماء و مشائخ ہی کی حرصی بے تمیزیوں کا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ مجھے ان واقعات سے خود اپنے ہم طبقہ لوگوں پر افسوس ہوتا ہے کہ ان کے لینے ہی سے نوبت یہاں تک پہنچی ہے آجکل کے مشائخ نے ناس کر رکھا ہے ۔

ایک درویش

میرے یہاں آئے اور کہا کہ مجھ پر قرض ہو گیا ہے میں نے کہا کیسے؟ کہا مرید کھا گئے .... دو دو مہینے پڑے رہے اور وصول ان سے کچھ ہوا نہیں ... میں نے اس توقع پر قرض لے کے کھلایا کہ نذرانہ دیں گے .... کہا آپ پریسیڈنٹ صاحب بہاول پور کو سفارشی خط لکھ دیجئے کہ وہ مجھ کو چھ ہزار روپیہ قرض دیدیں میں نے کہا آپ ادا کہاں سے کریں گے؟

مریدوں کی جیب پر نظر

اس کا جواب سنئے کہ نظر مریدوں ہی کی جیب پر اب بھی ہے۔

"کہنے لگے کہ مریدوں سے جو بھی ملے گا اس سے ادا کر دونگا میں نے کہا اللہ اب بھی آپ مریدوں کو نہیں بھولے ان کی وجہ سے تو یہ نوبت پہنچی..... خلاصہ یہ کہ اس زمانہ کے مشائخ کی یہ حالت ہو رہی ہے، بالکل دوکان ہو رہی ہے (ص ۳۸)

قبری پیروں کے میلے

اور ہمارے قبری پیروں کے ہاں کے سالانہ عرس تو کہنا چاہیئے کہ ان ہی دکانوں کے میلے ہوتے ہیں یا مریدوں سے تحصیل وصول کی سالانہ فصل۔ بلکہ بعضوں پر تو سال بھر کا یہ انتظار بھی شاق ہوتا ہے اور بقول حضرت ہی کے مہینے، فصلاتے، اور ششماہی معین ہے بڑے بڑے ثقہ لوگ کہتے ہیں کہ پیر کے یہاں خالی جاوے خالی آوے۔

پیر کے یہاں خالی جاوے خالی آوے کے معنی

تصوف کے تھانوی مصلح اعظم نے اس کی حقیقت بھی اپنے خاص رنگ میں یہ قرار دی ہے کہ "جو خالی جاوے خلوص سے وہ خالی آوے فیوض سے اور یہ معنی نہیں کہ خالی جاوے فلوس سے، فلوس کے معاملہ میں تو مسنون ہدیہ کے لئے بھی حضرت نے یہ قید لگائی ہے کہ ہر حاضری و زیارت میں کچھ نہ کچھ نذر دینے کا اہتمام ہرگز مریدوں کو نہ کرنا چاہیئے بس کبھی دو کبھی نہ دو، اگر ایسا کرو گے تو پیر کی نیت بھی نہ بگڑے گی ورنہ یہ حالت ہوتی ہے کہ مرید کی صورت دیکھی اور خیال ہوا کہ اب کچھ دیگا (ص ۳۹)

مرید کے ذمہ پیر کی اصلاح

حضرت مجدد کی تجدیدی و اصلاحی نگاہ کہاں کہاں جاتی ہے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر کیسے کیسے رخنوں کو بند فرماتے ہیں کہ مرید کے ذمہ بھی یہ امر ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے جس سے شیخ کے اخلاق خراب ہوں اگر پیر میں مرید کے عمل سے حرص پیدا ہو گئی تو اس نے پیر کا ناس کر دیا

بڑا لطیفہ بلکہ کثیفہ

پھر تو ایسی پیری مریدی ہوگی جیسے کسی مرید نے اپنے پیر سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری نجاست میں۔ پیر نے اپنی دکانداری کا موقع دیکھ کر جھٹ فرمایا کہ، تم تم ہی ہو اور ہم ہم ہی ہیں، مرید نے کہا

ابھی خواب ختم نہیں ہوا آگے بھی تو سنئے میں نے دیکھا کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی، اس پر پیر صاحب بگڑے اور مرید کو برا بھلا کہا۔ (ص ۲۹)

غضب کی تمثیل

اگر مرید نے یہ خواب پیر کی اصلاح اور ان کی تنبیہ کے لئے گھڑا تھا تو سچ یہ ہے کہ وہ خود ہی اپنے پیر کا پیر اور مصلح تھا بقول حضرت کے نہایت غضب کی تمثیل ہے، اور اگر واقعی یہ خواب تھا تو اس کی کھلی ہوئی تعبیر بھی خود حضرت ہی کے الفاظ میں یہ ہو سکتی ہے کہ مرید نے تو پیر سے دین کے لئے تعلق رکھا تھا اور پیر نے مرید سے دنیا کی غرض سے تعلق رکھا تھا۔ (ص ۲۹)

مریدی کا ٹیکس

عام پیروں کا عام حال یہ ہے کہ پیری مریدی کو کسب معاش کا مستقل پیشہ بنا رکھا ہے مرید اگر خود آستانہ پر حاضری دینے اور نذرانہ پیش کرنے میں کمی و کوتاہی کریں تو پیر صاحب دورہ کر کے اپنا ٹیکس وصول کر لاتے ہیں ایک پیر زادے ــــ نامی پیر کے صاحبزادہ کو اخبار نکالنے کا شوق ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ قلم کی اچھی سے اچھی ساکھ رکھنے والے ہفتہ وار اور ماہوار رسالوں تک کا یہ حال ہے کہ خود اڈیٹری کے فرائض انجام دے کر بھی کام چلانا اور مصارف نکالنا بہتوں کو دشوار ہو رہا ہے آتے دن بندش کا اندیشہ رہتا ہے پھر آپ تو اس میدان کے بالکل آدمی نہیں، خریدار کہاں سے آئیں گے؟ برجستہ

فرمایا کہ مریدوں میں دورہ کر کے خریدار بنا لوں گا۔ آخر کچھ دن ہی دورہ لوالا یہ اخبار نکل کر بند ہو گیا۔ پھر دورہ نہیں پڑا۔ شاید سمجھ میں آگیا۔ باقی خانگی دورے ہوتے رہتے ہیں اپنے پورے پورے گھر کے ساتھ مریدوں کے گھر جا دھمکتے ہیں مہینوں ڈیرہ ڈال دیتے ہیں۔ نقد کے علاوہ طرح طرح کی غذائی و لباسی فتوحات کے ساتھ کامیاب واپسی ہوتی ہے۔

مقدس ڈاکو

چور چوری کرتے اس کو چھپاتے اور اپنے کو مجرم جانتے ہیں لیکن یہ فتوحات والے ڈاکو دن دہاڑے دین و دنیا دونوں پر ڈاکہ ڈالنے کے باوجود مرتے دم تک اپنے کو مقدس ہی یقین کرتے رہتے ہیں

ایسے پیروں اور پیر زادوں کی نسبت تعلیم الدین میں ارشاد ہے کہ زانیہ کی خرچی اور جھوٹے تعویذ گنڈے فال کھلائی وغیرہ سب حرام ہے آج کل کے پیر زادے دونوں بلاؤں میں مبتلا ہیں۔ رنڈیوں سے خوب نذرانے لیتے ہیں اور واہی تباہی تعویذ گنڈے کرتے ہیں فال کھولتے اور لوگوں کو خوب ٹھگتے ہیں۔ (جامع المجددین ص ۲۲)

اچھے اچھے علماء کی باطل خوری

یہ ٹھگی کرنے والے پیرزادے تو بالعموم کم علم بلکہ اکثر بالکل بے علم ہوتے ہیں لیکن اکل باطل کی بے احتیاطیوں میں ہمارے مولوی اور اچھے اچھے علماء بھی ان پیروں سے کچھ بہت پیچھے نہیں رہتے اور تو اور دینی مدرسوں تک میں ہمیشہ آمدنیوں، چندوں کے باب میں وہاں کے اچھے اچھے علماء و اتقیا تک

کیسی اور کتنی بے احتیاطیاں فرماتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے کہ چندہ دینے والا سود خوار یا رشوت خوار ہے دیکھنا الگ رہا جن کی رشوت خواری، سود خواری وغیرہ معلوم و مشہور ہے ان کے ہاں بھی دعوتیں کھانے اور چندہ وصول کرنے میں کون دریغ کرتا ہے پھر جس گوشت پوست اور نفس کی پرورش طالب علمی کے زمانہ سے باطل یا مشتبہ آمدنیوں سے ہو اس کے خوگر کا عالم ہونے کے بعد باطل خوریوں سے بچنا ظاہر ہے کہ شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔

دینی طلباء کے معاملہ میں ایک بڑی مجددانہ اصلاح

ہمارے عربی طالب علموں کا ایک پرانا دستور یہ تھا کہ مسجدوں میں رہتے اور محلہ والے ان کا کھانا مقرر کر دیتے تھے جس کو لینے وہ خود ان کے گھروں پر جایا کرتے اس کو جا گیر کہا جاتا کہیں کہیں اب بھی تھوڑا بہت رواج چلا آتا ہے یا کسی خیر و خیرات کے موقعہ پر طلباء کو گھروں پر بلا کر دعوت کا بھی ایک طریقہ تھا، مجدد تھانوی نے ان دونوں طریقوں کو خصوصاً آج کل جب دینی تعلیم و طلباء کو عام طور پر حقیر خیال کیا جاتا ہے بالکل ناپسند فرمایا ہے۔

اکثر جگہ طلباء کو لوگ ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں لہٰذا طلباء کسی کے گھر کھانا لینے نہ جائیں اس میں علم اور اہل علم کی سخت اہانت ہے نیز ایک اخلاقی خرابی یہ ہے کہ اس عادت کی بدولت دوسروں سے مانگتے ہیں طبعی انقباض یعنی جھجک نہیں رہتی اور یہی طبعی انقباض حیا کی ایک بڑی فرد ہے جو ذلت کے سوال سے انسان کو روکتی ہے جب یہ نہ رہی تو رکنا طبعی نہ ہو گا عقلاً ہو گا اور غرض ایسی چیز ہے کہ جو عقلی مانع کو بہت جلد رفع کر دیتی ہے ایسے وقت طبعی

مانع ہی کی ضرورت ہوتی ہے جب وہ نہ رہا تو اس شخص کو جب موقع ہوگا ہاتھ پھیلا دے گا۔ نیز جب دل میں ایسے شخص کی قدر ومنزلت نہ رہی تو اس کا وعظ کیا نافع ہوگا اس لئے جو طالب علم کو کھانا دینا چاہے مدرسہ (یا اس کی قیام گاہ پر) بھیج دے "۔

اسی طرح دعوت میں بھی طلباء کو نہ بھیجا جائے جس کو کھلانا ہو مدرسہ لاکر کھلائے اور ہر چند کہ پہلے بزرگوں نے اس کو جائز رکھا تھا اس وقت کے دنیا دار عوام اہل علم کو ذلیل نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کے آنے کو اپنے گھر کے لئے موجب برکت سمجھتے تھے تو یہ مفسدہ نہ تھا۔ (تجدید تعلیم و تبلیغ ص ۶۸-۶۹)

مجدد وقت کی بڑی اصلاح چندہ کے معاملہ میں

اس سے بڑھ کر یہ مفسدہ ہے کہ طلباء کو تعطیلوں میں چندہ کے لئے دربدر پھرایا جاتا ہے حالانکہ اس کے بھی وہی مفاسد ہیں جو کھانا لینے کے لئے گھروں پر جانے کے [1] مگر چندہ بازی کے کام میں اب ان مفاسد پر کس کی نظر ہوگی اس کو ثواب بڑی دینی و قومی خدمت خیال کیا جاتا ہے اسی لئے راقم احقر تو چندہ کے معاملہ میں اس کو مجدد وقت کی بڑی خاص تجدیدی اصلاحات میں جانتا ہے کہ اس کے گوناگوں مفاسد میں عوام و خواص علماء وغیر علماء لیڈر و مسٹر سب ہی مبتلا ہیں اور ان اللہ لا یقبل الا الطیب اور لا یحل مال المرء الا بطیب نفسہ[2] وغیرہ کی صریح نصوص

---

[1] تجدید تعلیم و تبلیغ ص۶۸، ۶۹ [2] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

ہوتے ہوئے بھی چندوں میں مال کے پاک و حلال ہونے پر سرے سے نظر ہی نہیں جاتی شاید ہی کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی چندہ لینے میں دینے والوں کے طیب نفس یا پوری خوشدلی کی پرواہ کرتا ہو۔ بلکہ طرح طرح کے جا و بیجا اثرات اور دباؤ سے کام لے کر زیادہ سے زیادہ وصول کر لینا ہی بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے اس کے علاوہ[1] بعض جگہ دوامی چندہ کا وعدہ کرنے والے کی موت کے بعد وارث اس چندہ کو جاری رکھتے ہیں۔

دینی مدرسوں تک کی بے فکری

مگر دینی مدرسوں تک کی بے فکری کا یہ عالم کہ:۔

"اس کی تحقیق نہیں کرتے کہ ان لوگوں نے اپنی ملک خاص سے جاری رکھا یا ترکہ مشترکہ سے، اور اس ترکہ مشترکہ میں کسی یتیم، غائب یا غیر راضی کی ملک تو شریک نہیں ہے اسی طرح میت کے کپڑوں کو مدرسہ میں لیتے وقت میت کے ورثہ اور ان کے بلوغ و رضا کی تحقیق نہیں کی جاتی"[2]

ایک اور تجدیدی اصلاح

ایک اور حرکت یہ ہے کہ کوئی دوامی چندہ دینے والا اگر اپنی کسی مصلحت یا بلا مصلحت ہی آئندہ جاری رکھنا نہیں چاہتا تو اس کی ایک آدھ بار شائستہ

حاشیہ از صفحہ سابقہ[1] کسی کا مال اس کی خوشی دل کے بغیر لینا حلال نہیں

حاشیہ صفحہ ہذا[1] تجدید تعلیم و تبلیغ ص۶۷ [2] ایضاً

یاد دہانی ہی پر قناعت نہیں کی جاتی بلکہ اس کو طرح طرح سے گھیر کر اور بار بار کے تقاضوں سے مجبور کیا جاتا ہے کہ خوشی ناخوشی جاری ضرور رکھے۔ حضرت اس طرح کے بقایا مدرسہ کے حساب وکتاب یا روداد وغیرہ میں طبع کرانا بھی مکروہ خیال فرماتے ہیں۔

دوامی چندہ میں جو آخر سال میں بقایا رہ جاتا ہے اس بقایا کا طبع کرنا جس کا عام رواج ہے، امر منکر معلوم ہوتا ہے اس سے صاحب چندہ کی نادہندگی اور خلاف وعدگی کا اظہار ہے"

کانپور کے مدرسہ میں جو خود حضرت کی نگرانی میں تھا اس کی اصلاح اس طرح فرمائی گئی کہ

"روئداد صرف وصول شدہ لکھا جاتا تھا اور بقایا کو مدرسہ کے خاص رجسٹر میں رکھ کر بذریعہ خط یاد دہانی کرا دی جاتی تھی اور یاد دہانی میں بھی میرے نزدیک ضروری ہے کہ لزوم و تاکید کے الفاظ نہ ہوں بلکہ تصریح کر دی جائے کہ اطلاع دی جاتی ہے۔ اگر رغبت ہو تو بھیج دیجئے ورنہ آپ آزاد ہیں" (تجدید تعلیم وتبلیغ ص ۶۸)

اسلام کا مزاج شناس حکیم الامت

کسب مال کے معاملہ میں وہ بھی خالص دینی مدارس وخدمات کے لئے ایسی احتیاطوں کی تعلیم اسلامی تعلیمات کے مزاج شناس حکیم الامت اور خدا تعالیٰ اسلام پر پورا بھروسہ رکھنے والے مجدد ملت کے سوا کون دے سکتا ہے فرماتے ہیں کہ:۔

یہ کبھی نہ خیال کیا جائے کہ اس طرح کون دیتا ہے یہ خیال غلط ہے

جتنا آنا ہوتا ہے آتا ہے اس کا کامل تجربہ ہو چکا ہے ہرگز وسوسہ
نہ کیا جائے۔" تجدید تعلیم و تبلیغ صـ۶۸

حضرات صحابہ کی جان نثاری اور اخلاص کو کون پا سکتا ہے پھر بھی
خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی احتیاط فرماتے کہ

آپ کی خدمت میں جو چندہ آتا بعض مواقع پر واپس فرما دیتے تھے
ہر ایک کا چندہ آپ نہ لیتے، کسی چندہ جمع کرنے والے کو ایسا دیکھا
ہے؟ حضرت آج کل تو مال حرام تک واپس نہیں کرتے اور حضورؐ
کے واپس کرنے کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ اس شخص کو دینے کی گنجائش
نہ ہوتی تھی اندیشہ ہوتا تھا کہ شاید اس شخص کو فی الحال گرانی ہو
یا بعد میں پچتاوے یا تکلیف اٹھاوے (احکام المال صـ۱۸)

لیکن دوسری طرف حضرت صدیق اکبر کے گھر کا سارا اثاثہ قبول فرمالیا تو کیوں
اس لئے کہ:۔

وہ صدیق اکبر تھے، وہاں طبع پر ناگواری کا شائبہ (شبہ ہوسکتا)
تھا نہ تکلیف سے متاثر ہونے کا۔ اس لئے لے لیا کیونکہ وہ آپ
کے اندر فنا ہو گئے تھے۔ غیریت بالکل اٹھ گئی تھی.....
حاصل یہ کہ صدیق اکبرؓ کا تو سارا مال لے لیا کیونکہ وہ فانی ہو چکے
تھے اور ایک غریب شخص مال لایا تو آپ نے واپس کر دیا اور فرمایا کہ جاؤ
اپنا مال اٹھالو" (احکام المال صـ۱۹)

چندہ بازوں کی بازی گری اس کے برخلاف ہمارے آجکل کے
چندہ بازوں کی بازیگری کا کیا رنگ ہے کہ:۔

چندہ دینے میں جوش کی خرابی و قباحت

"ایسے غریب کا چندہ فخر سے لیا جاتا ہے جو کہے کہ میں نے اپنے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ کہتے ہیں کہ ان میں ایسی قومی حمیت ہے کہ سارا گھر لا کر رکھ دیا۔ ایسے اور ایسے ہیں میں تو ایسے چندہ دینے والوں کو کہا کرتا ہوں کہ کام ہوش سے کرو جوش سے مت کرو جوش میں تو سارا گھر لا کر رکھ دیا اور بعد میں جب ضرورت واقع ہوئی تو پشیمان ہوئے اگر جوش کو فضیلت ہوتی تو انبیاء علیہم السلام کا زیادہ حصہ مجذوب ہوتا ان میں عقل نہ ہوتی ..... جب یہ بات ہے تو اگر کسی کے پاس صرف دس روپے ہیں اور اس نے جوش میں آکر دس کے دس دیدیئے تو اس کا چندہ لینا درست نہیں" (احکام المال ص۱۹)

ایک اور حرام جدت

کن کن مفاسد کو اور کہاں تک گنا جائے ایک اور حرام جدت یہ نکلی ہے کہ کوئی غریب آدمی اپنی کوئی معمولی چیز یا ایک آدھ روپیہ دیدے تو اس کا نیلام کیا جاتا ہے کہ :۔

"اس متبرک روپیہ کو جو کہ نہایت جوش و خلوص سے اپنی حیثیت سے زیادہ دیا گیا ہے کون با ہمت خریدتا ہے، اب کسی نے اس کے دس لگائے کسی نے سو اور کسی نے ہزار، لوگ جوش میں آکر بڑی بڑی رقمیں بولتے ہیں۔ تو یہ ربوا (سود) ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے"

اس سے بڑھ کر یہ غضب

کہ کبھی یہ ترکیب بالکل سازش

یا بنائی ہوئی ہوتی کہ کسی غریب کو خود کھڑا کر دیتے ہیں اور اس پالیسی (یا جعل سازی) سے بڑی بڑی رقمیں وصول کر لیتے ہیں .... شریعت ان حرکتوں کو گندہ اور ناجائز سمجھتی ہے وہاں تو دارومدار صدق و خلوص اور سادگی پر ہے اور یہ چندہ خلوص سے نہیں دیا جاتا۔ محض نمائش و سازش سے دیا جاتا ہے "

کیسی حماقت ورنہ خوب سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص واقعاً خلوص سے ایک روپیہ دے رہا ہے تو یہ ایک ہی روپیہ برکت کا ہے ایسی برکت کی چیز ہاتھ سے دے کر ہزار روپے بھی لے لئے تو اس کے مصداق ہیں کہ۔

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ

(کیا حماقت ہے کہ اعلیٰ درجہ کی چیز کو ادنیٰ سے بدلتے ہو)

خود حضرت کا مذاق اس معاملہ میں اتنا دقیق تھا کہ خانقاہ کے مدرسہ کے لیئے غالباً پانی پت کے کسی صاحب نے چندہ پیش کیا، پرانے خادم تھے بے تکلف قبول فرمالیا۔ بعد کو خیال آیا کہ ان کے ہاں تو خود ایسا ہی مدرسہ ہے اس کا حق زیادہ تھا اس کو چھوڑ کر یہاں اس نیت سے تو نہیں لائے کہ مدرسہ کے ثواب کے ساتھ پیر بھی خوش ہوں گے اس شبہ کی بناء پر ان سے جرح فرمائی حضرت کی جرح میں کون ٹھہر سکتا تھا آخر ان کو اقرار کرنا پڑا کہ اصلیت یہی ہے حضرت نے رقم واپس فرما کر تنبیہ فرمائی کہ یہ اخلاص کے خلاف ہے۔ بلکہ شرک کی صورت ہے کہ خدا کی رضا کے ساتھ پیر کی رضا کو بھی شریک کر لیا۔

(او کما قال رح)

اسی طرح ایک تحصیلدار آئے اور انہوں نے خود حضرت کی خدمت میں بطور ہدیہ پچیس روپیہ پیش کئے۔ فرماتے ہیں کہ :۔

متقیوں کی مشتبہ چیزوں سے خدائی حفاظت

میں نے اس میں سے دس تو لے لئے باقی واپس کر دیئے وہ تو چلے گئے بعض لوگ جو ان کے ساتھ تھے انہوں نے کہا کہ آپ نے دس ہی قبول کئے اور عجیب بات ہے کہ دس ہی انہوں نے اول تجویز کئے تھے پھر کہنے لگے کہ اتنے نہ میری شان کے لائق ہیں نہ ان کی (حضرت کی) اس لئے پندرہ اور نکالے، بس دس تو انہوں نے خلوص سے نکالے تھے اور پندرہ وضعداری سے، اور خدا کی قدرت کہ جتنے انہوں نے خلوص سے نکالے تھے اتنے ہی میں نے لئے ''(ص ۵۶)

جو بھی اکل وکسب میں دانستہ طور پر حلال وطیب کا اہتمام رکھے اللہ تعالیٰ کی قدرت ورحمت سے امید بھی رکھنی چاہئے کہ نادانستہ بھی اس کی حرام ومشتبہ چیزوں سے حفاظت ہوتی رہے گی بشرطیکہ دانستہ بچنے کے لئے اس طرح کا ایمانی استغناء واہتمام ہو، کسی رئیس نے دو سو خدمت میں بھیجے اور ساتھ ہی لکھا کہ

گویا رشوت

میرا ارادہ ہے کہ آپ کے یہاں بلانے کی تحریک کروں۔ اگر یہ جملہ نہ ہوتا تو میں لے لیتا لیکن اب لکھ دیا کہ روپیہ کے ساتھ بلانے کی درخواست سے معلوم ہوتا ہے کہ روپے بھیجنے سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ میں ان سے متاثر ہو کر منظور کر لوں (گویا

یہ رشوت ہے) ...... اگر آپ کے جواب سے میرا یہ شبہ رفع ہوگیا تو لے لوں گا ورنہ واپس کردوں گا،

ایک اور بڑی حکمت دین کی عزت ظاہر ہے کہ مسنون ہدیہ کی غرض ونیت تو تھَادَوْا تَحَابُّوْا کی بناء پر صرف محبت ہونی چاہئے اس کے علاوہ امت کے حکیم کے ہاں امت کے علماء ومشائخؒ کے لئے خصوصًا اس احتیاط میں ایک اور بڑی حکمت مرعی تھی۔ انبیاء علیہم السلام کے وارثوں کا اس معاملہ میں اصل ورثہ یہ ہے کہ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ اس لئے ان وارثوں یا دین کے نمائندوں کو اور بھی زیادہ احتیاط واستغنا برتنا چاہئے اس میں دین کی عزت بھی ہے۔

فرماتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں کا مذہب یہ ہے کہ اپنی کسی بات سے دین کی عزت میں ذرہ برابر فتور نہ آنے دے جو بات کی جائے اس میں نیت یہ ہو کہ دین کی عزت ہر طرح محفوظ رہے (ص ۵۱)

مقالات حکمت میں اپنے بڑے بزرگ استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ دہلی کے کوئی شخص حضرت کے پاس فرائض (یعنی تقسیم ترکہ کا مسئلہ) لے آیا اور کچھ نذرانہ پیش کیا آپ نے واپس فرمادیا اور فرمایا کہ

ہدیہ کی تین حرام ومشتبہ صورتیں آج کل بزرگوں کو جو کچھ بصورت ہدیہ دیا جاتا ہے اکثر اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک بغرض دنیا یعنی رشوت، دوسرے بغرض ثواب اخروی یعنی صدقہ وخیرات تیسرے کسی امر دین کی غرض (مثلاً

استفتاء وغیرہ) کی اجرت، میں ان تینوں میں ایک قسم کا روپیہ وغیرہ نہیں لیتا البتہ جو محبت سے دیا جاتے لے لیتا ہوں۔ صدقہ لینا تو مجھے بوجہ غنی ہونے کے جائز نہیں۔ اور امور دینیہ پر اجرت لینا ہی جائز نہیں، اور رشوت تو سب ہی کے نزدیک حرام ہے۔ البتہ جو محض محبت سے ہو وہ ہدیہ ہے اس کو قبول کر لیتا ہوں (ص ۵)

معادی کسب معاش کا بڑا اہم امتیاز

ان باتوں سے اسلامی تعلیم میں اخذ مال یا کسب معاش کی ایک اور بہت بڑی اہم امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ کسب کے اسباب وذرائع میں صرف ظاہری صورت ہی کے جواز واباحت پر نظر رکھنا ہی کافی نہیں قلب ونیت وصحت کا لحاظ بھی کتنا ضروری ہے اکل حلال کا مدار صرف مال کے بجائے خود پاک وطیب ہونے ہی پہ نہیں! یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ نیت کیا اور کیسی ہے؟ حدیث میں صاف طور پر آتا ہے کہ کسی کا مال اس کی پوری خوشی دلی کے بغیر لینا حلال نہیں،، اگر کسی مسجد ومدرسہ کے لئے کچھ دیا ہو تو سود ورشوت وغیرہ کسی ناجائز یا حرام کمائی کا تو نہیں۔ لیکن نیت اگر خدا کی خوشنودی یا اخلاص وللہیت کے بجائے کسی کی مروت یا دباؤ یا اپنی ناموری وشہرت یا اور کوئی خود غرضی ہے تو گو مال فی نفسہ طیب وپاک ہے مگر نیت پاک نہ ہونے سے مسجد ومدرسہ کے حق میں تو وہ ناپاک ہی رہا۔

بعضے مشاہیر علما کی عجیب الٹی منطق

بعضے مشاہیر علما تک کا قول سنا کہ لوگ اپنے روپیہ کو طرح طرح کی بدعات وخرافات، عیاشیوں اور

فضول خرچیوں میں بیدریغ روپیہ اڑاتے ہیں تو کیوں نہ خوشی و ناخوشی سے جو کچھ جس طرح بن پڑے ان سے نیک کاموں کے لئے وصول کر لیا جائے عجب الٹی منطق ہے نیک کاموں میں خیر و برکت کے لئے تو اور بھی نیت کا نیک ہونا ضروری ہے اپنے گھر کے بنانے میں کوئی ناجائز و ناپاک آمدنی لگنا لگانا اتنا برا نہیں جتنا خدا کے گھر اور خدا یا دین کے کام مسجد و مدرسہ میں کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے خالص دینی اداروں اور مدرسوں میں بھی جو عملی دین اور قلبی اخلاص پیدا نہیں ہوتا اس کا ایک بڑا سبب یہی نہ ہو کہ ان کے چندوں اور آمدنیوں میں حلال و طیب مال کا اہتمام دینے اور لینے والوں دونوں میں قریب قریب مفقود ہے بلکہ بقول حضرت رحؒ کے

غضب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ذات کے واسطے لینے میں احتیاط کرتے ہیں وہ بھی نیک کاموں کے لئے لینے میں احتیاط نہیں کرتے، چندۂ بلقان میں میں نے دیکھا کہ جو محتاط لوگ رنڈی بھڑوے کا روپیہ خود کبھی نہ لیتے تھے انہوں نے اس چندہ میں ان کا روپیہ بے تامل لے لیا۔ (اسباب الغفلت ص۶)

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں حلال کی فضیلت اور حرام کی مذمت پر جو مستقل باب باندھا ہے اس میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کی یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ دین کے حق میں غذا کی مثال وہی ہے جو عمارت کے حق میں بنیاد کی۔ اگر بنیاد مضبوط و مستحکم ہے تو عمارت بھی سیدھی اور بلند ہوگی اور اگر بنیاد ہی کج اور کمزور ہے تو عمارت ڈھ جائے گی خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٍ

خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ [۱] اسی باب میں ذرا اوپر ایک اور حدیث نقل کی ہے کہ :۔
جس نے گناہ کی راہ سے مال کمایا پھر اس سے صلہ رحمی یا عزیزوں کی مدد کی یا خیر وخیرات یا اللہ کی راہ میں خرچ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو اکٹھا فرما کر جہنم میں جھونک دے گا۔ حدیث ہی میں ہے کہ جس گوشت کی پرورش حرام سے ہوئی ہو وہ جہنم ہی کا سزاوار ہے۔ اسی باب میں ایک اور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی کپڑا دس درم میں خریدا گیا ان میں اگر ایک درم بھی حرام کا شریک ہو گیا تو جب تک وہ کپڑا بدن پر رہیگا اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہ فرمائے گا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ حرام کھانے والے کی کوئی بھی فرض و نفل عبادت قبول نہیں ہوتی۔

حرام خوری کا وبال

نماز پورے دین کا ستون ہے جب یہ ستون ہی ہمارے دینی اداروں اور مدرسوں تک میں اکل حلال کی بے احتیاطیوں کی بدولت اس طرح منہدم ہو رہا ہو تو عمارت کی خیر کیا ہو گی۔ حدیث میں ہے کہ ایک دانگ (جس کا اندازہ تین پیسہ کیا گیا ہے) کی حرام خوری میں ایک دو نہیں سات سو مقبول نمازیں برباد ہو جاتی ہیں۔ احکام المال میں حضرت فرماتے ہیں کہ :۔ یہ بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں اموال کے حاصل کرنے میں کہ حلال

---

[۱] کیا جس شخص نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف و رضا پر رکھی ہو وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارہ پر رکھی ہو جو گرنے ہی کو ہے پھر وہ عمارت اپنے بنانے والے کو لے کر جہنم کی آگ میں گر پڑے ۵ (توبہ ع ۱۳)

وحرام کی بالکل تمیز نہیں رہی یہی وجہ ہے کہ قلب میں نور پیدا نہیں ہوتا نماز پڑھتے مدتیں ہوگئیں مگر قلب میں نورانیت نہیں"۔ (صـ۳۰)

اکابرِ صحابہ کی اس معاملہ میں احتیاط کی کیا حد و انتہا تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا مشہور واقعہ جو کہیں اوپر بھی مذکور ہوچکا اور جو بخاری کی روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے محض بے خبری میں کچھ ناجائز دودھ استعمال فرما لیا تو اس کو نکالنے کے لئے قے کرتے کرتے یہ نوبت پہنچا دی کہ ڈر تھا جان ہی نہ نکل جائے' اس پر بھی استغفار فرمایا کہ اے اللہ میں معافی چاہتا ہوں اگر اس کے بعد بھی کچھ یہ دودھ میری آنتوں اور رگوں میں رہ گیا ہو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ صدیق اپنے پیٹ میں پاک غذا کے سوا کچھ نہیں جانے دیتا ہے

اسی طرح کا واقعہ حضرت فاروق اعظمؓ کا معلوم ہے کہ غلطی سے زکوٰۃ کی اونٹنی کا دودھ کھا لیا تھا علم ہوتے ہی انگلی ڈال کر قے کر ڈالی۔ اس کے بعد امام غزالی نے حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل فرمایا ہے کہ تم اس افضل عبادت سے غافل ہو جس کا نام حرام سے بچنا ہے۔ اور حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ تم نماز پڑھتے پڑھتے کمان کی طرح جھک جاؤ اور روزے رکھتے رکھتے چلہ کی طرح لاغر ہو جاؤ تو بھی حرام سے بچے بغیر اللہ تعالیٰ تمہارے یہ اعمال قبول نہ فرمائے گا۔

اکابرِ صحابہ کیا اصاغر غلاموں کے نمونے حضرات صحابہؓ اور پھر ان کے اکابر کی تو بڑی بات ہے ان کے مقابل میں اصغر الاصاغر

غلامان غلام کے نمونے بھی اس بارے میں کیا کچھ کم سبق آموز ہیں۔ حدیث میں کسی ایسی چیز کا لینا بھی پسند نہیں فرمایا گیا ہے جس کی طرف نفس میں کوئی حریصانہ میلان پیدا ہو گیا یا لالچ کی نظر پڑ گئی ہو اس کا نام اشرافِ نفس ہے ارشاد ہے کہ ما اتاك بغیر اشراف نفس فخذہ۔

اس کی مثال میں حضرت علیہ الرحمۃ بلگرام کے کسی بزرگ عالم کا واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ:۔

ان کے ایک خاص شاگرد یا مریدان کے پاس آئے شیخ کا اضمحلال و ناتوانی دیکھ کر سمجھ گئے کہ آج فاقہ ہے اس لئے اٹھے اور کچھ کھانا لے کر حاضر ہوئے اور پیش کیا شیخ نے فرمایا کہ گو یہ پہنچا تو ہے حاجت کے وقت لیکن قبول کرنے میں ایک عذر ہے کہ جس وقت تم میرے پاس سے اٹھ کر گئے تھے دل میں خیال آیا تھا کہ کھانا لائیں گے چونکہ میرا دل اور اشراف نفس اس کے ساتھ ہو گیا اور ایسی حالت میں ہدیہ لینا خلاف سنت ہے اس لئے اس کے لینے سے معذور ہوں۔

ماشاء اللہ مرید یا شاگرد تھے سمجھ دار اصرار نہ کیا جیسا کہ بعض کم فہموں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں سے جھک جھک کیا کرتے ہیں جو نہایت سوء ادب ہے بلکہ فوراً کھانا لے کر اٹھ گئے اور آدھے رستہ سے پھر لوٹ آئے اور وہی کھانا پھر پیش کیا اور عرض کیا کہ لیجئے اب تو میرے چلے جانے سے اشراف نفس نہیں رہا ہو گا قبول فرما لیجئے۔ شیخ نے قبول فرما لیا اور ان کی اس نکتہ رسی اور ذہانت پر آفریں فرمائی۔ (مہمات الدعاء صا۳)

مطلب ان واقعات و تعلیمات کا یہی نکلا کہ اسلامی معاشیات میں

معاش کے کسب وحصول کا معاملہ صرف رشوت وسود وغیرہ کے ظاہری و قانونی معاملات کی حرمت تک محدود نہیں بلکہ قلب ونظر اخلاص ونیت کی کیسی کیسی دقیق احتیاطوں کو مقتضی ہے۔

ایک غلط فہمی ساتھ ہی موقع کی ایک غلط فہمی کا رفع کرلینا بھی ضروری ہے۔ خصوصًا آج کل کے حالات میں۔

بعضوں کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ حلال دنیا میں مفقود ہوگیا ہے اپنے نزدیک بڑے متقی ہیں کہ کسی چیز کو حلال ہی سمجھتے اس کا انجام یہ ہے کہ پھر ایسے لوگ بالکل ہی احتیاط نہیں کرتے .... کہ حلال کا جب وجود ہی نہیں تو حرام حرام سب برابر ہے ... چو آب از سر گذشت چہ ایک نیزہ وچہ یک دست

شیطانی دھوکا میں کہتا ہوں کہ یہ محض غلط ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں نہیں یہ صرف شیطانی دھوکہ ہے کہ وہ اس طریقہ سے حرام میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ حلال وحرام کا معیار بتلاتا ہوں اس کو سمجھ لینا چاہئے بس فتویٰ فقہی جس کو کہہ دے کہ یہ حلال ہے تو وہ حلال ہے اور جسے کہے کہ یہ حرام ہے وہ حرام ہے۔

یہ وہ وقت ہے کہ آج کل مشتبہ چیزوں کو بھی حلال کہا جاتا ہے نہ کہ حلال کو۔ ان میں شبہات نکال نکال کر حرام کر دیا جاتے بس یہ معیار یاد رکھو کہ جس کو فتوائے فقہی حلال کہہ دے وہ حلال ہے

اصل میں بعض واعظ لوگوں نے ایسی ایسی حکایات بیان کرکے لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہے۔

اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام مت بناؤ

مثلاً ایک بزرگ کا کھیت تھا اتفاق سے ان کا بیل دوسرے کے کھیت میں گھس گیا جس کی مٹی اس کے کھر میں لگ گئی پھر وہ ان کے کھیت میں آگیا اور وہ مٹی ان کے کھیت میں مل گئی۔ تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا چھوڑ دیا۔ اول تو یہ حکایت صحیح نہیں۔ صحیح بھی ہو تو وہ بزرگ مغلوب الحال ہوں گے اور مغلوب الحال مجنون کے حکم میں ہوتا ہے اس کا فعل قابل تقلید نہیں ہوتا..... شریعت میں غلو کرنے کی بھی اجازت نہیں ارشاد ہے کہ یَاۤ اَھْلَ الْکِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ اور ارشاد ہے لَا تُحَرِّمُوْا مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ (جو اللہ نے حلال کیا اس کو حرام مت کرو) (احکام المال ص ۳۰/۳۱)

حرام چندہ کی ایک دقیق صورت

اس قسم کے غلو یا جنونی وہمی تقوے کا ذکر ہی کیا ورنہ مال و معاش کے کسب و حصول کے معاملہ میں معاملات کے ظاہر و باطن صورت و نیت سب کی جیسی جیسی احتیاطیں اسلامی معاشیات کے ذرائع کسب یا آمدنیوں کے بارے میں اوپر معلوم ہو چکیں اس کی بناء پر آج کل اخذ و کسب میں جیسی جیسی بے احتیاطیاں عام ہیں وہ بہر حال اسلام کی نگاہ میں غیر اسلامی ہی ہیں۔

مثلاً ایک شخص سے چندہ مانگنے گئے اس نے مجمع عام میں ہم کو دو روپے دیئے اور ظن غالب یہ ہے کہ اگر ہم اس سے خلوت میں (تنہائی) میں مانگتے تو ایک ہی دیتا۔ اس صورت میں ایک روپیہ تو حلال ہوا اور ایک حرام یا ہمارے

کہنے سے تو اس نے ایک روپیہ دیتا اور اس کام کے لئے دوسرا کہتا تو کچھ نہ دیتا۔ تو اس صورت میں یہ ایک روپیہ بھی جائز نہیں ؎

حرام خوری کی کرامت

آگے ایک اور مثال لیجئے جس کو لوگ بڑی درویشی و کرامت خیال کریں گے لیکن ہے وہ بھی حرام خوری
یہ اگر کوئی درویش باطنی تصرف سے کسی کے قلب میں یہ خیال ڈال دے کہ فلاں شخص کو ایک ہزار روپیہ دیدو تو اس کا لینا بھی حرام ہے لوگ اس کو کمال سمجھتے ہیں لیکن یہ صورت بھی حرام ہی ہے کہ باطنی تصرف سے کسی کا مال لیا جائے (ص ۳۸)

دین صرف نماز روزہ ہرگز نہیں

عام طور سے دینداروں تک نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ دین نام صرف نماز روزہ کا ہے ان لوگوں نے آمدنی (یا کسب مال و معاش) کے ابواب میں سخت بے احتیاطیاں کر رکھی ہیں سمجھتے ہیں کہ شریعت کا تعلق صرف نماز روزہ سے ہے حالانکہ شریعت کا معاملات و اموال سے بھی پورا تعلق ہے۔ (احکام المال)

تین پیسہ کی حرام خوری سے سات سو مقبول نمازیں لے لی جائینگی

اور کیسا تعلق کہ خود نماز جیسی عبادت تک کے مقابلہ میں ابھی اوپر ہی معلوم ہوا کہ اگر ہم نے کسی کا مال ناجائز طریقہ سے لے لیا۔
قیامت کے روز ایک دانگ (تین پیسے) کے عوض سات سو مقبول نمازیں لے لی جائیں گی۔ اگر ایسا ہوا تو بتلائیے ہمارے پاس کیا بچے گا خدا کے

کے لئے معاملات درست کرو اور ناجائز آمدنی چھوڑ دو" ص۴۶

پوری زندگی نورانی ناجائز آمدنیوں اور معاشی بدمعاشیوں سے بچنے
اور اسلامی معاشیات کی کسبی احتیاطوں کو اختیار کرنے سے صرف نماز روزہ
ہی میں نورانیت پیدا نہیں ہوتی پوری زندگی نورانی ہوجاتی ہے جس کا جی چاہے
تجربہ کرکے دیکھ لے ورنہ ایمان کے کانوں سے دوسروں کا تجربہ سن تو
بہرحال لیں ۔ وہ بھی صحابہ و تابعین کے خیر القرون کا نہیں بلکہ اس شر القرون کے
اللہ والے ایک بندۂ خدا عبداللہ شاہ نام ۔ کا جو کوئی مشہور ولی بزرگ نہ تھے بظاہر
محض ایک گھسیارے ۔

گھسیارے کی مثال جو گھاس بیچتے تھے جو ملتا اس میں ایک حصہ اپنی
والدہ کو دیتے ایک اللہ کی راہ میں خرچ کرتے باقی ایک اپنے خرچ میں لاتے
انہوں نے ایک دن مولانا محمد یعقوب صاحب اور دوسرے حضرات کی دعوت
کی حضرت مولانا نے فرمایا دعوت کہاں سے کروگے تمہارے پاس ہے ہی
کیا ۔ کہنے لگے جو حصہ خیرات نکالتا ہوں اسی سے دعوت کروں گا غرض پانچ
آنے جمع کئے اور حضرت مولانا کے پاس لائے اور کہا کہ تم ہی پکالیجیو میں کہاں
جھگڑا کروں مہمان تھے کئی اور پیسے کل پانچ آنے "

یہ دیوبند کا وہ دور ہے کہ اساتذہ کیا سنا ہے کہ معمولی نوکر چاکر بھی آج
کل کے نام کے بزرگوں سے زیادہ بزرگ ہوتے تھے ۔ عبداللہ شاہ کے
ان اولیاء اللہ یا بزرگ مہمانوں کا مشورہ ہوا کہ کوئی سستی چیز تجویز کی جائے
چنانچہ گڑ کے میٹھے چاول تجویز ہوئے "

ایمانی معاشیات کا مقام اب دیکھئے خود ان بزرگ مہمانوں کے دل میں اپنے میزبان عبداللہ شاہ کی ایمانی معاشیات یا کسب معاش کا کیا مقام تھا کوری ہانڈی منگائی گئی پکانے والے کو وضو کرایا گیا غرض ہر طرح کی احتیاط کی گئی پھر وہ چاول تھے کتنے کہ بس ایک ایک دو دو لقمے حصہ میں آئے اب ان دو لقموں کی نورانیت و برکت حکیم الامت کے استاذ اور وقت کے مُسلّم شیخ اور دیوبند کے شیخ الحدیثؒ کی زبان سے سنئیں کہ

دو لقموں کے انوار و برکات خود مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ ان دو لقموں کی یہ برکت دیکھی کہ ایک ماہ تک قلب میں انوار و برکات محسوس ہوتے تھے کامل ایک ماہ یہ اثر رہا۔

آگے وقت کے مجدد حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ جب کمائی (کسب) کے ایک لقمہ کا یہ اثر ہے تو جو دن رات اس کو کھاتا ہے اس کی کیا حالت ہوگی (خیر المال)

ایمانی معاشیات کی شان خیر یہ تو ولی را ولی می شناسد کا معاملہ تھا ہم نہ حضرت عبداللہ شاہ نہ حضرت مولانا محمد یعقوب! لیکن ظاہری آنکھوں سے ابتغاء فضل والے اسلامی و ایمانی کسب معاش کی جو شان ہوتی ہے اس

لہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی یہ عظمت و جلالت مد نظر رہے کہ وہ صرف شیخ الحدیث بلکہ مسلم ولی کامل تھے خود حضرت حکیم الامت کے ایسے استاد فن کے ذکر سے حضرت پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

کا ایک نظارہ کریں۔ سورۂ جمعہ کی مشہور آیت میں ابتغاء فضل سے معاً بعد اور ساتھ ہی اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہنے کی جو قید و شرط لگائی گئی ہے اس کی شان و مثال میں حضرت حکیم الامت مکہ معظمہ کے دوکانداروں کے متعلق راوی ہیں کہ وہاں کثرت سے ایسے دوکاندار ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ دکان پر سودا لئے بیٹھے ہیں اور دلائل الخیرات پڑھ رہے ہیں قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں ذکر میں مشغول ہیں کوئی خریدار آیا سودا دیدیا پھر ذکر اللہ میں مشغول ہو گئے

بقدر ضرورت پر قناعت اس طرح کثرت ذکر سے معمور ابتغاء فضل میں بھی بعضوں کا صرف بقدر ضرورت پر قناعت کا یہ عالم کہ

تھوڑی دیر دکان پر بیٹھ کر جب بقدر ضرورت مل گیا دوکان بند کر دی اور گھر کو بلکہ اکثر حرم کو چل دیئے، بس اتنا تعلق دنیا کی چیزوں سے (خیر المال ص۱۸)

اور کیوں نہ ہو جب زندگی کا مقصد یا نصب العین یہ ہے کہ خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است تو جب جینے بھر کا کھانے کو مل گیا تو پھر اصل مقصد کو چھوڑ کر کوئی احمق ہی اپنا وقت دن رات کھانے کمانے میں کھپاتا پھرے گا اب مکہ میں بھی چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے شاید ہی کوئی ایسا دوکاندار دیکھنا نصیب ہو، گو سعودی حکومت کے کوڑے کی برکت سے سنا کہ کسی دکاندار کی یہ مجال نہیں کہ نماز کے وقت حرم یا مسجد نبوی کی طرف دوڑنے کے بجائے دوکان کھولے بیٹھا رہے۔ جزاھم اللہ عن الاسلام و المسلمین

کھانا جینے کے لئے ہے جینا کھانے کے لئے نہیں ہے

بہر حال قرآنی یا اسلامی ابتغاء فضل اور غیر اسلامی یا حرصی کسب مال و

ومعاش کا اساسی و بنیادی تضاد یہ ہے کہ ایک جگہ معاشی جدوجہد نام ہے زیستن برائے خوردن کا اور پھر خوردن برائے زیستن کے نہ ختم ہونے والے دور و تسلسل کا اور دوسری جگہ کھانا تو بلاشبہ جینے کے لئے ہے لیکن خود جینا لا حاصل و بے مقصد نہیں بلکہ وہ تمام تر خدا و آخرت کی یاد و درستی کے لئے ہے اسی کو حدیث میں فرمایا گیا کہ دنیا بیشک ہمارے لئے پیدا کی گئی ہے لیکن ہم الٹ کر پھر اس دنیا کے پیچھے مرنے کھپنے کو ہرگز نہیں پیدا کئے گئے بلکہ ایک اور اعلیٰ و ابدی زندگی کے لئے۔ اَلدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ۔

منطقی تضاد

اسلامی اور غیر اسلامی۔ یا جدید و عصری۔ معاشیات کے اس منطقی تضاد ہی کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں کسب کے ایجابی پہلو یعنی نفس مال و معاش کے کسب و حصول کی خالص ترغیب و تحریص کے بجائے اسلام کی کتاب اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت دونوں میں اس کے سلبی پہلو یا عدم کسب کے احکام یعنی اوامر کسب کی جگہ نواہی کسب زیادہ ملتے ہیں[1] جیسا کہ قرآن مجید کی لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وغیرہ آیات شاہد ہیں اور حدیث کا تو یہ حال ہے کہ کتاب البیوع کی کہنا چاہیئے کہ ساری کی ساری حدیثوں کا تعلق نواہی یعنی خرید و فروخت اور تجارت کی منہی عنہ و ممنوعہ صورتوں ہی سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں چیزوں کی خرید و فروخت یا فلاں

---

[1] تفصیل اوپر معاشیات کے باب انفاق میں گذر چکی

فلاں معاملات کسبے منع فرمایا۔ مثلاً ایک ہی حدیث کو لو کہ اس میں خرید وفروخت کی کئی صورتوں کو ناجائز قرار دیدیا گیا کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل سلف ولا بیع ولا شرطان فی بیع ولا ربح مالم یضمن ولا بیع مالیس عندک (تلخیص صـ۱۴۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیع اور قرض کو ملانا حلال نہیں (مثلاً فلاں چیز نقد دس کی اور قرض پندرہ کی دوں گا) اور ایک ہی معاملہ میں دو شرطیں لگانا حلال نہیں (مثلاً کوئی مکان اس شرط پر بیچنا کہ مرمت بھی کرادوں گا اور فرش بھی کردوں گا) اور نہ ایسی چیز پر نفع حلال ہے جو قبضہ میں نہ ہو اور نہ ایسی چیز بیچنا جو تمہارے پاس نہ ہو۔

بعض دوکانداروں کی ایک عادت

یہ ہوتی ہے کہ ایک دکان پر کوئی شخص سودا خریدنے لگے تو دوسرا اس کو اپنی دوکان کی طرف بلاتا ہے کہ ادھر آیئے ادھر آیئے۔ حدیث میں اس تک سے منع فرمایا گیا ہے کہ لا یبیع بعضکم علیٰ بعض صحاح کی تمام کتابوں میں یہ روایت موجود ہے

خریدار کو مال کا عیب خود ہی نہ بتانے پر شدید تہدید

اسی طرح آج کل تاجروں میں کون ہوگا جو اپنے مال کا عیب خود خریدار کو بتا دیتا ہو بلکہ کسی نہ کسی طرح اس کو چھپا کر خریدار کو پھنسا لینا ہی کمال جانتے ہیں صحیح حدیث کا مشہور واقعہ ہے کہ حضور علیہ السلام کا بازار میں گذر ہوا

غلہ کے ایک ڈھیر کو اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو انگلیاں کچھ نم ہو گئیں فرمایا کہ پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لینے والے کو پتہ چل جائے اور کسی کو دھوکا نہ ہو۔ ساتھ ہی اس پر کیسی سخت تہدید فرمائی کہ دیکھو جو اس طرح دھوکا دے وہ ہم سے نہیں یعنی مسلمان ہی نہیں۔ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔

بازار شیطان کا اکھاڑہ ہے

ترغیب و ترہیب کی حدیثوں میں یہاں تک ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے محبوب و پسندیدہ جگہ مساجد ہیں اور سب سے مبغوض ناپسندیدہ جگہ بازار ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جہاں تک ہو سکے ایسا نہ کرو کہ بازار میں سب سے پہلے جاؤ اور سب سے بعد میں وہاں سے نکلو کیونکہ وہ شیطان کا اکھاڑہ ہے اور وہیں اس کا جھنڈا گڑا ہے۔

کسب حلال میں بھی انہماک پسندیدہ نہیں

مطلب وہی ہوا کہ واجبی ضرورت یا گذر بسر سے زیادہ جائز و حلال تجارت وغیرہ کے کسبی مشاغل میں بھی انہماک اسلامی معاشیات یا عام مسلمانوں کی اسلامی زندگی کے نصب العین کے مناسب نہیں، دنیا میں زیادہ انہماک ہی کی بدولت عموماً دین کی راہ مارتے اور آخرت سے غافل کرنے میں شیطان کے داؤں پیچ زیادہ چلتے اور کامیاب ہوتے ہیں حدیث کے مشہور راوی اور صحابی حضرت ابو الدرداؓ یہاں تک فرماتے ہیں کہ ....

حضرت ابو درداء صحابی کا اس معاملہ میں عجیب ارشاد

اگر دمشق کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر (جہاں لوگوں کی آمد ورفت دہلی کی جامع مسجد کی طرح خوب ہوتی ہوگی اور اس لئے دوکان خوب چلتی ہوگی) بھی مجھ کو دوکان لگانے کا موقع ملے اور روزانہ پچاس دینار کی آمدنی ہو اور سب کی سب (اپنی ذات یا عیش پر نہیں بلکہ) اللہ کی راہ میں خیرات کر دیا کروں۔ ساتھ ہی کوئی میری نماز جماعت بھی فوت نہ ہوتی ہو نہ میں کسی ایسی چیز کو حرام جانتا ہوں جس کو اللہ نے حلال کیا ہو (یعنی تجارت کو حرام نہیں جانتا)، پھر بھی اس بات کو سخت ناپسند کروں گا کہ میں ان لوگوں میں سے نہ ہوں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (ایسے لوگوں کو تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتی)

بات وہی کہ "چو زیستن برائے خوردن" کا معتقد نہیں اور زندگی کا اصل مدعا صورتاً و معنیً ہر طرح صرف خدا و آخرت کی یاد و فکر و عبادت کو جانتا ہو وہ جب تک کسی ضرورت و اضطرار سے مجبور نہ ہو جائے حلال و جائز طریقوں سے بھی کسب مال و معاش میں منہمک ہونے کے بجائے اپنے وجود و پیدائش کے اس اصلی مقصود (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ٥) کو پورا کرنے میں کیوں نہ لگا رہے۔ بالفاظ دیگر پیدائش دولت یا حصول زر میں اپنے وقت اور قوت اور فکر و عمل کو ذرہ بھر بھی اس سے زیادہ مشغول نہ ہونے دے جتنا کہ زندگانی کو اتنا باقی رکھنے کے لئے ناگزیر ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت

وعبادت کے اصل مقصد زیست کو بخیر و خوبی پورا کرتی رہے اور اتنی مشغولی کو بھی عین عبادت و طاعت ہی جانتا رہے۔

تاجروں کی تعریف وتحسین کی اصل بناء

اسی لئے جن تاجروں کا کچھ تعریف و تحسین کے ساتھ ذکر ہے وہ وہی ہیں جو امانت دار اور راست باز ہوں اور وہی قیامت میں صدیقین و شہداء و صالحین کے ساتھ ہوں گے کیونکہ انہوں نے امانت و صداقت کو نفس کسب معاش یا زرطلبی پر مقدم رکھ کر اپنی تجارت کو بھی عین عبادت یا خدا کی مرضی و طاعت بنا لیا ہے یہاں بھی یہ نکتہ نظر انداز نہ ہونا چاہیئے کہ کسب معاش یا تجارت وغیرہ میں امانت و صداقت اور خدا و رسول کے اوامر و نواہی کا جتنا زیادہ اہتمام و التزام کیا جائے گا اتنا ہی نفع بازی و نفع اندوزی کے وہ مواقع کم ہوں گے جو حرام و حلال کی قیود و شرائط کے بغیر حاصل رہتے ہیں اس لئے صادق و امین تاجر کی یہ تعریف یا ایسی تجارت کی ترغیب بھی دراصل کسب کی تحدید یا ترہیب ہی ہے چنانچہ حضرت ابو سعید جن سے صادق و امین تاجر کی تحسین و ترغیب والی روایت مروی ہے خود ان ہی سے دوسری روایت ہے کہ قیامت کے دن تاجر (بالعموم) بدکاروں ہی کے زمرہ میں اٹھائے جائیں گے بجز ان کے جو اللہ سے ڈرتے، سچ بولتے اور لین دین میں، نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں سب کو معلوم ہے کہ عملاً ایسے تاجر کتنے ہوتے اور ہو سکتے ہیں۔

کسب معاش کی اسلامی روح

معاشیات کسب میں یہی کہ اسلام کی نظر میں ذرائع کسب یا مال و معاش کے اخذ و حصول کی صرف

ظاہری صورتوں یا خارجی حالات ہی تک عدم کسب کے بہت سے سلبی احکام یا نواہی تک محدود رہی ہو بلکہ باطنی پہلو یا کسب و اخذ کی روح کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے جس کا ذکر پہلے بھی آچکا یہاں کچھ صورتیں اور سامنے آگئیں

بیع اضطرار تک کی ممانعت مثلاً بیچنے والے سے کوئی چیز جتنے کم سے کم داموں میں طے ہو جاتے ظاہر صورت کے اعتبار سے اس کے لے لینے میں کوئی خرابی و قباحت نہیں۔ لیکن بیچنے والا اگر اپنی کسی سخت پریشانی یا احتیاج و اضطرار کی وجہ سے اونے پونے اپنی چیز پھینک رہا ہو تو اس کی مصیبت و پریشانی یا اضطرار سے آزنا جائز فائدہ اٹھانا جائز نہیں جہاں تک ہو سکے واجبی اور پورے پورے دام ہی دے کر لینا چاہیئے۔ حدیث میں اس کا نام بیع اضطرار ہے اور اس کی ممانعت بھی فرمائی گئی ہے قد نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع المضطر"، اسی طرح کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہم کو کسی شدید ضرورت کے تحت مثلاً خطرناک بیماری کے لیے کوئی دوا درکار ہے اور بازار میں اتفاق سے اس وقت ایک ہی دکان پر رہ گئی ہے اور ہم اس کے منہ مانگے دام دینے پر مجبور و مضطر ہیں تو دوکاندار کو ہماری اس بیماری و مصیبت سے نفع اٹھاکر نفع بازی سے کام لینا یا معمول سے زیادہ نفع و قیمت لینا جائز نہ ہوگا۔

اتنا ہی نہیں کسی چیز کی خرید و فروخت کا معاملہ بالکل مکمل ہو گیا مگر خریدار کو کسی ارضی و سماوی آفت کے باعث اس میں گھاٹا آگیا تو اسلامی تعلیمات کی رو سے معاملہ کی روح کا مقتضا یہ ہے کہ یا تو معاملہ کو ختم کر دیا جائے یا قیمت

کم کردی جائے۔

عمرۃ بنت عبدالرحمٰن کی روایت ہے کہ ایک شخص نے باغ کی فصل خریدی حفاظت و نگرانی کا پورا حق ادا کیا مگر پھر بھی گھاٹا آیا تو مالک سے کہا کہ یا تو قیمت کم کر دو یا سرے سے معاملہ ہی فسخ کر دو۔ لیکن مالک نے قسم کھالی کہ دونوں میں سے ایک بھی نہ کروں گا۔ خریدنے والے کی ماں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا ماجرہ عرض کیا۔

مال کی بجائے نیکی کمانے کی اسلامی معاشیات

نفس معاملہ کو حضورؐ نے ناجائز نہیں ٹھیرایا۔ مگر فرمایا کہ کیا اس نے قسم کھالی ہے کہ کوئی نیکی کا کام نہ کرے گا۔؟ اب آگے سنیں کہ مال کے بجائے نیکی کمانے کی اسلامی یا انفاقی ذہنیت نے حضرات صحابہ کرام میں لینے کے بجائے دینے کا کیا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ کہاں دونوں باتیں نہ کرنے کی قسم کھالی تھی اور کہاں مالک باغ کو جیسے ہی حضورؐ کے اس ارشاد کی خبر ہوئی حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں خریدار کو دونوں باتوں کا اختیار دیتا ہوں چاہے قیمت کم کر دے اور چاہے تو معاملہ کو سرے سے فسخ کر دے[1] (ص ۱۰۹)

---

[1] گذشتہ سال سنہ ۱۹۵۳ء میں میرے اور محب مخدوم ڈاکٹر سید عبدالعلی سلمہ کے ایک مشترکہ باغ کی فصل ڈھائی ہزار میں بکی۔ آموں میں ایک نئی بیماری پیدا ہو گئی جس کا فریقین معاملہ کو پہلے کوئی تجربہ کیا وہم بھی نہ تھا غریب خریدار بہت پریشان ہوئے مگر تھے بڑے ایماندار کہا چاہے ہم کو گھر بیچ کر قیمت ادا کرنا پڑے لیکن بھاگیں گے نہیں، میں نے پہلے خارجی ذرائع سے نقصان کا اندازہ کرایا پھر خریداروں میں جو سب سے سچا اور نیک معلوم ہوتا تھا اس کا عندیہ لیا

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

فسخ بیع کا اجر مغفرت

ایسی ناگہانی صورتوں اور حالات کی بناء پر حدیث میں فسخ بیع یا اقالہ کی خاص طور پر ترغیب ہے کہ اگر کوئی چیز مہنگی بیچی ہے تو خریدار کی خواہش پر واپس لے لے اور اگر سستی خریدی ہے تو بیچنے والے کی خواہش پر واپس کر دے، ابو داؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کسی مسلمان سے اقالہ کرے گا خدا اس کے گناہوں کی مغفرت فرمائے گا۔

پھر اسلام کی کسبی معاشیات میں عدم کسب کی یہ تعلیم محض خرید و فروخت یا تجارتی معاملات تک محدود نہیں، ہدیہ تحفہ اور نفلی خیر و خیرات یا عاریت وغیرہ کی چیزوں میں بھی لینے والے اور دینے والے دونوں کی روح و قلب یا باطنی پہلو کی جتنی حفاظت فرمائی گئی ہے اس کا اندازہ صرف ان دو عام حکموں سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی کی کوئی چیز (خواہ بطور ہدیہ یا عاریت وغیرہ) بغیر دینے والے کی پوری پوری خوشدلی کے لینا حلال نہیں لا یحل مال امرئ الا بطیب نفسہ۔

دوسری طرف لینے میں یہ شرط لگا دی کہ لالچ کے ساتھ کوئی چیز نہ لی جائے

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) عجب بات ہے کہ وہی بتایا جو ہمارا اندازہ تھا یعنی کم و بیش ساڑھے آٹھ سو روپیہ۔

ماشاء اللہ سراپا سعادت و تقوٰی ڈاکٹر صاحب کا تو پوچھنا ہی کیا یہ سگِ دنیا خود اپنا قلبی حال عرض کرتا ہے کہ ساڑھے آٹھ سو روپیہ کی یہ کثیر رقم جو ظاہر ہے شریعت و قانون کی رو سے وصول کی جا سکتی تھی اس کے چھوڑ دینے یا عدم کسب سے دل کو جو مسرت ہوئی وہ وصول کر لینے یا کسب سے ہرگز نہ ہوتی۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک التوفیق۔

جس کا نام اشراف نفس ہے دونوں کی کچھ تفصیل اور مثالیں بھی اوپر گذر چکیں۔

ہر پھیر کر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اسلام کی معاشیات صحیح معنی میں کسبی معاشیات ہے ہی نہیں۔ وجہ وہی ہے کہ مال و معاش کے نفس کسب و حصول کی رغبت و محبت ہی انسان کے خود خالق نے انسان کی عین معاشی مصلحت ہی سے اس کی اصل خلقت و فطرت میں اتنی شدت و حرص کے ساتھ رکھ دی ہے کہ مزید ترغیب و تشویق سونے میں سہاگہ نہیں زہر کو زہر ہلاہل بنانا ہوتا دنیا بھر میں آج کل انفرادی و اجتماعی قومی و بین الاقوامی شر و فساد لوٹ مار اور جنگ و جدال کا جو بازار گرم ہے کیا یہ مال و معاش کے کسب و حصول کو ساری زندگی کا مقصد و مرجع بنا لینے کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ ہے؟ اجیروں اور تاجروں یا مزدوروں اور مل مالکوں وغیرہ کے درمیان آئے دن لڑائی جھگڑوں کی جو خبریں آتی رہتی ہیں ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ آجر اجرت کم دینے یا دینا چاہتے ہیں اور اجیر زیادہ مطالبہ کرتے ہیں، خود حکومت اور اس کے مختلف محکموں ڈاک خانوں وغیرہ کے ملازموں کے مابین بھی یہی کشمکش رہتی ہے کہ حکومت کم دیتی ہے اور ملازم زیادہ مانگتے ہیں۔ تقسیم کے بعد سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سالہا سال سے جو اختلافات اور جھگڑے چلے جا رہے ہیں ان کی جڑ بھی زیادہ تر یہی تھی سے یہی جڑ کو ریا اور ہند چین کی لڑائیوں کو سالہا سال سے ختم نہیں ہونے دیتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پوری دنیا جنگ اور جنگی تیاریوں کے دو محاذوں یا حریفوں میں جو بٹ کر رہ گئی ہے اس کی بنیاد تو کھلے خزانے مال و معاش ہی کے کسب و حصول بلکہ استحصال اور لوٹ کے دو مستقل نظریات

و رجحانات ہیں ایک کے سر پر کہا جاتا ہے کہ سرمایہ داری کا بھوت سوار ہے جو سرمایہ کے نشہ پر غریبوں کا خون چوستی ہے اور دوسرے فریق کو غیر فطری انہونی اشتراکیت و اشتمالیت نے پاگل بنا رکھا ہے کہ وہ مالداروں خوشحالوں کے مال و دولت کو زبردستی چھین جھپٹ کر ساری دنیا سے امیری و غریبی یا معاشی اونچ نیچ تنگی و فراخی کے قدرتی و خدائی مدارج و مراتب اور ان کی حکمت و انتظام کو درہم برہم کر کے سب کو مال و معاش کے کم و بیش ایک ہی معیار و سطح پر لا کھڑا کر دینا چاہتا ہے۔

بڑا ناز جمہوریت والوں کو اپنی جمہوریت پر ہے اس جمہوریت کی موٹی عملی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ ہر پارٹی یا جماعت اپنے اپنے مزاج و مذاق کے مطابق معاشی و مادی یا دنیاوی منافع و فوائد ہی کا ایک پروگرام بناتی اور دوسری پارٹیوں کے مقابلہ میں زبان و قلم کی چالاکیوں، عیاریوں، جلسوں جلوسوں کے ہنگاموں، پروپیگنڈوں، مکر و فریب کے حیلوں اور ترکیبوں غرض جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر ہر طرح کی تدبیروں اور وسیلوں سے غریب عوام کالانعام میں زیادہ سے زیادہ اس پروگرام کو مقبول بنانے کی کوشش کرتی ہے اور رسہ کشی میں جو جماعت یا جتھا بازی لے گیا اس کو اپنے اور اپنے جتھے (پارٹی) والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مالی و جاہی منافع حاصل کرنے کا گویا ٹھیکہ مل گیا۔

اس کے بعد مغلوب جتھے (پارٹیاں) تھک کر بیٹھ نہیں جاتے بلکہ برابر ہر قسم کی جائز و ناجائز ترکیبوں سے اس ٹھیکہ کو جلد از جلد منسوخ کرا کے اپنے نام لکھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور کبھی کبھی یہ مغلوب جتھے معاشی

و مادی منافع کے کسی باہمی سمجھوتے کی بنیاد پر کی گئی یا سب اس ٹھیکیدار کو نکال باہر کرنے کے لئے گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں اس کا نام متحدہ محاذ ہوتا ہے، احمق عوام کا کام ہر حال میں ان مختلف جتھوں کے جتھے داروں یا لیڈروں کی ٹھوکروں کا فٹ بال بنے رہنا ہے اور بارہا ان کے برپا کئے ہوئے فسادوں میں جانوں کی بھینٹ تک غریب بننا یا عوام ہی کو دینا پڑتی ہے [1]۔

ووٹروں کی فوج کشی

میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ پہلے حکومت و سلطنت یا وہی اعلیٰ پیمانہ پر دنیا کے مالی و جاہی منافع و فوائد حاصل کرنے کیلئے فوج کشی کرنا پڑتی تھی یہ ایسی مہا بھارت تھی کہ ہر کس و ناکس حکومت کا حوصلہ آسانی سے نہیں کر سکتا تھا لیکن جمہوریت نے محض زبان و قلم کے اسلحہ سے ووٹروں کی فوج کشی نسبتاً اتنی آسان کر دی ہے کہ جو شخص بھی زبان و قلم کی تھوڑی بہت اہلیت رکھتا ہے یا ووٹروں کی فوج جمع کرنے کا کوئی اور گر جانتا ہے تو وہ شہر کے میونسپل کمشنر بننے سے لے کر صوبہ اور پورے ملک کے منسٹر اور گورنر تک بننے کے خواب حسب حوصلہ بے تکلف دیکھتا رہتا ہے

پیٹ ہی پیٹ بنا دینے والی سیاسی معاشیات

بہر حال کہنا یہ ہے کہ انسان کو پیٹ ہی پیٹ بنا دینے والی آج کل کی کسبی و حرصی

---

[1] آج کل مشرقی پاکستان کے جوٹ مل سے جس فساد کی خبریں آ رہی ہیں جس میں سیکڑوں مارے گئے ہزاروں برباد ہوئے وہ انہیں جمہوری جتھوں یا پارٹیوں کا سیاسی کھیل تھا۔ اور تازہ خبر یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں بھی وہی صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے اور پٹھانوں کے خلاف پنجابیوں کو ابھارا جا رہا ہے۔

یا سیاسی معاشیات کے برخلاف اسلام نے کسب مال و معاش یا طلب دنیا کو بذاتِ خود کسی درجہ میں بھی سرے سے مطلوب و مقصود ہی نہیں قرار دیا ہے اسلامی معاشیات کی ایسی حقیقت و حیثیت کو پوری قوت کے ساتھ واضح اور ذہن نشین کرلنے کے لئے راقم ہذا نے اس کی تعبیر و تشریح غیر کسبی معاشیات سے کی ہے۔ خیر المال میں مجدد وقت کا بھی ارشاد ہے کہ

قرآن ہی کو دیکھ لیجئے کہ دین کے ساتھ کہیں دنیا (مال و متاع) کا مطلوبیت کے ساتھ نام ہی نہیں لیا گیا .... دین ہی کا بالذات امر فرمایا گیا ہے ایک جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جہاں بالذات دنیا کی رغبت دلائی گئی ہو (ص ۲۸)

کسب معاش کے فرض ہونے کا مطلب ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ طلب دنیا یا کسب معاش سرے سے حرام ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو فرض عین یا فرض کفایہ تک ہے۔ اس کے آگے ہی فرماتے ہیں کہ

میں کسب معاش سے نہیں منع کرتا۔ کسب الحلال فریضۃ خود حدیث ہے بس کسب حلال تو فرض ہے ہاں حب دنیا (وہی حرص کسب) منع ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ حب الدنیا رأس کل خطیئۃ کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے

اس کی تفصیل و تحقیق آگے اسلام کے معاشی کسب کے جائز و مباح اور فرض و اجب ہونے کی تفصیل و تحقیق توجہ سے سنیں۔

ایک تو ہے کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا۔ کسب دنیا جائز اور بعض مواقع پر فرض، واجب ہے اور حب دنیا حرام ہے اور دونوں میں باہم تلازم

نہیں۔ یعنی نہ کسب دنیا کے لئے حب دنیا لازم ہے اور نہ حب دنیا کے لئے کسب دنیا لازم، کیونکہ کسب دنیا اس صورت میں بھی ممکن ہے کہ آدمی معاش تو حاصل کرے مگر اس کے ساتھ شغف نہ ہو۔ اسی طرح حب دنیا اس وقت بھی ہو سکتی ہے کہ یہ کماتے بھی نہیں مگر اس کے ساتھ شغف ہو، مثلاً کوئی شخص دنیا کماتا تو نہ ہو مگر دین سے بھی غافل ہو تو اس کو حب دنیا حاصل ہے مگر کسب دنیا حاصل نہیں کیونکہ دین سے غفلت ہونا یہی دنیا ہے۔

اور بعض جگہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں یعنی کسب دنیا بھی اور حب دنیا بھی مثلاً ایک شخص دنیا بھی کماتا ہے اور دین سے بھی غافل ہے اور بعض جگہ دونوں نہیں ہوتیں نہ کسب دنیا نہ حب دنیا مثلاً کوئی شخص کسب دنیا نہیں کرتا اور دین سے غافل بھی نہیں، بعض محب ہیں اور کاسب نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی کاسب ہو اور محب نہ ہو۔ (صـ۲۹)

منع صرف حب دنیا ہے باقی کسب دنیا تو وہ خاص قیود کے ساتھ ضروری (ہی نہیں بلکہ) آپ سن کر تعجب کریں گے کہ

شرعی فتوے کی رو سے تجارت فرض کفایہ ہے، اسی طرح زراعت بھی فرض کفایہ ہے کیونکہ زندگی موقوف ہے ان چیزوں پر اور ضروریات (زندگی) یا معاش کی تحصیل فرض کفایہ ہے۔

اور فرض کفایہ وہ ہے کہ بعض کے کر لینے سے بقیہ لوگوں کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے (اور اگر بعض بھی نہ کریں تو سب کی ذمہ داری رہتی ہے) اس لئے یہ خیال بالکل ہی غلط ہے کہ علماء کسب دنیا سے منع کرتے ہیں۔ بھلا فرض کفایہ سے کون منع کر سکتا ہے؟

مقصود بالذات کسب معاش نہیں طلب آخرت ہے

بس محب دنیا ہونا تو کسی کو جائز نہیں باقی کسب دنیا میں کسی قدر تفصیل ہے اور اس لحاظ سے کہ اسلام نے مقصود بالذات مال و معاش یا طلب دنیا کو نہیں بلکہ طلب آخرت کو قرار دیا ہے، یہ تفصیل بہت زیادہ اہم اور یاد رکھنے کے قابل ہے ۔

ایک وہ شخص ہے جس کو کسب دنیا ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جن کے لئے کسب دنیا ضروری نہیں ..... جس شخص کو عدم کسب کی حالت میں پریشانی ہو تو پریشانی کی حالت میں کسب دنیا ضروری ہے اس کو چاہیئے کہ کسب دنیا ضرور کرے ۔

کسب حرام کا حکیمانہ و مجددانہ فتویٰ

جن کو ترک کسب سے پریشانی میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو ان کے حق میں حضرت حکیم الامت کی حکیمانہ تجدید کا فتویٰ یہاں تک تھا کہ صریح کسب حرام کو بھی اس وقت تک ترک نہ کریں جب تک کسی حلال و جائز کا انتظام نہ ہو جائے وہی کہ کہیں فقر و فاقہ یا تنگی ترشی کی پریشانی میں پڑ کر حلال کے ساتھ ایمان کے بھی لالے نہ پڑ جائیں اس لئے محقق حرام نوکری بھی اس وقت تک نہیں چھڑاتا جب تک حلال میسر نہ ہو جائے کیونکہ افلاس بعض دفعہ کفر تک پہنچا دیتا ہے کاد الفقر ان یکون کفرا ،، (خیر المال صـ۴۱)

اور مطاہر الاموال میں ارشاد ہے کہ

،، کسی کی ملازمت ناجائز ہو یا تنخواہ تھوڑی ہو اور رشوت لیتا ہو

ان سے میں کہتا ہوں کہ ابھی ملازمت ترک نہ کریں جائز ملازمت اور حلال روزی کی فکر میں سچے دل سے لگ جائیں اور جب تک نہ ملے اس کو حرام سمجھے اور یوں سمجھے کہ مجبوری میں گوہ کھا رہا ہوں دوسرے روز توبہ و استغفار کرے،

اس کو یہ نہ سمجھے کہ ناجائز ملازمت کی اجازت دے رہا ہوں بلکہ اس کو ناجائز بتلا کر دوسری (بڑی) بلا کا وقایہ (بچاؤ) بتا رہا ہوں، کیونکہ بعض لوگ فاقہ میں ایمان ہی کو خیرباد کہہ دیتے ہیں

ع این بلا دفع بلاہائے بزرگ (ص۴۳)

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔

بعضوں کو کسب مناسب نہیں کہ ان کے دنیا میں مشغول نہ ہونے سے کسی کا ضرر نہیں ہوتا نہ خود ان کا نہ اہل وعیال کا سو یہ لوگ اگر کسب دنیا سرے سے نہ کریں تو کچھ حرج نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اگر وہ دنیا میں مشغول ہوں تو دین کی خدمت نہ کر سکیں تو ان کے لئے کسب دنیا مناسب نہیں ہے

کیونکہ اس کسب سے بلا کسی معقول عذر کے دین جو بذات خود مقصود بالذات ہے اس میں خلل واقع ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ اللہ کے بندے ایسے ہر زمانہ میں ہوتے ہیں اور الحمد للہ اب بھی ہیں جن کو گذر اوقات بھر اپنی اور اپنے اہل وعیال کی طرف سے کچھ بھی اطمینان ہو یا صحیح معنی میں توکل کی ہمت ہو تو وہ کسب معاش کے بجائے سارا وقت کسب معاد میں صرف کرتے ہیں خصوصاً جن حضرات کو کچھ انبیائی وراثت وعزیمت عطا ہوئی ہے ان کے لئے تو حضرات

انبیاء کا یہ قرآنی استغناء و توکل ہی اُسوہ ہے کہ لوگو! میں اپنی دعوت و تبلیغ کی خدمت پر تم سے کسی طرح کے اجر کا قطعًا سوال نہیں کرتا۔ میرا اجر تو بس اللہ ہی پر ہے لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ط

نبوت کے ساتھ سلطنت کا استثنائی اجتماع

لیکن آج کل کی ترقی پسند یا حکومت طلب مالی و جاہی حرص و ہوس میں سینکڑوں ہزاروں انبیاء علیہم السلام میں بھی لوگوں کو صرف حضرت سلیمان علیہ السلام اور ایسے ہی دو چار انبیاء کا نام و نمونہ یاد رہ گیا ہے جن کو نبوت کے ساتھ سلطنت بھی استثنائی طور پر کسی خاص مصلحت سے عطا ہو گئی تھی ورنہ اکثر بلکہ قریب قریب کل انبیاء علیہم السلام کی حالت قریب قریب فقر ہی کی رہی ہے دوسرے خود یہ استدلال بھی صحیح نہیں کیونکہ حکمتِ الٰہیہ سے ہر زمانہ کا ایک خاص مقتضا ہوتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بڑے بڑے جبار و متکبر بادشاہ تھے اس وقت کا مقتضا وہی تھا کہ نبی کو بطور معجزہ ایک ایسی سلطنت دی جائے جس کا لوہا سب مانیں۔ اس لئے جانوروں اور ہوا تک پر ان کو حکومت دی گئی یہ راز تھا ان کی سلطنت میں، ترقی دنیا مطلوب نہ تھی۔ چنانچہ اس حال میں بھی حسب نقل عارف رومی ؒ

زاں سلیماں خویش را مسکیں نخواند

آپ اپنے آپ کو مسکین کہا کرتے تھے اپنی ذات کے لئے بادشاہی ساز و سامان سے کام نہ لیتے تھے۔۔۔۔۔۔ بلکہ دست کاری و زنبیل سازی کے پیسوں سے کھاتے تھے اور بادشاہت سے گھبراتے تھے

کہ مبادا حقوق کی ادائیگی میں کمی رہ جائے اس لئے آپ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ • کہ ہم حقوق کے متعلق آپ سے حساب نہ لیں گے آپ گھبرائیں نہیں۔" (ص۳۷)

خود نبی الانبیاء کا اسوہ دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کے قصوں میں تو تاریخی طور پر چون و چرا ہو سکتی ہے لیکن خود نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا اسوہ عین بادشاہت کے زمانہ میں کیا تھا؟ حالت یہ تھی کہ بعض دفعہ آپ کے ہاں مہمان آتے ہیں پوچھنے پہ (ایک در نہیں) سارے گھروں (ازواج مطہرات) سے جواب آیا کہ گھر میں پانی تو ہے اور کچھ نہیں" ایک بار حضرت عمر رض حاضر ہوئے ان کی نظر دولت خانہ کی ہیئت پر پڑی تو دیکھا کہ گدے میں کھجور کے پٹھے بھرے ہیں اور کچھ چمڑے ٹنگے ہوئے تھے بس یہ کائنات تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی نہ بکس نہ الماری نہ میز نہ کرسی، نہ بنگلہ نہ کوٹھی نہ اور کوئی ساز و سامان۔

اس حالت کو دیکھ کر حضرت عمر رض کے آنسو جاری ہو گئے، عرض کیا یا رسول اللہ یہ قیصر و کسریٰ خدا کے دشمن صلیب پرستی کرنے والے ان کے پاس تو یہ ساز و سامان اور آپ کی یہ حالت، آپ دعا فرماویں کہ آپ کی امت پر اللہ تعالیٰ دنیا کی وسعت فرماویں۔

ادب سے یہ نہیں کہا کہ آپ پر وسعت فرماویں جیسے کہتے ہیں کہ آپ کے خادموں کو ایسا کر دیں۔

ایمانی معاشیات والا جواب آگے رونگٹے کھڑے کر دینے والا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمانی معاشیات والا جواب سنیں۔

آپ اٹھ بیٹھے اور فرمایا "افی شك انت یا عمر" اے عمر کیا تم ابھی تک شک ہی میں ہو، ان لوگوں (قیصر وکسریٰ وغیرہ) کو جو کچھ ملنا تھا سب دنیا میں مل گیا۔ وہاں کچھ نہیں اور ہمارے لئے آخرت کی (ابدی) راحت ہے " ص ۲۸

مطلب یہی ہوا کہ اے عمر تم کو "عمرؓ" ہو کر اور ایمان و اسلام کی حقیقی دولت سے آگاہ ہو کر بھی اب تک اس موٹی سی بات میں شک ہے کہ انسان اور مسلمان کا مطلوب یا اس سے مطالبہ اس دنیا کے سازوسامان یا سلطنت وثروت کا ہے ہی کب، جو وہ اس کی فکر و طلب میں اپنا وقت وزندگی گنواتا پھرے نبوت کے اس رنگ وشان واسوہ کو دیکھ دیکھ کر خود ان ہی "عمر" کا ان ہی قیصر وکسریٰ کے روم وایران کا فاتح اور شاہ نہیں شہنشاہ ہو کر بالآخر وفات تک یہ رنگ رہا کہ ملک الموت نے جب آپ کے گھر کی انتہائی بے سروسامانی دیکھ کر عرض کیا کہ امیر المومنین اور یہ گھر تو آپ نے فرمایا کہ جس گھر میں تم آنے والے ہو اس کو ایسا ہی ہونا چاہیئے (او کما قال)

لیکن آج کل اسلام کا نام لے کر دنیا کو دین بنانے کے مدعی بلکہ سلطنت وسیاست کو عین دین واسلام ٹھہرانے والے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ فاروق اعظم کی حکومت وسیاست کا نام لینے والوں میں بھی کتنے ہیں جو اس حقیقت سے خود اپنی زندگی میں عملاً گریز نہیں کرتے رہتے کہ اسلام کی فاروقی حکومت یا بادشاہی نام ہے عین فقر و درویشی کا یہ دنیا کی بادشاہی نہیں تمام تر دین یا خدا کی غلامی ہے۔ اور غلام کو ہر حال میں غلاموں ہی کی طرح رہنا چاہیئے کسی وفا وجاں نثار غلام کو آقا کی رضا جوئی اور فرمانبرداری کے جھمیلوں میں اس شکم پروری

ونفس پرستی اور خود نمائی وخود آرائی کی فرصت ہی کتنی مل سکتی ہے جو آج کل
کی جمہوری بلکہ نام نہاد اشتراکی حکومتوں تک کے وزیروں اور معمولی معمولی عہدہ
داروں تک کی زندگی میں قدم قدم پر نمایاں رہتی ہے
امت کے "فاروق اعظم" کا ذکر ہی کیا علمائے امت میں وہ بھی اس گئے
گذرے زمانہ میں۔ جنہوں نے اپنے عالم دین ہونے کا مطلب خادم دین۔
خدا کی غلامی وبندگی۔ جانا۔ انہوں نے بھی وسعت مال ومعاش کی سعی وطلب
کبھی۔ بے طلب ملنے پر بھی کس کس طرح اس سے گریز کیا ہے، حضرت مولانا
(محمد قاسم) نانوتوی کا مشہور واقعہ ہے کہ تصحیح قرآن کی خدمت سے صرف دس روپیہ
ماہوار پر گذر فرماتے اس میں بھی پانچ روپیہ ضرورت سے زیادہ خیال فرماتے
اس زمانہ میں ایک ریاست سے تین سو ماہانہ کی نوکری آئی۔ مولانا
جواب میں لکھتے ہیں کہ:۔

میں آپ کی یادآوری کا شکر گذار ہوں، مگر مجھ کو یہاں دس
روپے ملتے ہیں پانچ تو میرے اہل وعیال کے لئے کافی ہو جاتے
ہیں اور پانچ بچ جاتے ہیں آپ کے یہاں سے تین سو جو ملیں گے ان
میں سے پانچ تو میرے خرچ میں آئیں گے آگے دو سو پچانوے جو
بچیں گے ان کا کیا کروں ہر وقت فکر لگا رہے گا کہ ان کو کہاں
خرچ کروں، اس لئے معذور ہوں۔

اللہ اکبر کس قدر استغناء! واقعی اہل اللہ اور اللہ کی غلامی
ورضا جوئی کو مقصد زندگی بنانے والے، کے دل پر مال کی کثرت
سے بھی بار ہوتا ہے [1]

---

[1] مولانا نانوتوی رح کی معاشی زندگی کی جو نقاشی مولانا گیلانی کے قلم نے سوانح قاسمی میں فرمائی ہے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اور کیوں ہوتا ہے؟ کیا روپیہ پیسہ کسی کو کاٹتا ہے، یا اپنی اور بال بچوں کی عیش وراحت، وسعت وفراغت کسی کو بُری لگتی ہے بات وہی ہے کہ جو سچے اللہ والے ہیں حکومت وسلطنت مال ودولت کو بھی اپنی ملک نہیں اللہ کی امانت جانتے ہیں اس لئے ان کو خیال ہوتا ہے کہ خدا جانے اس کے حقوق ہم سے ادا ہوں یا نہ ہوں خدا سے ایسے ہی ڈرنے والے اسلامی حکومت کے حقوق ادا کرسکتے ہیں اور یہ اس زمانہ میں بھی وہی کرسکتا ہے جس نے پہلے نفس وشکم پر قابو وقناعت اور مال ودولت سے استغناء کی راہ اپنی زندگی کی راہ بنائی ہو، اس کے بغیر اسلامی حکومت کا دعویٰ بھی شر وفساد کی دعوت ثابت ہو رہا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہیگا۔

آج کل اسلامی حکومت کا دعویٰ

کرنے والوں کو جس طرح اسلام میں حکومت ہی حکومت نظر و پسند آتی ہے اور سے بنی الانبیاء علیہ السلام کی زندگی دیگر ہزاروں حضرات انبیاء میں ان کی نظر حضرت یوسف وحضرت سلیمان ہی کے دو چار ناموں پر پڑتی ہے اس کی مثال بالکل وہی ہے جو کہیں اور کسی شخص کی گذر چکی کہ تم کو قرآن کے احکام میں زیادہ کیا پسند ہے کہا كُلُوا وَاشْرَبُوا (کھاؤ پیو) اور دعاؤں میں زیادہ کیا پسند ہے؟ کہا رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (اے پروردگار ہمارے لئے آسمان سے خوان نعمت اتار دے) ورنہ ان دو چار استثنائی ناموں کے سوا باقی ہزاروں انبیاء کو نہ سلطنت وحکومت عطا ہوئی اور نہ انہوں نے اپنی دعوت کا اس کو کوئی جزء بنایا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس ایمانی معاشیات کے عجیب عجیب بے شمار اسباق اس مرقع میں ملتے ہیں کاش کتاب پہلے ملتی تو ایمانی معاشیات کے ذیل میں بہت سے افادات لائق استفادہ تھے، اہل ذوق اصل کتاب سے مستفید ہوں

ان دوچار کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص معاملہ یا وقت کی کوئی خاص حکمت ہی تھی جو کسی ملک و مخلوق کے حقوق کا یہ بارِ گراں اٹھانا پڑا۔ اس خاص معاملہ میں حضرت سلیمان ہی کے متعلق مفسر تھانوی کا ایک تفسیری نکتہ سنتے چلیں جس کا اشارہ ابھی گذر چکا۔

میرے ذوق میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو سلطنت دی گئی تو اس کے ساتھ ایک تسلی بھی حقوق کے ادا نہ ہو سکنے کی کر دی گئی تھی ارشاد ہے کہ هٰذَا عَطَاۤؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ یعنی یہ ہماری عطا ہے خواہ کسی پر احسان کرو یا جمع کرو، یعنی یہ عطا و امساک (یا دینا نہ دینا) بالکل تمہارے اختیار میں ہے کسی قسم کی پابندی نہیں تم سے اس کا کوئی حساب نہ ہو گا۔

اس تسلی کے بعد ان کو سلطنت کی گرانی نہیں ہوئی ورنہ گھبرا جاتے اور ایک دن بھی بادشاہت نہ کر سکتے (خیر المال ص ۳۶)

یہ ذوقی نکتہ کسی کا ذوقِ تفسیر قبول کرے نہ کرے لیکن حقوق کے معاملہ میں ڈرنے والوں کے لئے بادشاہت یا حکومت ہے فی الواقع گھبرانے ہی کی چیز "سلیمان امت فاروق اعظم جن کا نام اسلامی حکومت و حاکمیت کا نام لینے والوں کی زبان پر سب سے زیادہ چڑھا رہتا ہے خود ان کی خلافتی زندگی میں اس قسم کی گھبراہٹ کے کتنے اور کیسے کیسے واقعات ملتے ہیں جن کا نام آج کی نام نہاد جمہوری حکومتوں کے کسی ادنیٰ کارندہ سے بھی مشکل ہی سے توقع کی جا سکتی ہے۔

ایک دفعہ بیت المال کا کوئی اونٹ بھاگ گیا اس کی تلاش میں خود حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دامن چڑھائے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اتنے میں کچھ رئیسوں کے ساتھ احنف بن قیس ملنے حاضر ہوئے بجائے اس کے کہ آپ ان رئیسوں کی طرف

ملتفت ہوتے احنف سے فرمایا کہ آؤ تم بھی میرا ساتھ دو۔ تم جانتے ہو ایک اونٹ میں کتنے غریبوں کا حق شامل ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ امیر المومنین آپ خود کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں کسی غلام کو حکم دیں وہ ڈھونڈھ لائے گا اس پر فرمایا کہ مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہوگا۔ اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّیْ۔

اسی طرح ایک مرتبہ رات کو گشت فرما رہے تھے کہ دیکھا ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور بچے رو رہے ہیں دریافت فرمایا تو حقیقت حال یہ نکلی کہ کئی وقت سے ان بچوں کو کھانا ہی نصیب نہیں ہوا ہے اور ان کے بہلانے کے لئے خالی پانی ڈال کر ہانڈی چڑھا رکھی ہے آپ نے اسی وقت جا کر بیت المال سے آٹا وغیرہ کھانے کا سامان لیا اور اپنے غلام سے فرمایا کہ میری پیٹھ پر رکھ دو اس نے عرض کیا کہ میں لے چلتا ہوں۔ فرمایا لیکن قیامت میں میرا بوجھ تم نہ اٹھاؤ گے، غرض خود ہی لاد کر لے گئے۔ عورت نے آٹا گوندھا ہانڈی چڑھائی اور خود آپ چولھا پھونکتے رہے جب سب بچے پیٹ بھر کر اچھلنے کودنے لگے تب جا کر آپ بھی خوش و مطمئن ہو کر واپس ہوئے

یہ اور ایسے واقعات ایک الفاروق (علامہ شبلی نعمانی) ہی میں جس کا جی چاہے پڑھ سکتا ہے۔ حقوق کے معاملہ میں اس گھبراہٹ اور اہتمام کا یہ عالم رہا کہ اپنے بعد خلافت کے لئے کسی پر نظر نہ جمتی تھی کہ اس بوجھ کو اس طرح کون اٹھائیگا ایسی بے مثال فقیرانہ بادشاہی اور ضرب المثل عادلانہ حکومت پر بھی جس کی مثال چشم فلک کو آج تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی کسی اجر کی امید کے بجائے مواخذۂ آخرت کا اندیشہ اس قدر غالب تھا کہ فرمایا کہ میں اسی کو غنیمت جانوں گا کہ برابر سرابر (لَا لِیْ وَلَا عَلَیَّ) کا معاملہ ہو جائے۔ یعنی حقوق خلافت کی ایسی عادلانہ ادائی پر بھی ڈر یہی کہ کسی اجر و انعام کا مستحق تو کیا ہوں گا یہی بہت ہوگا کہ وزر

یا سزا و مؤاخذہ سے بچ جاؤں ۔ (بخاری شریف باب مناقب عثمان)

اسلامی حکومت کی روح

یہ ہے اسلامی جمہوریت یا خلافت کی روح، جس کا حق اسی وقت اور اسی سے ادا ہو سکتا ہے جس کے قلب میں خدا و آخرت پر ایمان جاگزیں (داخل) ہو کہ خدا کے بندوں اور اس کی مخلوق کے حقوق کے بارے میں اسی طرح کی گھبراہٹ نہ پیدا ہو گئی ہو جیسی کہ قلب فاروق میں تھی ۔ کامل اتباع خلافتِ فاروقی کا تو کتنے کر سکتے ہیں لیکن سے اسلامی حکومت وجمہوریت کا سچائی کے ساتھ نام لینے والوں کا اُسوہ و نمونہ فاروق اعظم ہی کی مثالی زندگی اور مثالی خلافت ہونی چاہیئے اور زبانی باتوں سے کہیں زیادہ اس نمونہ کا اثر ظاہر و باطن کی عملی زندگی میں نمایاں ہونا چاہیئے پھر اس مثالی نمونہ سے جو جتنا زیادہ سے زیادہ اپنے کو قریب کر اور رکھ سکے گا اتنا ہی تھوڑا بہت اسلامی حکومت کا حق ادا کر سکے گا ۔

مثالی خلیفہ (فاروق اعظم) کی مثالی معیشت)

اسلام کے اس بے مثل "مثالی خلیفہ" کی ذات میں اسلامی سیاست کے ساتھ جیسی اسلامی معیشت جمع تھی، مصنف الفاروق ہی کی زبانِ قلم سے وہ بھی ملاحظہ ہو ۔

"ان کی زندگی کا ایک رُخ یہ ہے کہ روم و شام پر فوجیں بھیج رہے ہیں، قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے معاملہ پیش ہے خالدؓ اور امیر معاویہؓ سے بازپرس ہو رہی ہے سعد بن ابی وقاصؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاص رضؓ کے نام احکام لکھے جا رہے ہیں ۔ دوسرا رُخ یہ ہے

کہ بدن پر بارہ پیوند کا کرتا ہے سر پر پھٹا عمامہ ہے پاؤں میں پھٹی جوتیاں ہیں پھر اس حال میں کبھی کاندھے پر مشک لئے جا رہے ہیں کہ بیوہ عورتوں کے گھر پانی بھرنا ہے یا مسجد کے گوشے میں فرشِ خاک پر لیٹے ہیں کہ کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں

باب ہذا کے اصل موضوع "معاشیات ایمان" کے لحاظ سے "ایمانی حکومت" کے اس سب سے بڑے نمونے کی ایمانی معیشت یا معاشی زندگی کے دو چار نمونے اور دیکھتے چلیں۔

بارہا مکہ سے مدینہ تک سفر کیا لیکن خیمہ یا شامیانہ کبھی ساتھ نہیں رہا۔ جہاں ٹھہرے کسی درخت پر چادر ڈال لی .... اسی کے سایہ میں پڑ رہے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ ان کا روزانہ خانگی خرچ دو درہم تھا۔ جس کے کم و بیش دس آنے ہوتے ہیں۔

غذا نہایت سادہ تھی معمولی روٹی اور روغن زیتون دستر خوان پر ہوتا تھا روٹی گیہوں کی ہوتی لیکن آٹا چھانا نہ جاتا قحط کے سال (گیہوں کے بجائے) جَو کا التزام کر لیا تھا کبھی کبھی متعدد چیزیں بھی دستر خوان پر ہوتیں۔ گوشت، روغن زیتون، دودھ، ترکاری، سرکہ، مہمان یا سفراء آتے تو ان کو تکلیف ہوتی کیونکہ وہ ایسی سادی غذا کے عادی نہ ہوتے۔

لباس بھی معمولی ہوتا۔ صرف قمیص پہنتے، برنس ایک قسم کی ٹوپی جو عیسائی درویش اوڑھا کرتے تھے مدینہ میں اس کا رواج ہو چلا تھا چنانچہ حضرت عمر بھی کبھی کبھی استعمال کرتے، جوتی وہی عربی وضع کی جس میں تسمہ لگا ہوتا"

یہ تو اسلام کے نقیر بادشاہ بلکہ شہنشاہ کا بادشاہت وحکومت سے ذاتی استفادہ تھا۔ اقربا پروری کا مقابلہ بھی ہمارے موجودہ جمہوری وزراء و اعیان اپنی اقربا پروری سے فرمائیں

ایک دفعہ غنیمت کا مال آیا حضرت حفصہؓ (خود حضرت عمرؓ کی بیٹی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ) کو خبر ہوئی تو وہ حضرت کے پاس آئیں اور کہا کہ امیر المؤمنین اس میں سے میرا حق مجھ کو عنایت کیجئے کیونکہ میں ذوی القربیٰ میں ہوں آپ نے کہا جانِ پدر تیرا حق میرے خاص مال میں ہے تو نے اپنے باپ کو دھوکہ دینا چاہا وہ بیچاری خفیف ہو کر اٹھ گئیں

شام کی فتح کے بعد قیصر روم سے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے اور خط و کتابت رہتی تھی ایک دفعہ ام کلثوم (حضرت عمرؓ کی زوجہ) نے قیصر کی حرم کے پاس تحفہ کے طور پر چند شیشیاں بھیجیں اس نے اس کے جواب میں شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر بھیجا۔ حضرت عمر کو یہ حال معلوم ہوا تو فرمایا کہ گو عطر تمہارا تھا لیکن قاصد جو لے کر گیا وہ سرکاری تھا اور اس کے مصارف عام آمدنی سے ادا کئے گئے۔ غرض وہ جواہرات بیت المال میں داخل کر دیئے اور ان کو کچھ معاوضہ دیدیا،،

علماء یا خدام دین کے لئے عدم کسب ہی پسندیدہ و اولیٰ ہے

بات میں بات نکل آئی کام کی تھی بڑھ گئی، گفتگو یہ چل رہی تھی کہ اسلامی معاشیات میں کسب کی نوعیت دراصل غیر کسبی یا منفی کسب کی ہے اس لئے

کہ کسب حلال کے معنی ہی حرام ذرائع کسب کی نفی و ممانعت ہے اس طرح کسب معاش کی تمام ناجائز و نامناسب راہوں پہ پہرہ بٹھا کر اسلام نے اپنی معاشی تعلیمات کو اصولاً سب ہی کے لئے غیر کسبی بنا دیا ہے خصوصاً جو لوگ دین اور خدمت دین ہی کو تمام تر زندگی کا مقصد بنا لیں اور وہ اپنے علم و تعلیم کے اعتبار سے حضرات علماء ہی ہیں۔ ان کے لئے تو حلال یا منفی کسب کے مقابلہ میں بھی حتی الوسع استغنا و توکل ہی پسندیدہ ہے بلکہ حق یہ ہے کہ مخلوق سے استغناء کے بغیر خدمت دین کا حق ادا ہونا ہی مشکل ہے۔

مگر ایک جماعت ہے دنیا پرستوں کی کہ وہ ایسے حضرات پر طعن و اعتراض کرتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں آرام طلب ہیں حالانکہ یہ مسئلہ عقلی ہے جس کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں جو مذاق جدید کے موافق ہے، سرکاری قانون ہے کہ جو شخص سرکاری ملازم ہو وہ اگر کوئی اور ملازمت کرے یا ٹھیکہ وغیرہ لینے لگے تو اس پر گرفت ہو گی۔۔۔(ص۲۹)

مگر اس قانون پر کوئی روشن دماغ اعتراض نہیں کرتا لیکن اگر بڑی سرکار (اللہ تعالیٰ) کا کوئی ملازم ہو اور اس کے لئے وہ اسباب معاش ترک کر دے تو اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ نکمے ہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں

آگے حکیم الامت خود اس سرکاری قانون کی حکمت بتاتے ہیں کہ

اس میں حکمت یہ ہے کہ ایک شخص دو طرف پورا متوجہ نہیں ہو سکتا اگر ملازم سرکار دوسرا کام کرے گا تو خود سرکاری کام میں خلل واقع ہو گا اس لئے

اس کو اجازت نہیں کہ بحالت ملازمت دوسرا کام کرے ،،

"اس لئے جو لوگ مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ دنیا کی ترقی کیوں نہیں کرتے، مشین اور کارخانے کیوں نہیں چلاتے وہ مثال مذکور کو پیش نظر رکھ کر خوب سمجھ لیں کہ جب یہ لوگ دنیا میں مشغول ہوں گے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا"

علماء کے کسب معاش کا نتیجہ اس نتیجہ کی بعض مثالیں حضرت نے خود اپنے علم و تجربہ کی بیان فرمائی ہیں۔ ایک مولوی صاحب ایک دینی مدرسہ میں ملازم تھے۔

مگر لکڑیوں کی تجارت کرتے تھے خود اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ مدرسہ کے وقت میں طلباء کو پڑھاتے بیٹھے ہیں کہ گاہک آگیا اور اس نے لکڑی کا سودا کرنا چاہا۔ پس مولوی صاحب کشمکش میں پڑ گئے۔ اگر اٹھتے ہیں تو مدرسہ کا حرج اور نہیں اٹھتے ہیں تو خریدار لوٹا جاتا ہے مجبوراً اس سے کہتے کہ بھائی ابھی اٹھتا ہوں ذرا ٹھہرو اس میں تھوڑا جھوٹ بھی ہوتا

غرض ان کا دل بٹ جاتا۔ سبق میں کچھ سے کچھ بیان کر جاتے پہلے تو طالب علموں کو ہنسی خوشی تبلاتے تھے اب دل دوسری طرف ہو گیا طلباء کچھ پوچھتے ہیں اور پوچھنے کے سبب اٹھنے میں دیر ہوتی ہے تو ان پر جھنجھلاتے ہیں، غصہ ہوتے ہیں علما کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہی اثر ہوتا ہے کہ دین کا کام پوری طرح نہیں کر سکتے ،، (صنـ۳)

ایک دوسرا اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ جو علماء خالص دنیا کے کسبی مشاغل میں زیادہ پھنسے رہتے ہوں طبعاً لوگوں کو ان کے دین و تعلیم پر اتنا اعتماد نہیں رہتا جتنا مستغنی و متوکل علماء پر، اس اثر کا ایک واقعہ بھی ان لکڑی والے مولوی صاحب ہی کا خود حضرت کے تجربہ میں یہ آیا کہ :-

"ایک روز میں (حضرت تھانوی) جا رہا تھا راستہ میں ایک بڑھیا اپنے دروازہ میں جھانک رہی تھی دیکھ کر بولی بیٹا یہاں آنا میں گیا تو بولی ایک مسئلہ تبلا دو، وہ یہ کہ زکات دینا مدرسہ میں جائز ہے یا نہیں؟ میں نے مسئلہ تبلا دیا۔ پھر کہنے لگی میں نے ان (لکڑی والے مولوی صاحب) سے بھی پوچھا تھا انہوں نے بھی تمہارے موافق تبلایا تھا مگر مجھ کو ان پر یقین نہ ہوا کہ شاید اپنے مطلب کے لئے کہتے ہوں اب تمہارے تبلانے سے یقین ہوا کیونکہ تم پر شبہ نہیں"

ان بڑی بی کو تو حضرت نے یہی سمجھایا کہ علما سے ایسی بدگمانی نہ چاہئے لیکن عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ علماء میں بھی جو حضرات دنیا کے کسبی و معاشی دھندوں یا مالی و مادی منافع کی فکروں میں جتنا زیادہ کھپے رہتے ہیں اتنا ہی زیادہ دانستہ یا نادانستہ معاملات و مسائل کی بے احتیاطیوں اور بے عنوانیوں میں بھی مبتلا ہوتے اور دنیوی و نفسانی اغراض سے مغلوب رہتے ہیں۔ لازماً ان کے وعظوں فتووں وغیرہ پر اتنا اطمینان نہیں ہوتا جتنا ان بکھیڑوں سے الگ تھلگ رہنے والے مستغنی و متوکل علماء پر ہوتا ہے۔ اسی بناء پر حضرت حکیم الامت کی تو حکیمانہ رائے یہاں تک ہے کہ خود دین کے کاموں کے لئے چندہ وغیرہ کے مالی معاملات میں بھی علماء کو نہ پڑنا چاہئے نہ ڈالنا چاہئے۔ حتیٰ کہ :-

مولوی کیا ہوتے ہیں بھاڑے کے ٹٹو

علمار سے چندہ کی تحریک بھی مت کراؤ نہ انہیں چندہ وصول کرنے کے لئے مقرر کرو اس میں بھی ان کا اعتبار جاتا ہے علمار سے بس وہی کام لو جس کے لئے وہ ہیں (کہ ان سے بس دین سیکھو) مگر آج کل ان سے وہ کام لیا جاتا ہے جو ان کا نہیں کا نفرنسوں میں علمار کو صرف اس لئے بلاتے ہیں کہ ان کے قال اللہ و قال الرسول کے ذریعہ خوب چندہ ہوگا (یا عام مسلمان ہمارے ساتھ ہو جائیں گے) سبحان اللہ مولوی کیا ہوئے بھاڑے کے ٹٹو، علما کو (خود بھی) چاہئے کہ وہ ایسے امور سے احتراز کریں ان کا طرز تو وہ ہونا چاہئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا (ص ۲۱)

نبوت کے بعد حضور کا ترک معاش

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل پیمبرانہ منصب لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیام یا اس کی رضا و ناراضی کے احکام پہنچاتے رہنا تھا نبوت کے بعد آپ کسبی یا معاشی مشاغل میں نہیں پڑے نہ لوگوں سے سوال و طلب کا معاملہ رکھا۔ سورۃ مومنون میں براہ راست خود آپ ہی کو خطاب فرما کر ارشاد ہے کہ آپ لوگوں سے کچھ خرچ تو مانگتے نہیں آپ کو تو جو کچھ بے مانگے آپ کا پروردگار دیدیتا ہے وہی بہتر ہے اور وہی بہترین روزی رساں ہے۔ آپ کا کام تو بس لوگوں کو سیدھی راہ بتلاتے اور اس کی طرف بلاتے رہنا ہے۔

چندہ وغیرہ مانگنا علماء کا کام نہیں

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ

اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ سو مانگنا علماء کا کام نہیں اور ان نصوص کی بنا پر ان کی شان کے بھی خلاف ہے اور وہ بات بھی جو اوپر ذکر کی گئی یعنی اس سے ان پر بدگمانی ہوتی ہے اس لئے علما کو چاہئے کہ وہ یہ (چندہ کی تحریک کا) کام بھی نہ کریں۔ یہ تحریک ان کے فرض منصبی کے کام میں مخل ہوتی

اس کا اثر

ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ چندہ کے واسطے امراء کے دروازے پر جانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ہم کسی امیر کے پاس جائیں اور وہ شطرنج کھیل رہے ہوں (یا کسی اور منکر و معصیت میں مبتلا دیکھیں) تو ہم ان کو منع نہیں کر سکتے کیونکہ ہم اپنی غرض لے کر ان کے پاس جاتے ہیں اس لئے دبنا پڑتا ہے (خیر المال صد ۴۳)

کسب حلال و مستحب تک کا ترک

دیکھا آپ نے یہی نہیں کہ اسلام نے حرام و حلال جائز و ناجائز مکروہ و مستحب کی بہت سی قیدیں اور پابندیاں لگا کر کسب معاش کے بہت راستوں کو بند کر دیا ہے بلکہ دین کے خدمت گذاروں کو اور علمائے دین کے پورے طبقہ کو جہاں تک ہو سکے جائز و حلال مالی و معاشی معاملات تک سے الگ رہنے ہی کو پسند کیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ مال و معاش سے اتنا دور و نفور رہ کر آخر یہ علماء اپنے اور اپنے بال بچوں کے تن پیٹ کا کیا کریں؟ اس کا جواب ضروری تفصیل کے ساتھ خود کتاب و سنت کی نصوص و ہدایات کی رو سے تجدید تعلیم و تبلیغ میں الحمدللہ شافی کافی طور پر دیا جا چکا ہے اور اگر قلب ذوق ایمان سے کچھ آشنا ہو۔ وہی کہ ایمان نے دل میں گھر کر لیا ہو تو خیر المال ہی کے آخر کی

چند سطریں غور سے پڑھتے چلیں۔

مومن کا اصل مال

وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ؕ

یعنی اللہ میاں جس کو چاہیں بے حساب روزی دیں ان کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جس کو دیتے ہیں محض اپنے فضل و مشیت سے جس میں کسی کو مزاحمت کا منصب نہیں...... یہ ہے مومن کا اصل مال۔ باقی جس کو ہم اصل مال سمجھتے ہیں وہ مال نہیں جو مآل میں کام آوے (یعنی اعمال صالحہ) وہ ہے مال حقیقی۔ واللہ مال سے وہ راحت نہیں جو اعمال سے۔ اس کو فرماتے ہیں وَمَنْ یَّعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی الآیۃ اور یہ کہ ہم نیک کام کرنے والوں کو جو مومن ہیں دنیا میں بھی پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے یعنی ایسی زندگی جس میں راحت ہی راحت ہوگی یعنی دل کو سکون و اطمینان ہوگا۔

دوسری جگہ اس کے مقابل ارشاد ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَعْمٰی یعنی جس نے منہ موڑا میری یاد سے اس کو ملتی ہے تنگی کی روزی اور قیامت کے روز اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ یہ نتیجہ ہے خدا سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت میں رہا اور وہاں بھی مصیبت، مشاہدہ ہے کہ دنیاداروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہی ہے مال و دولت ان کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت جس کا نام ہے وہ میسر نہیں بعض اوقات تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں اور اعمال صالحہ میں مال کا عیش بھی اور مآل کا عیش بھی، دنیا بھی اچھی آخرت بھی اچھی۔ اصل مال اس کو کہنا چاہئے۔" (ص ۴۹)

انفاق مال اسلام کی کسبی معاشیات کی نوعیت اصلاً اگرچہ غیر کسبی ہے تاہم بجائے خود یہ غیر اہم ہرگز نہیں بلکہ اسی طرح زیادہ اہم و اقدم ہے جس طرح منافع کے حصول و کسب سے بھی مقدم مضرتوں سے بچنا بچانا ہوتا ہے خود حضرت علیہ الرحمۃ نے بھی مال و معاش کے مشاغل یا تصرفات میں اصل مباحث دو ہی قرار دیئے ہیں ایک مال کا کسب یا حاصل کرنا اور دوسرے اس کا انفاق یا خرچ کرنا۔ اور احکام المال میں گفتگو کا عنوان اس آیت کو قرار دیا ہے جو اسلام کی کسبی معاشیات کی غیر کسبی نوعیت پر دلالت کرتی ہے یعنی لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ پھر پہلی شق کسب مال کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے کہ

> یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ تحصیل مال کے متعلق تھا......
> اور دوسری شق مال کے خرچ کرنے کی باقی رہ گئی ..... اور مال میں دو ہی تصرف ہیں ایک اس کا حاصل کرنا دوسرے اس کا خرچ کرنا" (ص۴۴)

حفاظت مال اور باوجودیکہ اسلام کی اصل ایجابی معاشیات انفاقی معاشیات ہے جو خرچ کرنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لئے راقم ہذا نے اس کی ضروری تفصیل اوپر ایک مستقل باب میں ضروری خیال کی۔ لیکن کوئی بڑی سے بڑی حویلی ایسی نہیں جس کو آدمی اپنے سوء استعمال کی بے تمیزیوں اور بے اعتدالیوں سے بدترین شر یا بدی نہ بنا دے سکتا ہو، مجدد وقت کی اس معاملہ میں تجدید کا رخ انفاق کی ان بدا ستعمالیوں ہی کی اصلاح کی طرف زیادہ ہے وقت کے حالات و مصالح کا مقتضا و مطالبہ بھی بہت زیادہ یہی ہے اور اسی لئے کہنا چاہئے کہ کسب

مال و انفاق مال کے علاوہ "حفاظت مال" کو بھی مالی و معاشی مباحث و مشاغل کا ایک الگ تیسرا درجہ یا عمل قرار دیا ہے۔ اسباب الغفلت (ص۵) میں تحریر فرماتے ہیں کہ:-

مال میں عمل کے تین درجے ہیں۔ مال کا [1] پیدا کرنا، مال کی [2] حفاظت کرنا اور مال کا [3] صرف کرنا

اس کے معنیٰ لیکن مال کی حفاظت کے معنیٰ اس کو تجوریوں میں بند کر کے محض چوروں سے بچانا نہیں بلکہ ناجائز و حرام یا بے محل مصارف سے بچانا ہے چوری ڈاکہ سے مال روز روز نہیں جایا کرتا اور جو جاتا بھی ہے اس میں ہم معذور و مجبور ہوتے ہیں بخلاف اس کے ناجائز و نامناسب مصارف کی راہ سے تو ہم اپنے ہاتھوں اپنے مال کو برباد کرتے ہیں، صریح معاصی و محرمات کا ذکر ہی کیا اسلام نے تو مباحات بلکہ خیر خیرات تک میں بے اعتدالی یا اسراف کو پسند نہیں کیا۔ سورۂ بنی اسرائیل (ع ۳) میں جہاں ایک طرف قرابت داروں، محتاجوں، مسافروں کا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے وہیں ساتھ ساتھ فضول خرچی سے نہ صرف منع فرمایا بلکہ فضول خرچوں کو شیطان کا بھائی تک قرار دیا ہے

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ

بعض آیات کا مدلول حفاظت مال غرض حضرت مجددؒ کی اس تنبیہ کے بعد کسب و انفاق کے علاوہ مال سے متعلق ایک عمل یا درجہ اس کی حفاظت کا بھی ہے خود قرآن مجید کی مذکورہ بالا قسم کی بعض آیات کی طرف ذہن گیا تو ان کا اصل مدلول بھی مال کی حفاظت ہی معلوم ہوا۔ کھانے

پینے کی حلال و جائز چیزوں تک میں حد سے تجاوز یا اسراف سے روکنے کا منشاء مال کو بے محل بربادی سے بچانا ہی ہے۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ٥ لیکن اسراف کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کانٹے کی تول تپی تلی ضرورتوں سے قدم ذرا بھی آگے نہ پڑنے پائے۔ اور خدا نے زیب و زینت کی اور کھانے پینے کی جو عمدہ عمدہ پاک و پاکیزہ چیزیں اپنے بندوں ہی کیلئے پیدا فرمائی ہیں ان کو راہبوں، سنیاسیوں کی طرح سرے سے حرام ٹھہرالیا جائے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (اعراف ع ۳)

میانہ روی البتہ زینت و لذت ہی کو آج کل کی طرح مقصود زندگی نہ بنالیا جائے۔ اس کی فکر و طلب میں انہماک نہ ہو اعتدال ضرور ہے خرچ میں بھی اسی اعتدال و توسط کا امر اس طرح فرمایا کہ نہ تو بخل میں آکر ہاتھ اتنا سمیٹ لو کہ گویا گردن سے باندھ لیا۔ اور نہ فضول خرچی میں آکر بالکل ہی کھول دو۔ کہ بالآخر ملامت زدہ، درماندہ ہو کر بیٹھ جانا پڑے۔ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ع ۳)

سورۂ فرقان میں خدا کے خاص بندوں کا ایک خاص وصف یہ بھی بیان فرمایا گیا کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول اڑاتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں بلکہ میانہ روی سے کام لیتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ط

حفاظت مال کی بعض قرآنی تاکیدات

سورۂ بقرہ کے پورے ایک رکوع (۳۹) میں مالی معاملات یا لین دین میں لکھنے لکھانے اور گواہی و شہادت وغیرہ کی جو غیر معمولی تاکید ملتی ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا
تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ وَلْيَكْتُبْ
بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ
وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ
يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ
فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ
عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ
رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ
شَيْـًٔا فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ
عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ
ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ
يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ
بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا
شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ
فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ
فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ .....

اے ایمان لانے والو جب ادھار
کا کوئی معاملہ کسی خاص میعاد کے لئے
کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو
چاہئے کہ انصاف سے لکھے اور کوئی
لکھنا جاننے والا لکھنے سے انکار نہ کرے
جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے (اسی لئے) لکھنا
سکھلایا ہے کہ (ایسے مواقع پر) ضرور
لکھ دیا کرے اور لکھوائے وہ شخص
جس کے ذمہ حق کہتا ہو، اور اپنے پروردگار
اللہ سے ڈرتا ہے اور کمی ذرہ برابر
نہ کرے البتہ جس کے ذمہ حق ہے اگر
وہ کمزور و کم عقل ہو یا (کسی اور وجہ
سے) خود نہ لکھا سکتا ہو تو ایسی صورت
میں اس کا ولی ٹھیک لکھا دے
اور مردوں میں سے دو کو گواہ بھی بنالیا
کرو۔ اگر دونوں مرد (میسر) نہ ہوں تو
ایک مرد اور دو عورتوں کو کہ اگر ایک بھول

..... وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا وَلَا تَسْئَمُوْٓا أَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا أَوْ كَبِيْرًا ......

جائے تو دوسری یاد دلا دے اور یہ سب ایسے گواہ ہوں جن کو تم گواہی کے لئے پسند کرتے ہو (یعنی سچے اور انصاف پسند) ..... اور گواہوں کو جب گواہ بننے کے لئے کہا جائے تو اس سے انکار نہ کریں۔ اور لکھنے سے جان نہ چراؤ خواہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

آگے اور اسی سلسلہ کی تنبیہات چلی گئی ہیں اس کے بعد پھر ایسی صورت کا بیان ہے جس میں اتفاق سے کوئی لکھنے والا میسر نہ ہو مثلاً سفر میں ہو۔ اس کے لئے ارشاد ہے کہ:۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗ آثِمٌ قَلْبُهٗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ

(البقرہ پ ٣)

اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے تو رہن کے طور پر کوئی چیز (قرض دینے والے کے) قبضہ میں دیدی جائے ہاں اگر ایک دوسرے کا اتنا اعتبار ہو (کہ رہن کی ضرورت نہ ہو) تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اس کو چاہئے کہ اس اعتبار کا پورا پورا حق ادا کرے اور اپنے پروردگار سے ڈرے اور گواہی کو چھپاؤ مت اور جو چھپائے گا اس کا قلب گناہ میں مبتلا ہوگا اور اللہ تعالیٰ تمہارے (قلب و قالب سب کے) عمل کو خوب جانتا ہے (لہذا دل میں بھی کسی بات کو چھپا کر اللہ کی گرفت سے نہیں بچ سکتے)

ان آیات و تنبیہات سے جہاں اور بہت سی جزئی احکام نکلتے ہیں وہاں خاص زور اس پر بھی ہے کہ سفر و حضر ہر حال میں مالی معاملات میں ایسی حفاظتی تدابیر اختیار کیجائیں کہ حتی الامکان کسی کا کوئی مالی حق ضائع ہو اور نہ اس میں کوئی جھگڑا پیدا ہو۔

حضرت حکیم الامت نے ان ہی آیات کے ذیل میں کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ

> آیت مداینت (قرض کے لین دین) سے زیادہ کوئی آیت رحمت کی نہیں اس میں اللہ تعالی نے حفاظتِ مال کے طریقے تلائے ہیں کہ جب کسی کو قرض دیا کرو تو لکھ لیا کرو، دو آدمیوں کو اس پر گواہ کر لیا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالی کو ہمارے پیسہ کا نقصان بھی گوارا نہیں ، (عمل الشکرہ ص۱۳)

باقی حدیثوں میں اس طرح کے حفاظت مال سے متعلق مختلف احکام و ہدایات کے علاوہ خاص طور پر صراحۃً بھی مال کو رائگاں کرنے کی ممانعت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کو برباد کرنے سے روکا۔ نهٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اضاعۃ المال

معاشی پریشانیوں کا سب سے بڑا سبب

ہماری مالی و معاشی پریشانیوں اور تنگیوں کا سبب بالعموم نہ مال و معاش کے کسب و حصول کے ذرائع کی کمی و دشواری ہوتی ہے نہ حسب ضرورت اور توسط و اعتدال کے ساتھ خرچ و انفاق، سب سے زیادہ ان پریشانیوں کی ذمہ داری ہمارے اسراف و تبذیر یا بے جا و بے موقع فضول خرچیوں پر عائد ہوتی ہے مزدور پیشہ طبقہ کے افراد ہی کو دیکھئے

کہ عام طور سے لنگوٹی باندھے پھرتے ہیں۔ جاڑوں میں بھی کم ہی کسی کے بدن پر کوئی گرم کپڑا دکھائی دیتا ہے لیکن ساتھ ہی کوئی ہو گا (سینما شراب والوں کا ذکر نہیں) جو بیڑی سگریٹ چائے وغیرہ کی فضولیات پر روزانہ چار چھ آنہ خرچ نہ کر دیتا ہو یعنی دس بارہ روپیہ ماہوار، سوچئے کہ اتنے ہی میں کیا اپنا اور بال بچوں کا تن پوری طرح نہیں ڈھکا جا سکتا ہے۔

انفاقی اصلاحات کے ذیل میں مجدد تھانوی نے احکام المال میں خصوصیت کے ساتھ انفاق کی بے احتیاطیوں یا فضول خرچیوں کی اصلاح پر زیادہ متوجہ و متنبہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"خرچ میں یہ بے احتیاطی دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو یہ کہ کھلے معاصی میں خرچ کیا جائے دوسری صورت یہ ہے کہ کھلی معصیت میں تو مال خرچ نہ کیا جائے مگر خرچ حد سے زیادہ کیا جائے، شہوات میں منہمک ہو گئے تنعم و تفاخر میں اڑانا شروع کر دیا۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ تنعم و تفاخر کا انجام ذلت ہے کیونکہ اموال غیر متناہی تو ہیں نہیں کہ کتنا ہی خرچ کرو وہ کم نہ ہوں۔ (صـ۴۲)

خوشحالوں کی بدحالی آگے اس سلسلہ میں اچھے اچھے مالداروں اور خوش حالوں کی تباہی و بربادی کے بعض واقعات خود اپنے علم و تجربہ کے دوسروں کی آنکھیں کھولنے کے لئے بیان فرماتے ہیں مثلاً۔

ایک شخص کو دیکھا کہ مسجد کا سقاوہ بھرا کرتے تھے اور لوگ ان کو نواب کہہ کر پکارا کرتے تھے میں نے کہا کہ یہ نواب کیسے ہیں ؟

معلوم ہوا کہ واقعی نواب تھے اپنے آپ کو تباہ کر کے اس اوقات پر آگئے ہیں۔ میں نے کہا شاباش یہ انجام ہے مسلمانوں کا۔ صدہا امراء رؤساء فضول خرچیوں کی بدولت تباہ ہو رہے ہیں (ص۴۴)

ایک اور باہمت کا کمال سنئے۔

کانپور میں ایک رئیس کا انتقال ہوا ساری جائداد بیٹے کے ہاتھ آئی اس نے اڑانا شروع کر دیا۔ اس کے والد کے ایک دوست نصیحت کرنے آئے بہت دیر تک سمجھایا وہ چپکا گردن جھکائے بیٹھا رہا یہ بہت خوش ہوئے کہ میری نصیحت کارگر ہوئی جب یہ سمجھا چکے تو اس نے کہا کہ بس آپ کہہ چکے یا کچھ اور کہنا ہے انہوں نے کہا کہ بس مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ وہ اٹھا اور طاق میں سے ایک لنگوٹی اٹھا کر لایا اور کہا سنئے فضول خرچی کا زیادہ سے زیادہ انجام یہ ہے میں نے جس روز سے فضول خرچی شروع کی اسی روز سے اس کے لئے آمادہ ہو گیا ہوں اور یہ تہ کر کے رکھ چھوڑی ہے وہ بیچارے نصیحت گر اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

غرض بعض فضول خرچ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ لنگوٹی سے آگے تو اور کچھ نہیں۔ لنگوٹی باندھ لیں گے۔ سو ایسے باہمت بھی ہیں (ص۴۵)

مسلمان غیروں کے نہیں ہمیشہ اپنے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں

اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ایک معاشی کیا معاشی و سیاسی انفرادی و اجتماعی، اخلاقی و سماجی جو اور جس طرح کی تباہی بھی ان پر آتی ہے غیروں کے نہیں، اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر، خود اپنے ہاتھوں آتی ہے،

اسلام آہنی قلعہ ہے میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمان دوسری قوم کے ہاتھ سے کبھی تباہ نہیں ہوئے ہیں اپنے ہی ہاتھ سے۔ اسلام ایک قلعہ ہے آہنی دیوار ہے، جس میں مسلمانوں کو بسایا گیا ہے اس دیوار کو کوئی دوسرا توڑ نہیں سکتا باقی اس کا کیا علاج کہ کوئی خود ہی دشمن کے لئے پھاٹک کھول دے۔ اگر یہ مسلمان اسلامی) طریقہ سے رہیں تو (کسی معاملہ میں) کسی سے مغلوب ہو ہی نہیں سکتے یہ تو حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) ہیں جن کے بارے میں ہے فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغَالِبُوْنَ ہ یہ تو غالب ہی رہیں گے، خود ہی اپنا ناس کر لیں تو اور بات ہے، مسلمان پر جب تباہی آتی ہے اپنے ہی ہاتھوں آتی ہے۔

ایک اور دانشمند کی داد دیجئے، بڑے صاحب جائداد تھے صدہا قسم کی فضول خرچیوں میں پوری جائداد ختم کر کے نوبت یہاں تک پہنچی کہ میرے تمہارے پاس پہنچتے اور ہاتھ پھیلاتے کہ آٹھ آنہ پیسہ ہی دیدو، بہت ضرورت ہے .... میرے تو (حضرت کے) والد کے پاس بھی اکثر آتے میں اس زمانہ میں پڑھا کرتا تھا ان کی یہ حالت دیکھتا۔ مگر لوگ کہاں تک دیتے انہوں نے تو پیشہ ہی کر لیا تھا آخر انکار کر دیتے،، ٹیپ کا بند۔ داد طلب دانشمندی کا آگے سنیئے!

،، جو وقت ان کے پاس جائداد تھی اس وقت اگر کوئی ان کو نصیحت کرتا کہ اس طرح فضول خرچیاں مت کرو جائداد بیچ کر مت اڑا ڈالو۔ تو آپ فرماتے کہ ہمارے باپ بیوقوف تھے کہ چاندی دیکھ مٹی

(روپیہ دے کر زمین) لیتے تھے ہم مٹی دے رہے ہیں اور چاندی خرید رہے ہیں۔ اپنی حماقت سے یہ نہ سمجھا کہ مٹی تو چاندی کی بھی جان ہے۔ (ص ۴۶)

جائداد بھی اللہ کی خاص نعمت ہے واقعی عالم اسباب میں غیر منقولہ جائداد بھی اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت اور برکت ہے آج زمینداری ختم ہوجانے پر بھی دیکھا جا رہا ہے کہ جو لوگ خالی نواب نہیں بنے رہے تھے اور سیر خود کاشت یا باغات وغیرہ کی صورت میں خود اپنی جائداد سے کچھ کام لیتے رہے تھے وہ اب بھی ننگے بھوکے نہیں۔ بلکہ بعض تو اپنی زمین پر خود محنت کرنے والے بدنام زمینداری سے بہتر حال میں ہیں۔ آخر کچھ تو بات ہے کہ خود پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ:۔

"اگر کسی کے پاس جائداد ہو اور وہ اس کو کسی مصلحت سے بیچے تو فوراً اس کی جگہ دوسری جائداد خرید لے کیونکہ روپیہ پیسہ میں برکت نہیں یعنی وہ رہنے والی چیز نہیں ہے بھی یہی کہ روپیہ رہتا نہیں"۔ (ص ۴۶)

خود مجدد وقت کا مذاق تو موجودہ حالات میں یہاں تک تھا کہ کسی موقعہ پر نظام آباد تشریف لے جانا ہوا تو وہاں سے حیدرآباد خاص کر اس لئے تشریف لیگئے کہ مسلمانوں کی دنیوی ثروت و عزت دیکھ کر دل خوش ہو۔

گو میں مسلمانوں کے لئے فی نفسہٖ مالدار ہونا پسند نہیں کرتا مگر دوسروں کے مقابلہ میں پسند کرتا ہوں بشرطیکہ وہ احتیاط کریں۔ اسی لئے جس کو بھی (معاصی یا فضول خرچی میں) مال اڑاتے دیکھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ اس کو کیا ہوگیا کہ خدا کی نعمت کی قدر نہیں کرتا، میں تو علاوہ معصیت ہونے کے دنیا کی مصلحت سے بھی اسراف کو پسند نہیں کرتا۔ دنیا کے

مصالح بھی تو اس میں ہیں کہ مال کو بیجا صرف نہ کیا جائے"۔ (ص۹۴)

حضرت سفیان ثوریؒ جیسے محقق و متقی اہل اللہ جو صرف تارک الدنیا ہی نہیں دنیا اور دنیا داروں سے انتہا درجہ کی نفرت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ جب ہارون الرشید کی تخت نشینی کا جلسہ ہوا۔ جس میں علماء و فقراء کو بہت کچھ ہدایا ملے مگر آپ ملنے بھی نہ گئے۔ حالانکہ آپ سے بچپن کی دوستی تھی دونوں ساتھ کھیلے تھے.....

چنانچہ تخت نشینی کے قصوں سے فارغ ہو کر خود ہارون نے پرانا تعلق یاد دلا کر لکھا کہ :-

تم میرے بھائی ہو، میری تخت نشینی سے تمہارا جی خوش ہونا چاہیئے تھا مگر تم ملنے بھی نہ آئے، آتے تو مجھے خدمت کرنے کا موقع ملتا.... مگر جس وقت سفیان ثوری کے پاس یہ خط پہنچا تو انہوں نے ہاتھ بھی نہ لگایا بلکہ ایک لکڑی سے کھولا اور پشت پر جواب لکھوا دیا جس کے شروع میں یہ مضمون تھا کہ ظالم ہارون الرشید کو واضح ہو جس نے مسلمانوں کے حق پر قبضہ کیا (ص۹۵)

ان کا قول بعض بظاہر دنیا داروں میں بھی ایمان کی چنگاری کیسی دبی ہوتی ہے کہ خط لیجانے والا دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ کے خط کے ساتھ اللہ کے ایک فقیر کا یہ معاملہ دیکھ کر دنیا سے اتنا بیزار ہوا کہ جواب خط پہنچانے کے ساتھ ہی نوکری سے استعفا بھی پیش کر دیا، خود ہارون الرشید بھی اتنا متاثر ہوا کہ رو پڑا اور کہا کہ :-

"افسوس پیام لیجانے والا تو کامیاب ہو گیا اور پیام بھیجنے والا محروم رہا" غرض ایک طرف دنیا اور دنیا والوں سے یہ بے تعلقی بلکہ تنفر، دوسری طرف بقول حضرت

حکیم الامت کے یہ حضرات ایسے حدود شناس تھے کہ انہی سفیان ثوری کا قول ہے کہ:۔

"جس کے پاس پیسہ ہو تو اس کی قدر کرے اڑائے نہیں ......
کیونکہ الحلال لا یتحمل الاسراف یعنی حلال مال میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ اسکو فضول خرچ کیا جائے اور اس کی مصلحت یہ بیان فرماتے ہیں کہ لولا ھذہ الدراھم لتمندل بنا ھذہ الامراء۔ کہ اگر ہمارے پاس یہ دراہم نہ ہوتے تو یہ امرا ہم کو دست مال و پامال کر دیتے۔

انفاق سے بہتر بخل ہے

"واقعی جس کے پاس مال ہوتا ہے اس پر امرا یا حکام (آسانی سے) دست اندازی نہیں کر سکتے مال والا آن بان سے رہتا ہے اس کی وہ عزت ہوتی ہے جو بے پیسہ والے کی نہیں ہو سکتی اس کو اپنا سر نیچا نہیں کرنا پڑتا، پس ایسی چیز کو برباد کرنا کتنی بڑی حماقت ہے"

اے بسا امساک کز انفاق بہ مالِ حق را جز بہ امرِ حق مدہ
خوب سمجھ لو یہ مال تمہارا نہیں ہے خدا کا ہے بس ان کا مال جب دو ان کی اجازت سے دو جب تک ان کی اجازت نہ ہو ہرگز نہ دو" (ص۵)

دین کی عزت

محقق و مربی علمائے ربانی تو اپنے ہاں آنے جانے والے امرا کے ساتھ خصوصاً استغناء کا معاملہ فرماتے ہیں اور موقع آجائے تو ان سے لینے کے بجائے خود ان کو دیدیتے ہیں۔ حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے اپنے بزرگوں کا

مذہب یہ بیان فرمایا ہے کہ اپنی کسی بات سے دین کی عزت میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دے، جو بات کی جاتی اس میں نیت یہ ہوتی کہ دین کی عزت ہر طرح محفوظ رہے اس کی مثال میں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رنگ بیان فرماتے ہیں کہ

مولانا گنگوہی کی مثال آپ کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ کا پوستین ایک جگہ سے آیا ایک نواب آپ کے یہاں آئے ہوئے تھے آپ نے وہ ان کو دیدیا اور فرمایا کہ میرے کام کا تو ہے نہیں کیونکہ پوستین ایسا ہو تو باقی لباس بھی ویسا ہی ہونا چاہیئے اور آپ کے کام آئیگا کیونکہ آپ کا سارا لباس ایسا ہی ہوتا ہے مولانا اس طرح نہ رہتے تھے کہ کسی نواب یا امیر سے گردن نیچی کرنے پڑے .... بے محل ہزاروں روپیہ بھی نہ لیتے اور ایسے روپیہ دو روپیہ بھی قبول کر لیتے، ایک مرتبہ ایک بادشاہ نے دس ہزار روپیہ بھیجا آپ نے واپس فرما دیئے اور فرمایا کہ ضرورت کے لائق میرے پاس روپیہ بہت کچھ موجود ہے اس قدر کیا کرونگا سو امیروں کے ساتھ تو یہ برتاؤ تھا اور غریبوں سے روپیہ دو روپیہ بھی لے لیتے تھے " (ص ۱۵۱)

حکیم الامت کی اصلاحی نگاہ بعض ایسی فضول خرچیاں ہیں جن کو لوگ عموماً بڑی سیرچشمی، وضعداری و مہمان نوازی خیال کرتے ہیں، آگے دیکھئے کہ امت کے حکیم کی اصلاحی نگاہ کیسے کیسے چوروں کو پکڑتی ہے۔

احسان کا غلط طریقہ مسلمان کو اگر کسی کے ساتھ احسان کرنا ہو

تو اس کی صورت یہ نہیں کہ دسترخوان بڑا وسیع ہو آج بریانی پک رہی ہے، آج پلاؤ قورمہ تیار ہو رہا ہے ..... اس سے تو چار غریب مسلمانوں کا بھلا ہوتا۔ یہ کیا کہ بے حاجت لوگوں کے لئے قورمہ بریانی پکائی جا رہی ہے ...... ایک ڈپٹی تھے تین سو روپیہ ان کی تنخواہ تھی مگر کافی نہ ہوتی تھی کیفیت یہ تھی کہ دو دو مہینے عزیز پڑے ہوتے ہیں پھر تنخواہ کس طرح کفایت کرتی۔ میں نے کہا کہ یہ کیا بکھیڑا اگار کھا ہے ایسا ہی عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہے تو حسب گنجائش تنخواہ کردو، بعض عزیز چولھے تک شامل تھے میں نے کہا کہ سب کے چولھے الگ کردو، سوا میاں بیوی کے، اور دیکھو میرا نام ظاہر نہ کرنا کہ اس کی رائے ہے، مگر اس پر عزیزوں نے ان کا بہت پیچھا کیا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے میرا نام لے دیا۔ تب کہیں وہ لوگ چپ ہوئے خلاصہ یہ کہ عزیزوں کے ساتھ سلوک کرنا چاہئے تو نقد دے دیئے کھانے وغیرہ کا قصہ نہ پھیلاتے اس میں بڑی خرابیاں پیش آتی ہیں۔ (ص ۵۲)

حضرت اپنے خادموں کو اذکار وظائف بتلانے سے بہت زیادہ ان کے معاملات اور معاشرت کی اصلاح پر توجہ فرماتے تھے کہ ان کی پریشانیوں میں نماز روزہ تک ٹھیک نہیں ہوتا۔ کسی نے لکھا کہ:۔

اہل اللہ کا مذہب تیس روپیہ میری تنخواہ ہے اور مہمان بہت آتے ہیں تنخواہ میں پورا نہیں پڑتا بہت پریشان ہوں، میں نے

لکھا۔ عرف کو تو طاق میں رکھ دو، جو تمہارا کھانا ہے سب کے سامنے رکھ دیا کرو کہ سب مل کر کھالو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا سب نے آنا چھوڑ دیا اور میں نے لکھا کہ اہل اللہ کا مذہب رکھو وضعدار لوگوں کا مت رکھو...... انہوں نے اس پر عمل کیا اس کے بعد لکھا کہ خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ نے بڑی اچھی تدبیر تبلائی میرا پیچھا چھوٹ گیا۔ (ص۵۲)

اہل اللہ کا جو مذہب و مشرب اختیار کرنے کی حضرت نے ہدایت فرمائی اس کے لئے مثال ایک بڑے بزرگ و عالم کی سنتے چلیں جو اچھے رئیس بھی تھے۔ کاندھلہ کے مولانا مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ گھر کے رئیس تھے مگر سادگی دیکھئے کہ ایک

دوسرے مشہور بزرگ و عالم مولانا مملوک علی صاحب دہلی سے آرہے تھے راستہ میں جب کاندھلہ پہنچے تو مولانا مظفر حسین صاحب سے ملنے گئے مولانا نے پوچھا کھانا کھا چکے ہو یا کھاؤ گے؟ کہا کھائیں گے۔ فرمایا تازہ تیار کرادوں یا جو رکھا ہے وہی لے آؤں؟ فرمایا جو موجود ہے وہی لے آؤ۔ بس آپ مٹی کی رکابی میں کھچڑی لے آئے ..... انہوں نے اس کو کھالیا اور پانی پی کر رخصت ہو گئے، یہ حالت تھی ان حضرات کی کہ جو ہوا سامنے رکھ دیا" (احکام المال ص۵۸)

مولانا گنگوہی کی مہمانی یہ تو ایک رئیس کی طرف سے اسلامی سادگی اور بے تکلفی کی مہمان نوازی تھی۔ خود بھی رئیس ایک مرتبہ مولانا گنگوہی کے

مہمان ہوئے صبح جب رخصت ہونے لگے تو مولانا نے کھانے کے لئے
عرض کیا۔ مولانا مظفر حسین رامپور جانے والے تھے۔ فرمایا
میری منزل کھوٹی ہوگی کیونکہ کھانا تیار کرانے میں دیر لگے گی، ہاں
اگر رات کا کھانا ہو تو لا دو، مولانا نے ماش کی دال اور باسی
روٹی لا دی۔ آپ نے رکابی کی دال روٹی پر الٹ کر پلے میں باندھ
لی اور رخصت ہو گئے۔ حالانکہ آپ رئیس تھے۔

آج ہمارے سفید پوش غریب بھائی بھی ایسی مہمانی قبول کرنے پر کتنے
آمادہ ہوں گے ان سچے پکے مسلمان رئیس نے خوش خوش قبول ہی نہیں کیا بلکہ
اس کی جو داد دی وہ قبول فرمانے سے بھی بڑھ کر "آدمیت" کا کیسا سبق ہے

بڑے اچھے آدمی

جب رامپور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین سے کہا کہ
مولوی رشید احمد بڑے اچھے آدمی ہیں حکیم صاحب نے کہا ہاں
واقعی بڑے بزرگ ہیں۔ آپ فرمانے لگے کہ میں تو کہہ رہا ہوں
کہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔۔۔۔۔ آپ کہتے ہیں کہ بڑے بزرگ ہیں۔
میں ان کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا ہوں میں تو کہہ رہا
ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں اگر خود نہیں سمجھتے تو پوچھ ہی لو۔ انہوں
نے کہا اچھا حضرت آپ ہی فرمائیے۔

آپ نے کہا دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں انہوں نے مجھ سے کھانے
کے لئے کہا۔ پھر میرے کہنے سے جو کھانا رکھا ہوا تھا بے تکلف
لا دیا۔ میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں"

۔۔۔۔۔۔۔

آدمیت کی ناقدری

آگے حضرت خود افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ آج کل ایسی سادگی یا "آدمیت" کی باتوں کو

مذمت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے صاحبو! اگر وقت پر باسی روٹی مل جائے تو وہ پلاؤ زردہ اور قورمہ سے اچھی ہے ... خوب سمجھ لیجئے کہ دین کے چھوڑنے سے دنیا کی بھی تکلیف ہوتی ہے اور عقل بھی مسخ ہو جاتی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ خدا کے لئے تو بُرا کھاؤ بُرا پہنو، نہیں اچھا کھاؤ اچھا پہنو مگر حدود کے اندر ہو۔"

دین چھوڑ کر عقل بھی مسخ ہو جاتی ہے۔

اب تو دین چھوڑ کر عقل واقعی ایسی مسخ ہو گئی ہے کہ دنیا کی بھی سچی راحت و آرام کے بجائے سارا زور فخر و تفاخر پر ہے، کپڑا تفاخر کے لئے پہنتے ہیں کھانا ہے تو تفاخر کے لئے مکان ہے تو تفاخر کے لئے (ص۵۸)

جس کی بدولت روپیہ پیسہ کی نہیں صحت وقوت اور وقت کی بھی کتنی فضول خرچی ہوتی ہے اور بارہا اس تفاخر و مباہات اور رسمی وضعداریوں کے نباہ میں اچھے اچھوں کو قرضدار تک ہو جانا پڑتا ہے اس لئے

مقروض ہونے کی پریشانی

ہم تو یہی تعلیم کریں گے کہ بلا ضرورت مقروض مت ہو گو رسم و رواج کے خلاف ہی کرنا پڑے، مقروض ہونے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت بُرا ہے

اہل اللہ کا مذہب یہی ہے اور (دنیا کی بھی) اس میں بڑی راحت ہے۔" (ص۵۲)

ایک اور آفت

روپیہ پیسہ والوں کو یہ لگ جاتی ہے کہ بہت سی ایسی بے ضرورت چیزیں خرید لیا کرتے ہیں جو اسلام کی صاف ستھری سادہ زندگی کے ساتھ کوئی میل نہیں کھاتیں اور اکثر کام بھی برائے نام آتی ہیں بلکہ پڑے پڑے خراب وضائع بھی بہت ہوتی رہتی ہیں۔ اس مد فضول کی اصلاح کے لئے خصوصیت کے ساتھ۔

"امراء کو ایک بات یاد رکھنی چاہئے جس سے اسراف سے نجات ہو اور انتظام بھی درست ہو کہ سب سے اول اپنے اسباب کا انتخاب کریں کہ کونسا ضروری ہے اور کونسا فضول، امراء میں یہ آفت ہوتی ہے کہ جو چیز پسند آئی خرید لی اس سے بحث نہیں کہ اس کی کوئی (واقعی صحیح) ضرورت بھی ہے یا نہیں، جب کسی دوکان پہ جاتے ہیں کچھ نہ کچھ ضرور خرید لیتے ہیں ان کے نزدیک یہ عار کی بات ہے کہ کوئی یوں کہے کہ دوکان پر آئے اور لیا کچھ بھی نہیں۔ گھر میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ بیکار رکھی رہتی ہیں عمر بھر کسی کام میں نہیں آتیں۔"

نئے فیشن زدہ

پرانے امراء کا قصہ تو اب پرانا ہو چکا، نئے فیشن والوں کے گھر خصوصاً ان کے ڈرائنگ روم کا اگر جائزہ لیں تو فرش سے لے کر منبروں، دیواروں، اور چھت تک حقیقی حاجت وضرورت کی چیزوں

سے زیادہ ایسی چیزوں کی تعداد نکلے گی جن کا آرائش و نمائش کے سوا سرے سے اور کوئی مصرف ہی نہیں اور یہ بلائے فیشن کے امراء ہی تک محدود نہیں اپنی اپنی بساط کے موافق کم و بیش ہر فیشن زدہ اس میں مبتلا ہوتا ہے، آرائش و نمائش کے حرص کی اور بات ہے ورنہ تو فیشن کی تو اکثر چیزیں سرے سے لایعنی اور مال و دولت کی نری بربادی ہوتی ہے۔ ورنہ

آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

بہر حال حکیم مصلح کی حکیمانہ صلاح سب کو یہ ہے کہ اس طرح گھر کا جائزہ لے کر

"جتنی چیزیں کام میں آتی ہوں رہنے دو اور جتنی کام میں نہ آتی ہوں خارج کر دو یا بیچ دو یا مساکین کو دیدو، نفلی صدقہ دینے کی ہمت نہ ہو تو زکوٰۃ ہی میں دیدو...... گھر میں بہت سی چیزیں ایسی دیکھو گے جو سڑ رہی ہیں، کسی کو دیمک لگ رہی ہے ایسی چیزوں کو اپنے ملک سے الگ کر دو تاکہ گھر میں رونق ہو" (صـ۵۳)

اسلام میں نماز روزہ ہی کی طرح کسب و انفاق کا بھی قانون ہے

دیکھا آپ نے کہ اسراف یا اضاعت مال کی بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں میں

ے اس آرائش بازی کی انتہا یہ کہ اخبار میں ابھی ابھی (۱۱ر جنوری ۱۹۵۵ء کی) کہیں اور کی نہیں پاکستان کی یہ خبر پڑھی کہ امریکہ سے معاشی امداد کا ایک معاہدہ ہوا ہے جس کی رو سے پاکستان کو ایک کروڑ لاکھ ڈالر کی امریکہ مدد دیگا مگر اسی پاکستان کے معاشی گداگری کی آرائش بازی یہ درج ہے کہ اس امداد میں ۴ لاکھ ڈالر کا سامان آرائش بھی شامل ہے۔

بھی ایمانی و اسلامی معاشیات کے نکتہ شناس کی نظر گھروں کے اندر بھی کن کن گوشوں تک گئی اور کیسی کیسی اصلاحی رہنمائیاں فرمائی ہیں اور کیوں نہ فرماتے عام مسلمان ہی نہیں اچھے اچھے دیندار اس غلطی میں گرفتار ہیں کہ :-

دین میں آمد خرچ (کسب و نفاق) کے متعلق کوئی قانون نہیں خوب سمجھ لو کہ جیسے نماز روزہ کا قانون ہے اسی طرح اس کا بھی قانون ہے، اگر کوئی نمازی بجائے چار رکعت کے چھ رکعت پڑھے یا کوئی روزہ عشاء تک رکھنے لگے تو گنہگار ہوگا۔ اسی طرح مال کو حد سے زیادہ خرچ کرنے سے بھی گنہگار ہوگا۔ خدا نے ہر چیز کے حدود مقرر کئے ہیں بس یہ حدود معلوم کرنا چاہئیں " (ص ۶۶)

قرض ادا نہ کرنے کی خرابی مسلمانوں میں زیادہ

فضول خرچی ہی کی راہ سے قرض کی مصیبت و نوبت آجاتی ہے اور پھر فضول خرچی ہی کی بدولت اس کا ادا کرنا دشوار ہوتا ہے جن کی نیت ادا کرنے کی ہوتی ہے وہ بھی نہیں کر پاتے اور یہ خرابی مجدد وقت کی رائے میں مسلمانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے کہ

قرض لے کر ادا نہیں کرتے (کہنا چاہئے کہ قرض ادا کرنے کی بالکل عادت ہی نہیں اس لئے ان کا اعتبار نہیں رہا۔ ہر ایک سے مانگتے ہیں اور کوئی نہیں دیتا۔

کتنی مشکلات کا حل حالانکہ اگر فضول خرچی کا مرض کسی معاشرہ میں نہ ہو اور لوگ حقیقی و واجبی ضرورت ہی پر قرض لیتے ہوں اور اس کی ادائی کا تا بہ امکان

وقت پر اہتمام رکھتے ہوں تو کتنوں کی کتنی معاشی مشکلات آسانی سے وقت پر قرض ہی سے حل ہو سکتی ہیں۔ جب کسی کے پاس بھی تھوڑا بہت اپنی ضرورت سے فاضل ہو دوستوں عزیزوں ہی کو نہیں غیروں کو بھی اس اعتماد پر بے تکلف دے سکتا ہے کہ وقت پر بلا کسی تقاضے یا بے لطفی کے واپس مل جائے گا اور یہ ضرورت سے فاضل قرض دینے کے لئے ایسے ہی معاشرہ میں لوگوں کے پاس کچھ نہ کچھ بچ سکتا ہے جس کے افراد فضول خرچی کے عادی نہ ہوں اور اپنے مصارف کو ضروریات ہی کی حد تک محدود رکھتے ہوں، حدیث میں تو قرض دینے کی ترغیب اور معاشی اہمیت اتنی ہے کہ خیر و خیرات سے بھی زیادہ اس کو موجب اجر قرار دیا گیا ہے

قرض دینے کا ثواب خیر و خیرات سے بھی زیادہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور قرض دینے سے اٹھارہ۔ آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا قرض وہی مانگتا ہے جسے سخت حاجت ہوتی ہے۔ (کیونکہ اسے واپس کرنا پڑتا ہے) بخلاف صدقہ کے (کہ واپس نہیں کرنا پڑتا اس لئے بے ضرورت بھی لوگوں سے مانگ سکتے ہیں) غرض قرض دینے کا اتنا بڑا ثواب ہے (کہ خیر خیرات کا نہیں)

بھلا عورت کے سوا اور کونسی نظر اتنی دور جا سکی ہوگی کہ قرض دینے کو نہ صرف نیکی بلکہ خیر و خیرات یا صدقہ سے بڑھ کر ثواب و نیکی کا کام قرار دیا گیا ہو۔ دین سے بیزار و بیگانہ ہو کر دنیا نے اپنی دنیا کو بھی کس طرح کھو یا اور بگاڑا ہے کہ اب نہ قرض لینے میں سخت حاجت کی ضرورت اور نہ لے کر ادا کرنے کی فکر و عادت، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

جب کوئی لے کر ادا ہی نہ کرے تو پھر کون دے! حالت یہ ہو گئی ہے کہ قرض دے کر وصول نہیں ہوتا حتیٰ کہ قرضدار سامنے آنا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی واسطے مولانا جامی فرماتے ہیں:۔

مدہ شاں قرض دستاں نیم حبہ　　فان القرض مقراض المحبہ

ایک بڑے معاشی حل سے محرومی

اور اب تو اتنی غیرت کتنوں میں ہے کہ نہ ادا کرنے کی شرم میں سامنا چھوڑ دیتے ہوں بلکہ بہتوں کو تو اگر قانون کی گنجائش اور قانونی نکتہ بازوں (وکلاء) کی شہ مل جاتی ہے تو تال ٹھونک کر عدالت کے میدان میں مقابلہ کرتے اور قسموں اور گواہیوں کے ساتھ صاف انکار کر جاتے ہیں۔ عدالت سے اگر اتفاق سے ہار گئے تو جب تک قرقیوں پر قرقیوں سے بھی نہ ہار جائیں تا بہ امکان نہ دینے ہی میں اپنی چالاکی و فرزانگی کا کمال جانتے ہیں اسلام کے دینی معاشیات کے بے سودی قرض کی کتنی بڑی معاشی اعانت اور رحمت سے لوگوں نے اس نادہندگی کی بے دینی ذہنیت کی بدولت اپنے ہاتھوں اپنے کو محروم کر لیا ہے۔ کسی کا واقعہ خود حضرت ہی کی زبانی سنئے۔

یہ حالت ہے مسلمانوں کی

کسی مقدمہ میں مظفر نگر آئے اتفاق سے جتنا روپیہ پاس تھا ختم ہو گیا۔ بڑے پریشان ہوئے آخر ایک صاحب سے اپنی پریشانی بیان کی اور کہا دس روپیہ قرض دیدیجئے گھر پہنچتے ہی بھیج دوں گا۔ انہوں نے ترس کھا کر دیدیا۔ گھر پہنچ کر خبر بھی نہ دی کچھ دنوں بعد کہیں ملاقات ہو گئی تو تقاضا کیا۔ تو کہتے ہیں کہ کوئی رقعہ ہے؟ یہ حالت ہے مسلمانوں کی۔ اس کو ایسی ہلکی بات سمجھتے ہیں[۱]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

(احکام المال ص۶۶)

ایک اور بڑی چیز سامنے آگئی۔ واقعی مجدد مبعوث کی نظر کہاں کہاں جاتی ہے آدمی کی بہت سی وقتی و عارضی ضرورتیں بغیر کچھ قرض لئے عاریت کے ذریعہ یا ایک دوسرے سے مانگ کر نکل جاتی ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا مستقل باب ہوتا ہے لیکن اس میں بھی لوگ اتنی بے پرواہی سے کام لیتے ہیں کہ مانگے کی چیز کی نہ پوری حفاظت کا خیال رکھتے ہیں اور نہ بے مانگے وقت پر واپسی کا۔ بارہا غریب دینے والے کو خود ہی بار بار تقاضا کرنا پڑتا ہے پھر اگر غفلت یا بے احتیاطی سے چیز خراب یا ضائع ہو جاتی تو نہ اس کی درستی و مرمت اپنے ذمہ جانتے ہیں نہ بدل یا عوض دینا۔ حالانکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ جیسی چیز کسی سے عاریت لے لی تھی جو ضائع ہو گیا تو آپ نے اس کا بدل دیا۔ اب ہمارا حال یہ ہے کہ

> چیز منگائی اور کام بھی ہو گیا مگر یہ توفیق نہیں ہوتی کہ واپس کر دیں جب دینے والا خود ہی طلب کرتا ہے تب دیتے ہیں اگر خود بھی دیں گے تو مدت کے بعد، اس میں بہت سی چیزیں گم بھی ہو جاتی ہیں خراب بھی ہو جاتی ہیں۔ (ص۶۷)

آگے دیکھئے کہ شریعت و مجدد شریعت نے ہماری کیسی کیسی بے احتیاطیوں پر

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) خود راقم احقر کو الحمد للہ اپنی وسعت و ہمت بھر دوستوں عزیزوں کو قرض دینے کی توفیق خاص طور پر نصیب ہوتی رہی مگر کیا عرض کیا جائے کہ عام مسلمانوں ہی کے نہیں دینداروں، خوشحالوں اور خوشحال دینداروں تک کے کیسے کیسے تجربات ہوئے کہ توبہ ہی کرتے بن پڑی۔

تنبیہ فرمائی ہے جہاں تک کسی کا خیال بھی شاید کبھی جاتا ہو۔
ایک بے احتیاطی یہ ہے کہ کھانے کے ساتھ جو برتن آتے ہیں انہیں فوراً واپس کرنے کی توفیق نہیں ہوتی (بلکہ بے تکلف) اپنے ہاں ان کا استعمال کرنے لگتے ہیں اس طرح مدت ہو جاتی ہے

فقہاء کی ژرف نگاہی

جب خود منگاتے ہیں تب ملتے ہیں خود میرے گھر میں یہ تساہل ہے،،

حالانکہ حضرت ایسی باتوں میں دن رات گھر اور باہر والوں سب ہی کو روک ٹوک فرماتے رہتے تھے۔ گھر والوں کو قدرتاً اور زیادہ، مگر طبیعتوں کی ساخت ہی کچھ ایسی الٹ گئی ہے کہ ان باتوں کو دین، دیانت، یا حسن معاشرت جاننے کے بجائے الٹے حقارت کی اور چھوٹی چھوٹی باتیں جانتے ہیں لیکن انہی باتوں میں ذرا شریعت کی احتیاط اور ان بدنام فقہائے شریعت کی ژرف نگاہی ملاحظہ ہو جن پر طنز و طعن کے بغیر ہمارے ماڈرن مجتہدین اپنے اجتہاد کا کوئی قدم مشکل سے اٹھا پاتے ہیں کہ انہوں نے اسلامی معاشرہ کو معاشرت کی ان بظاہر حقیر یا چھوٹی چھوٹی گندگیوں سے صاف ستھرا رکھنے اور بچانے کی کیسی کیسی احتیاطوں کی ہدایت کی ہے

جس برتن میں کھانا کوئی بھیجے اس میں کھانا حرام ہے اپنے برتن میں الٹ لو تب کھاؤ۔ ہاں ایک صورت میں جائز ہے کہ وہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلنے سے خراب ہو جاتا ہو یا اس کی آب جاتی رہتی ہو تب اسی برتن میں کھانا جائز ہے ورنہ نہیں، ہاں اگر مالک استعمال کی اجازت دے دے (یا عرفاً اجازت ہوتی ہو) تو جائز ہے

اور فقہا کا یہ اجتہاد بے دلیل نہیں۔

دلیل ان کے قول کی یہ حدیث ہے لا یحل مال امرئ الا بطیب نفسہٖ کھانا بھیجنے والوں کو ان کے برتنوں کا استعمال ناگوار ہوتا ہے۔ اور جب کہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلنے سے خراب ہو جاتا ہو یا اس کی آب جاتی رہتی ہو تو وہاں دلالۃً اذن ہوتا ہے بس خلاصہ فقہا کے کلام کا یہ ہوا کہ جہاں تک قرائن سے اجازت ہو تو جائز ہے اور اگر قرائن سے اجازت نہ ہو تو جائز نہیں،،

یہ باتیں صرف معاشرت ہی کی نہیں مالی معاملات کی بھی ہیں اس لئے ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ ”اموال کے بارے میں لوگ بڑی بے احتیاطیاں کرتے ہیں (احکام المال ص۶۷)

بے پیسہ کوڑی کا ایک معاشی حل

جو معاشرہ مال و معاشرت کی ایسی چھوٹی چھوٹی بے احتیاطیوں سے بھی پاک ہو اور جس میں لوگ خوشی خوشی ایک دوسرے کو وقتی ضرورت کی چیزیں بے تکلف مانگے دیتے ہوں اور مانگنے والے پوری حفاظت و احتیاط کے ساتھ استعمال کر کے ضرورت نکل جانے پر بلا تقاضا خود ہی واپس کر دیتے ہوں، سوچئے کہ ایسے معاشرہ میں ہر فرد کے کتنے کام بے پیسہ کوڑی کے آسانی سے نکلتے رہ سکتے ہیں جیسا کہ قرض کے معاملہ میں اگر لینے والے کو ادا کرنے کی فکر دینے والے سے زیادہ ہو اور ٹال مٹول کے بغیر خود ہی بلا تقاضہ جلد از جلد ادا کر دیتا ہو اور پھر آخرت کے لئے قرض کا ثواب و اجر صدقہ و خیرات سے بھی زیادہ ہو تو اسلامی معاشرہ میں کون مسلمان ایسا ہوگا جس کے پاس اپنی حاجت سے تھوڑا بہت بچ سکے اور وہ خوشدلی سے حاجتمند کو

بطور قرض نہ دیدے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ جس معاشرہ میں ایک طرف شراب وسینما وعیاشی وآوارگی ہر قسم کے چھوٹے بڑے گناہوں محرمات، مکروہات، پر مصارف کا دروازہ بند ہو اور دوسری طرف مباحات تک میں اسراف یا فضول خرچی کی اجازت نہ ہو اس میں ایسے افراد کی تعداد لازمًا زیادہ ہوگی جن کے پاس اپنی واجبی ضرورتوں سے کچھ نہ کچھ پس انداز ہوتا رہتا ہو جس سے نہ صرف آسانی سے وہ دوسروں کو قرض دے سکتے ہیں بلکہ بہتوں کا یہ پس انداز نصابِ زکوٰۃ تک پہنچ کر زکوٰۃ دینے والوں کی تعداد کو بھی بڑھاتا اور مستحقین زکوٰۃ کی معاشی دشواریوں کو دور کرتا رہیگا۔

خالص قرآنی معاشیات کا ایک اور بڑا معاشی حل

پھر اسلامی کیا خالص قرآنی معاشیات میں زکوٰۃ کے فرض وواجب یا جبری وقانونی انفاق کے ماسوا نفلی واختیاری انفاق پر جتنا زور ہے اور جس کی تفصیل معاشیاتِ انفاق کے باب میں گذر چکی اور جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے پاس اپنے اور اپنے متعلقین کے حقیقی ومناسب اخراجات سے جو کچھ بھی فاضل وزائد بچتا ہو سب ہی دوسرے حاجتمندوں پر خرچ کر دیا کرو یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے سوا کچھ اوپر ہی دوسری آیت ہے کہ:۔ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا یا کتنا خرچ کریں کہو کہ (یہ پوچھنے کی کیا بات ہے) جو کچھ بھی خرچ کر سکتے ہو یا کرنا چاہو ماں باپ رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں پر خرچ کرتے رہو (زیادہ پوچھ گچھ

کی ضرورت نہیں کیونکہ مستحقین پر خرچ کرنا بہر حال نیکی ہی ہے) اور نیک کام جو بھی تم کروگے سب کو اللہ تعالیٰ پوری طرح جانتا ہے (اور لازماً پورا پورا بدل دیگا)

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۖ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝

قرآنی تجارت و ایمانی

تجارت کے عام معنی زیادہ سے زیادہ کمانے کے ہیں لیکن قرآن جس تجارت کی تعلیم و دعوت دینے آیا ہے وہ نام ہے خدا کی راہ میں جان و مال سب کچھ زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کا۔ ارشاد ہے کہ:-

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	اے ایمان لانیوالو! کیا میں تم کو ایسی تجارت کا طریقہ نہ بتلاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے بچالے (وہ یہ ہے کہ) اللہ و رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کو خرچ کرنے کی کوشش کرتے رہو اگر تم سمجھو تو یہی (تجارت) تمہارے لئے بہتر ہے۔

اسلامی معاشیات میں جبری تقسیم دولت کی ضرورت ہی نہیں

غرض جس دین اور "یوم دین" والی معاشی تعلیم میں حاجتمندوں اور حقداروں پر طرح طرح سے خرچ کرنے کی اتنی تاکید و ترغیب ہو کہ معاشیات کسب کے بجائے

اس کو نام ہی ”معاشیاتِ انفاق“ کا دیدینا چاہیئے اس میں غیر اسلامی یا لادینی حکومتوں کی طرح مال و دولت کی جبر و زبردستی سے غیر اختیاری تقسیم کی ضرورت ہی کتنی رہ جاتی ہے۔ اسلام کی دینی حکومت کا اصل کام تقسیم دولت کے لئے قدم قدم پر جبر و تشدد نہیں بلکہ شہریوں میں خدا و آخرت کے ایمان پر مبنی انفاقی ذہنیت کو پیدا کرنے اور ترقی دیتے رہنا ہے جبر و قانون کا بڑا کام شراب خانوں، چکلوں سینما گھروں وغیرہ گوناگوں بد معاشیوں اور فضول خرچیوں کے ان اڈوں کو بند کرنا ہے جو غیر اسلامی حکومتوں نے فواحش و منکرات کی گرم بازاری کی راہوں سے اپنی آمدنیاں بڑھانے کے لئے کھول رکھے ہیں۔

جبری تقسیم کا نتیجہ حکومت و قانون کے زور و جبر سے تو لوگوں میں انفاق و عطا کی جگہ کسب و حرص اور زور پکڑ جاتا ہے جس کا روز افزوں تماشا ہم خود ہندوستان و پاکستان میں دیکھتے رہتے ہیں جتنی زیادہ سرمایہ داروں کارخانہ داروں وغیرہ کے منافع قانون و حکومت کے زور و جبر سے مزدوروں اور غریبوں تک پہنچانے کیلئے کوششیں کی جاتی ہیں اتنی ہی زیادہ صرف رشوت ستانی اور چور بازاری ہی کی گرم بازاری نہیں بڑھتی جاتی بلکہ طرح طرح کی چالاکیوں سے نفع باز الٹے حکومت ہی کو زچ کرتے رہتے ہیں لیکن نفع بازی سے باز نہیں آتے:

(ابھی ۸ر اکتوبر ۵۳ء) پاکستان کے وزیر اعظم نے عاجز آکر یہاں تک اعلان کر دیا ہے کہ جو لوگ ناجائز تجارت یا نفع بازی سے باز نہیں آتے ان کے گولی ماردی جائے گی۔ اسی دوران ہندوستان میں احمد آباد، کانپور وغیرہ سے ملوں کی عارضی بندش (ںلے آف) کی خبریں آرہی ہیں جس کی بدولت ہزاروں مزدور بیکاری کا شکار ہوتے جارہے ہیں اس مصیبت کو دور کرنے کے لئے حکومت ہند مؤتمر

اقدام کا ارادہ کر رہی ہے۔ دہلی سے ۱۳ر اکتوبر کی اطلاع ہے کہ وزیر صنعت وحرفت نے صورت حال پر بہت زیادہ تشویش کا اظہار کیا ہے کہ مزدوروں کو بے روزگاری سے کیسے بچایا جائے! مل والوں کا بڑا عذر یہ ہوگیا ہے کہ نیا رمال بہت زیادہ جمع ہوگیا ہے کہ نکاسی ہو نہیں رہی، اس لئے اب مزید مال کہاں تک تیار کرتے چلے جائیں۔

سوال یہ ہے کہ نکاسی کیوں نہیں ہو رہی؟ اس کی بڑی وجہ یہ تبلائی جارہی ہے کہ مل والے اپنی نفع بازی میں کمی کرنا نہیں چاہتے ورنہ اگر کم سے کم نفع پر قناعت کرکے اور مال کو زیادہ سے سستا کرکے بازار میں بھیج دیں تو نہ صرف یہ کہ مل مزدور ہی آئے دن بے روزگاری کا شکار نہ ہوں بلکہ لاکھوں کروڑوں کم معاش جو کپڑے کی گرانی کی وجہ سے چیتھڑے لگائے پھرتے ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ بدن ڈھک سکیں

زندگی کا معیار اونچا کرنے کی برکات مگر جب ایک طرف ہر لادینی حکومت اور ہر سیاسی جماعت دن رات اسی دنیوی زندگی کا معیار اونچا کرنے کا صور پھونکتی ہو ساتھ ہی سماج میں ہر طرح کے تعیشات وتنعمات، معاصی وفواحش کی ترویج وترقی کی بدولت زیادہ سے زیادہ کسب یا کمانے ہی کے داعیات ومحرکات کو ابھارنے اور تیز کرنے کا سامان فراہم ہو، دوسری طرف دین وآخرت کا حکومت وسیاست میں نام لینا بھی جرم وننگ ہو، نامذہبیت (سیکولرازم) کا فخر وادعا اور نامذہبی تعلیم مذہب کے رہے سہے جذبات ومؤثرات کو بھی سرد وفنا کرتی رہتی ہو۔ تو پھر غریب وامیر جو بھی زندگی جس سطح ومعیار پر بھی ہو زندگی بھر اس کو اونچا سے اونچا کرنے ہی کی دھن میں آخر کیوں نہ

لگا رہتا ہے۔ جو پیدل چلتا ہے وہ سواری پر کیوں نہ چلے جو کرایہ کی سواری پر چلتا ہے خود اپنی سواری رکھنے کا حوصلہ کیوں نہ رکھے، اگر سائیکل ہے تو موٹر سائیکل کیوں نہ ہو، اس کے بعد موٹر کی فکر کیوں نہ ہو پھر موٹر اگر پانچ سات ہزار والی مل گئی تو دس، بیس، چالیس، پچاس ہزار والی پر بھی تو بہتیرے سوار ہو رہے ہیں ان کی ریس کیوں نہ کی جائے، روٹی اگر پیٹ بھر مل رہی ہے تو ہر طرف بڑی سگریٹ کے دھوئیں بھی تو اڑ رہے ہیں، شراب خانوں اور سینما گھروں پر بھی تو ہجوم اور ٹھٹھ لگے ہیں پھر سینما میں عاشقی وعیاشی، آوارگی[1] او باشی کے جن مناظر کو صرف تماشہ کے طور پر دیکھا ہے، سینما سے باہر خود اپنی زندگی میں ان کا مزہ کیوں نہ لوٹا جاتے۔ خصوصاً جب سینما کے اندر اور باہر راستوں اور گلیوں، روشنی اور تاریکی میں جوان جوان بنی ٹھنی اسکولی اور غیر اسکولی بے پردہ اور بے محابا لڑکیاں اپنے حسن وآرائش، ناز وخرام سے دل کو مچلنے اور جذبات کو بے قابو ہونے کی دعوت دے رہی ہوں ان مواقع پر اگر ہمت نے کمی بھی کی تو چکلے تو ہر سطح اور ہر قیمت کے کھلے ہی ہیں۔

غرض جب چاروں طرف زندگی کے مباحات وفضولیات ہی کی نہیں فواحش ومحرمات تک کی گرم بازاری ہو تو آخر کوئی صرف اپنے تن پیٹ کی ضرورتوں یا ان کے کسی واجبی ومعتدل معیار وسطح پر کب تک اور کیسے ٹھہرا رہے اور ہل من مزید کا شور جو ہر سو بلند ہے اس سے کیسے بہرا بن جائے اور جائز وناجائز یا مناسب ونامناسب کی بحث کے بغیر کسب کی ہر بری بھلی راہ سے ان کو

---

[1] اس سینما بازی سے خالی عیاشی وآوارگی ہی کا زور نہیں بکڑتی بلکہ چوری، ڈاکہ، خونریزی وزنا کاری کے نئے نئے ترقی یافتہ طریقوں کی بھی تعلیم وترغیب کیا کم ہوتی رہتی ہے ۱۲

پورا کرنے کی فکر میں کیوں نہ لگا رہے ،،

اخلاقی زوال کا عروج

کوئی دل دکھے بچارے ستیلا سہاتے صاحب ہیں جو روزنامہ قومی آواز کے ہفتہ وار ضمیمہ میں دو ہفتوں سے اس اخلاقی زوال پر آنسو بہا رہے ہیں۔ جو آزادی کے بعد سے ہندوستان میں عروج پر ہے۔

"اب وہی ہندوستان ہے وہی ہم آپ ہیں لیکن آج کا رنگ بالکل بدلا ہوا ہے، لوگوں میں اب یہ ہوس پیدا ہو گئی ہے کہ فوراً بلا چون وچرا امیر بن جائیں قانون کی زد سے بچنے پیسہ پیدا کرنے کے مناسب و نامناسب ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں شہروں اور گاؤں میں خالص گھی دودھ ملنا دشوار ہے کھانے کی چیزوں میں مضر چیزیں اتنی کثرت سے ملائی جانے لگی ہیں کہ گورنمنٹ کو زیادہ سخت سزا دینے کے لئے قانون میں ترمیم کرنی پڑی ہے، دواؤں تک میں میل کر دیا جاتا ہے خالص شہد و زعفران ملنا مشکل ہے اس کو میں اخلاقی زوال سمجھتا ہوں" (۱۰ ار اکتوبر ۱۹۵۳ء)

آپ اپنی اس سمجھ کا غم کھاتے اور غصہ پیتے رہیں لیکن جب نہ کسی ایسی علم و قدرت والی ذات کا ڈر اور دباؤ ہو جو ہر کھلے چھپے کو جاننے والی ہے نہ کسی ایسی دوسری زندگی پر ایمان و یقین جس میں ہر نیک و بد کی جزاء و سزا ملنے والی ہے تو پھر آپ ہی سوچیں کہ کوئی مناسب و نامناسب کی ایسی ناسمجھی یا اخلاقی زوال کی ایسی بے وقوفی میں آخر کیوں اور کب تک پھنسا رہے جس کی بدولت خود اس کے اور اس کے بال بچوں کے نقدا نقد عیش و لطف میں کمی آرہی ہو، اور فوراً امیر بنجانے یا معیار زندگی کو بلند کرنے کے مواقع ہاتھ سے دیتا رہے۔

رہا "قانون کی زد" کا سوال، تو سیکولر قانون اول تو خود ہی اخلاقی زوال کے کتنے مواقع کا لائسنس عطا کر دیتا ہے بلکہ باضابطہ ان کی تجارت کرتا ہے، دوسرے ہر اندھیرے اجالے میں قانون کی پہنچ کہاں؟ ہو بھی تو اس کے کارندوں کو فوراً بے چون وچرا امیر بنانے والے جادو (رشوت) کے زور سے رام کر لینا کیا مشکل ہے اس کے باوجود سَو میں دس بیس قانون کی زد میں آکر عدالت کے کٹہرے تک پہنچ بھی جائیں تو اس قانون کے پیشہ ور ماہر (وکلاء) خود اس قانون میں موشگافیوں کے زور سے ان دس بیس میں کتنوں کو پھانسی کے تختہ سے اتار اور جیل کے دروازہ سے لوٹا لاتے ہیں، ایسے قانون کی زد کا ڈر جتنا ہے سب ہے قانونی جرائم سے بھی بچا سکتا ہے اس کا تماشہ روزانہ ہی وکیلوں کے دفتروں اور کچہری کے احاطوں میں دیکھا دکھلایا جا سکتا ہے۔

موٹی بات انسانی فطرت کی موٹی بات ہے کہ اس کی ساری زندگی کا لنگر امید وبیم کے دو نقطوں کے درمیان گردش کرتا ہے اس کے آج کا ہر فعل و ترک کل کی کسی نہ کسی امید یا خوف ہی سے وابستہ ہوتا ہے اب اگر اس پوری زندگی کے آج کا کوئی "کل" نہیں تو آخر کوئی شخص اتنا احمق کیوں ہونے لگا کہ اس بیچے مستقل یا بے آخرت والی زندگی کے کسی چھوٹے بڑے نقد نفع کو اخلاقی زوال یا مناسب ونامناسب کے وہم وخلجان یا صرف قانون کی زد کے ضعیف امکان اور بعید احتمال کے پیچھے برباد کرتا ہے اس صورت کے باوجود لوگوں میں اخلاق اور بداخلاقی جائز اور ناجائز یا مناسب اور نامناسب کی تمیز کا جو کچھ احساس وشعور اب بھی باقی رہ گیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ خدا کی رضا اور ناراضی یا آخرت کے بناؤ بگاڑ ہی کی انبیائی تعلیم وتبلیغ ہی کا بقیۃ السلف یا

بچا کھچا اثر ہے ورنہ جدید معاشی تعلیم و تبلیغ کا بالکل منطقی اور نفسیاتی نتیجہ صرف ایک ہی نکلنا چاہیئے کہ بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

حفاظت مال کا مطلب اور اس کی اہمیت

اس بڑے اہم جملہ معترضہ سے پہلے ذکر اصل میں اسلام کی کسبی معاشیات کی غیر کسبی یا سلبی نوعیت اور پھر حفاظت مال کا چل رہا تھا۔ کسب کی نوعیت سلبی ہو یا ایجابی لیکن معاشیات اسلامی کا اصل مطالبہ جو کسب سے کہیں زیادہ بلکہ کسب کے بجائے انفاق کا ہے اور انفاق سے مراد ظاہر ہے کہ خدا و خیر کی راہوں میں انفاق ہے۔ وہ حفاظت مال کے بغیر پورا ہی کیسے کیا جاسکتا ہے، آدمی کتنا ہی کمائے مگر جب تک کمائی کا کچھ حصہ بچے بچائے نہیں۔ اور بچائے صرف چوروں ہی سے نہیں کہ وہ تو کون نہیں کرتا بلکہ فواحش اور فضولیات سے، اس وقت تک وہ خدا کی خوشنودیوں یا نیک کاموں میں خرچ کرنے کے لئے لائے گا کہاں سے ؟ خصوصًا اسلام کے حلال سلبی کسب میں تو تبذیر و اسراف سے بچے بغیر اور بھی مصارف خیر کے لئے انفاق کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ الحلال لا یحتمل السرف۔ لہٰذا اسلام کی معاشیات کا اگر پہلا مقدمہ کسب حلال ہے تو دوسرا حفاظت مال اور پھر اسی سے انفاق مال کا وہ صحیح نتیجہ نکل سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات کی رو سے تمام معاشی مسائل و مشکلات کا بے خطا حل ہے۔

اسلام کے معاشی تقاضوں سے غفلت کے اسباب

اسلامی معاشیات کے ان تینوں معاملات میں ہم جیسی جیسی کوتاہیوں اور غفلتوں میں گرفتار ہیں ان کا کچھ اور ذکر مجدد وقت کی زبان سے اسباب الغفلت کے سلسلہ میں بھی سننے

کے لائق ہے ان غفلتوں اور ان کے اسباب پر تنبیہ و اصلاح کا عنوان خود خدا کی اس تنبیہ کو بنایا گیا ہے کہ اے مسلمانو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں۔ اور جو لوگ بھی ایسی غفلت کریں گے ضرور گھاٹے میں پڑ کر رہیں گے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ اللہ کی یاد یا ذکر سے مراد صرف زبان سے تسبیح و تہلیل یا اللہ اللہ کہنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی سچی یاد تمام زندگی کے کاموں میں اس کی رضا و ناراضی کا خیال یا اس کے اوامر و نواہی کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔

اور یہاں (آیت بالا میں) ذکر اللہ سے مراد (یہی فرمانبرداری یا) طاعۃ اللہ ہے چونکہ طاعت کی وضع ذکر اللہ ہی کے لئے ہے اس لئے ذکر اللہ بول کر طاعت مراد لی جاتی ہے..... اس سے یہ بات مفہوم ہوئی (سمجھ میں آتی ہے) کہ مال و اولاد اکثر طاعت سے غفلت کا سبب ہوتے ہیں اور جب یہ زیادہ تر معصیت کا سبب تھے تب ہی تو حق تعالیٰ نے ان کی وجہ سے غفلت میں پڑنے سے ممانعت فرمائی۔

کیونکہ حق تعالیٰ حکیم ہیں اور حکیم کا کوئی کلام حشو و زائد (یا خالی از حکمت) نہیں ہوتا۔ پس دنیا کی چیزوں میں سے اموال و اولاد کو خاص طور پر ذکر فرمانا اس کی دلیل ہے کہ ان دونوں کو طاعت سے غفلت یعنی معاصی کے صدور میں زیادہ دخل ہے۔"

ایک اور بڑی تحقیقی بات اس ضمن میں یہ یاد رکھیں جو کتاب و سنت کی

بہت سی آیات واحکام کے سمجھنے کی بڑی کلید ہے کہ :۔

خدا اور رسول کے کلام میں تصریح کے ساتھ ممانعت اس چیز کی ہوتی ہے جس میں ابتلاء زیادہ ہو، جو کثیر الوقوع ہو، اور جس میں ابتلا نہ ہو نہ اس کا وقوع زیادہ ہو اس سے بالتصریح ممانعت نہیں کی جاتی .... مثلاً شراب پینے کی ممانعت ہے لیکن پیشاب پینے کی نہیں .... پس کسی چیز سے صراحتہً ممانعت کرنا اس کی دلیل ہے کہ اس کا وقوع کثرت سے ہوتا ہے ،،

تو حق تعالیٰ کا اموال واولاد کی وجہ سے غفلت میں پڑنے سے ممانعت فرمانا ہی اس کی دلیل ہے کہ یہ معصیت کا زیادہ سبب ہوتے ہیں۔ خود کلام اللہ اس کو تبلا رہا ہے اور مشاہدہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ خود اپنی حالت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مال واولاد کی وجہ سے کتنے گناہ ہوتے ہیں ،،

لیکن ہماری بحث کا تعلق یہاں خاص طور پر صرف مال سے ہے اس کی نسبت ارشاد ہے کہ یہ اپنے کسب وحفاظت اور انفاق تینوں مشاغل میں

کسب مال میں بے احتیاطیاں

کتنے ناچ نچاتا ہے، سب سے اول مرتبہ مال حاصل کرنے (یا کسب کا ہے اس کو دیکھئے اس میں کس قدر بے احتیاطیاں ہوتی ہیں ،،

جن کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی عموماً خرچ کو آمدنی کے تابع نہیں رکھتا بلکہ آمدنی (یا کسب) کو اپنے جا وبیجا خرچ کے مطابق بنانا چاہتا ہے اس لئے اس خرچ کو لازماً جا وبیجا جائز وناجائز آمدنی یا کمائی سے کسی نہ کسی طرح پورا کرنا ہی پڑتا ہے

جب کوئی یہ نیت و ارادہ کر لیتا ہے کہ اتنا مال اپنے پاس کسی نہ کسی طرح آنا ہی چاہیئے پھر حلال وحرام کی تمیز مشکل ہے .... افسوس تو یہ ہے کہ بعض اوقات اپنی ذات کو بھی اس رقم سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔"

غضب یہ کہ مثلاً کسی نیک کام کیلئے رقم جمع کی جائے اور یہ تجویز کر لیا جائے کہ اس کے لئے اتنی رقم ہونا چاہیئے تو اب حلال وحرام کی پرواہ نہیں ہوتی، غضب یہ کہ جو لوگ اپنی ذات کے لئے لینے میں احتیاط کرتے ہیں وہ بھی نیک کام کے لئے لینے میں اتنی احتیاط نہیں کرتے۔ چنانچہ چندۂ بلقان میں دیکھا کہ جو محتاط لوگ رنڈی، بھڑوں کا روپیہ کبھی نہ لیتے تھے انہوں نے اس چندہ میں ان کا روپیہ بے تامل لے لیا۔ (ص ۶)

اسلامی مدرسوں، انجمنوں، اداروں وغیرہ میں دن رات ہی یہ ہوتا رہتا ہے کہ تعمیر و تعلیم وغیرہ کے مصارف کا ایک تخمینہ اور معیار بنا لیا اب اس کو کسی طرح پورا ہی کر لینا چاہتے ہیں نتیجہ یہی ہے کہ ان

دینی چندوں میں بے احتیاطی مدرسوں اور انجمنوں کے چندوں میں کوئی بندۂ خدا ہوگا جو احتیاط کرتا ہوگا۔ احتیاط کریں کیسے، یہاں تو مثلاً دس ہزار کا پورا ہونا ضروری ٹھہرا لیا اس سے کم میں کام ہی نہیں چل سکتا اور اتنی بڑی رقم پوری اسی طرح ہو سکتی ہے کہ جہاں سے جو ملے لے لیا جائے۔"

پھر دین میں اس بے دینی کی مولویانہ منطق ملاحظہ ہو کہ

مولویوں کا نفس بھی مولوی ہوتا ہے

نفس یوں سمجھاتا ہے کہ یہ تو خدا کا کام ہے ہمارا ذاتی کام تھوڑا ہی ہے اس میں تھوڑی سی چشم پوشی کر لی جائے تو حرج نہیں، واقعی مولویوں کا نفس بھی مولوی ہوتا ہے اور درویشوں کا درویش تو وہ ان کو ایسی تاویلیں بتا دیتا ہے۔

مفت کا گناہ

حالانکہ یہ بڑی غلطی ہے کیونکہ اپنے نفس کے لئے گناہ کرنے میں مقصود تو کچھ حاصل ہو جاتا ہے کم از کم اپنے پاس روپیہ ہی آجاتا ہے دین کے کام میں گناہ کرنے سے تو مقصود بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ دین کے کام سے مقصود تو رضائے حق ہے سو معصیت میں وہ کہاں۔ اور روپیہ تو اپنے کو نہ ملنا ظاہر ہی ہے کیونکہ وہ تو دوسروں کو (جن کے لئے چندہ کیا گیا) پہنچ گیا۔ بس تم خواہ مخواہ بیچ میں خالی ہاتھ رہے اور گناہ میں مفت مبتلا ہوئے تو ایسے کام میں تو اور بھی زیادہ احتیاط چاہیئے۔" (ص ۶)

بس وہی ہوا کہ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ۝

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم　　نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

جب دین کے ایسے کام میں جس میں خود ہمارا کوئی ذاتی نفع نہیں ہوتا۔ ہم سے اتنی بے احتیاطیاں ہوتی ہیں تو جہاں خود اپنے نفس کے لئے کوئی مال حاصل کرنا مقصود ہو وہاں تو عام طور سے، کس قدر

بے احتیاطیاں ہوں گی وہاں تو مال سے خود اپنے کو نفع حاصل ہوتا ہے اپنا کام نکالنے کے لئے کچھ حلال وحرام کی پرواہ نہ کیجائیگی بالخصوص جب کام نکالنا ہی مقصود نہ ہو"۔ (ص ۔)

آمدنی سے زائد خرچ __ بلکہ طرح طرح کے غیر ضروری مقاصد اور فضول خرچیوں کے لئے بھی روپیہ حاصل کرنے کی دھن ہو کہ لڑکی لڑکوں کے بیاہ شادی دھوم دھام سے ہوں۔ فلاں زمین، فلاں جائداد کسی نہ کسی طرح خریدی جاتے اور اب تو یہ دھن سائیکل کے شوق سے شروع ہوتی ہے پھر موٹر سائیکل چاہیئے پھر موٹر چاہیئے، بنگلہ چاہیئے، پھر اولاد کے لئے شادی بیاہ سے بھی پہلے اعلٰے تعلیم کا خرچ چاہیئے اور بلند خیال ہوئے تو ولایت کی تعلیم کا بندوبست ضروری ہے آج کل قریب ہی ایک تازہ پنشن یاب جج صاحب مقیم ہیں بجائے اپنی ذات سے بہت نیک معلوم ہوتے ہیں لیکن صاحبزادہ کو ولایت بھیج دیا ہے ساڑھے چار سو ماہوار فرماتے ہیں کہ بھیجنا پڑتا ہے، لہذا چھ سو پنشن ہیں کیسے کام چل سکتا ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں حلال وحرام کے دینی احکام کی احتیاط کتنوں سے ہو سکتی ہے قانونی احتیاط کرنے والے بھی شاذ و نادر ہی ہوتے ہوں گے ورنہ بالعموم آمدنی سے زائد مصارف بڑھانے میں آدمی کو نہ سود و رشوت سے دریغ ہوتا ہے نہ قرض کے مار لینے سے نہ قرض لے کر انکار کر دینے سے، نہ بہتوں کا حق دبا لینے سے، نہ کسی کی زمین غصب کر لینے سے، غرض پھر وہ مال جمع کرنے کے لئے طرح طرح کے گناہ کرتے ہیں۔ اور حلال وحرام کی کچھ تمیز نہیں رہتی (ص ۔)

یہ تو مال کے کسب یا حاصل کرنے کا حال مشتے نمونہ از خروارے تھا۔ رہ گیا

حفاظت کا معاملہ :-

تو مال کی حفاظت پوری طرح جب ہی ہوتی ہے کہ نہ زکوٰۃ دے نہ صدقہ دے، نہ کسی کو اللہ واسطے کچھ دے، بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی سائل کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ واقعی محتاج ہے لیکن مال کی ایسی حفاظت کرنے والے محض اس لئے نہیں دیتے کہ مال کم ہو جائے گا۔ بعض لوگ زیور میں زکوٰۃ نہیں دیتے حالانکہ ہمارے امام ابو حنیفہ رح صاحب کے نزدیک زیور میں زکوٰۃ واجب ہے مگر اس میں لوگوں نے دوسرے مجتہدین کی آڑ پکڑ لی ہے کہ ان کے نزدیک واجب نہیں۔

دین کو کھیل بنانا

حالانکہ ایسی آڑ کی حقیقت دراصل دین کو کھیل بنانا اور سراسر نفس کا دھوکہ ہوتی ہے ورنہ

خوب سمجھ لو کہ محض حظِ نفس کے لئے دوسرے امام کا مذہب اختیار کر لینا دین نہیں بلکہ نفس کا اتباع ہے اور تلاعب بالدین (یعنی دین کو کھیل بنانا) ہے۔ (صـ)

خشک فقیہ و محدث

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالی خشک فقیہ و محدث ہونا بھی دین و دنیا کی حفاظت و سلامتی کے لئے بالکل ناکافی ہے جب تک ظاہری علم کے ساتھ نفس کا باطنی تزکیہ و تربیت بھی نہ ہو یعنی عالم صحیح معنوں میں صوفی بھی نہ ہو۔

دد علامہ شامی رح نے ایک بزرگ کا قول لکھا ہے کہ ان کے سامنے ایک

شخص نے کسی عالم کا واقعہ بیان کیا جو حنفی تھے کہ انہوں نے ایک محدث کو اس کی لڑکی کے لئے پیام دیا تو اس نے کہا کہ میں منظور کر سکتا ہوں مگر تم حنفی ہو اور میں محدثین کے طریقہ پر ہوں نباہ نہ ہوگا اگر تم امام ابو حنیفہ کی تقلید ترک کر کے محدثین کا مذہب اختیار کر لو تو پھر مجھے کچھ عذر نہ ہوگا چنانچہ اس عالم نے اس شرط کو مان لیا اور نکاح ہو گیا۔

صاحب باطن کی نظر آگے دیکھو کہ ایک صاحب باطن بزرگ کی نظر کہاں جاتی ہے اور باطن یا نفس کی چوری کس طرح پکڑ لیتی ہے ان بزرگ سے پوچھنے والے نے پوچھا کہ

سلب ایمان کا اندیشہ اس صورت میں ترک تقلید جائز تھی؟ فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت اس شخص کا ایمان نہ سلب ہو جائے۔ کیونکہ جس مذہب کو یہ اب تک حق سمجھے ہوئے تھا اور حق سمجھ کر ہی اس کی تقلید کرتا تھا اس کو محض ایک ہوائے نفس کے لئے ترک کر دیا ہے تو اس کا ایمان بچنا مشکل ہے، اعاذنا اللہ

نفس و شیطان کی قلابازیاں غرض یہ دین نہیں بلکہ نفس و شیطان کی قلابازیاں ہیں کہ جب تک مقلد بننے سے مطلب نکلا مقلد بنے رہے جب غیر مقلد بننے سے نکلا غیر مقلد بن گئے جہاں شافعی بننے سے نکلا شافعی بن گئے اور جہاں حنفی بننے سے کام چلا حنفی بن گئے۔

ان کا نفس ایسا ہے جیسے شتر مرغ کہ صورت میں اونٹ کے بھی مشابہ ہے اور پر دار ہونے کی وجہ سے پرندہ بھی ہے اب اگر کوئی اونٹ سمجھ کر بوجھ لادنا چاہے تو اپنے کو پرندہ کہہ دیتا ہے اور اس طرح جان بچاتا ہے اور اگر کوئی پرندہ سمجھ کر کہے کہ ذرا اوپر اڑکر دکھاؤ تو کہتا ہے کہ میں تو اونٹ ہوں بھلا کہیں اونٹ بھی اڑتا ہے،، حضرت فریدالدین عطار اسی کو کہتے ہیں۔

چوں شتر مرغے شناس ایں نفس را ۔۔۔ نے کشد بار ونہ پرد بر ہوا۔
گر بہ پر گوئیش گوید اشترم ۔۔۔ ور نہی بارش بگوید طائرم

تو واقعی نفس کی یہی کیفیت ہے کہ یہ اپنے اوپر بات ہی نہیں آنے دیتا کبھی کچھ بن گیا کبھی کچھ بن گیا بعضوں کا نفس دنیا کے پردہ میں ایسی چالاکیاں کرتا ہے اور بعض دین کی آڑ میں ایسی حرکتیں کرتے ہیں،، (ص۳۰)

یہ تو ان نام نہاد دین داروں کا حال ہے۔

جو خلاف شرع کام کرنے سے اپنے نزدیک بہت بچتے ہیں۔ اور جہاں (نام کے اس دین کی بھی) ضرورت نہیں وہاں تو کچھ بھی پرواہ نہیں ایسی چاہے کسی مذہب میں جائز ہو چاہے ناجائز ان کو تو اپنے کام سے کام ہے (ص۳۰)

مال حرام کی اجازت حفاظت مال کی ایسی نفسانی وشیطانی راہوں سے قطع نظر کہ اگر گرسنہ شوی سگ شوی،، جہاں تک نفس اضاعت مال سے بچنے کا تعلق ہے اوپر اچھی طرح معلوم ہو چکا کہ کتاب وسنت دونوں نے کس اہتمام سے اس سے بچایا ہے، پھر وقت کے حال اور ماحول پر نظر رکھنے والے مجدد وقت کا تو یہ تک فتویٰ آپ اوپر پڑھ ہی آئے

ہیں کہ جب تک حلال کا انتظام نہ ہو ایمان کو بچانے کے لئے حرام تک کی اجازت ہے

محقق شیخ جب دیکھتا ہے کہ کسی شخص اور اس کے اہل وعیال میں توکل کی قوت نہیں اور ملازمت وغیرہ کسی حرام ذریعۂ معاش کے چھوڑنے میں اور طرح طرح کے خطرات ومفاسد ہیں، مثلاً چوری کرنے لگے، قرض مارنے لگے، عیسائی ہو جاتے یا کوئی اور مذہب اختیار کر لے تو وہ ملازمت چھوڑنے کا مشورہ نہیں دیتا۔ البتہ کچھ قیدیں لگا دیتا ہے، مثلاً اس نوکری کو حرام سمجھتے رہو، دوسرا استغفار کرتے رہو، تیسرے حلال نوکری کی تلاش کرتے رہو۔ اور دوسری حلال نوکری ملنے پر بھی فوراً پہلی نوکری کو چھوڑنے کی رائے نہیں دیتا۔ بلکہ رخصت لے کر دوسری نوکری کی حالت کا اندازہ کر لینے کا مشورہ دیتا ہے۔" (ص۱)

اور حلال آمدنی کی تو صرف حفاظت ہی کی نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکے کچھ نہ کچھ اس میں سے پس انداز کرنے کی بھی رائے دیتے تاکہ کسی وقت ہاتھ بالکل خالی نہ رہے اسباب الفتنہ میں ایک جگہ ارشاد ہے کہ

حضرت سفیان ثوریؒ کی رائے میں آج کل مسلمانوں کو خالی ہاتھ رہنے کی رائے نہیں دیتا بلکہ وہ رائے دیتا ہوں جو حضرت سفیان ثوریؒ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے زمانہ والوں کو دی تھی، فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کسی کے پاس کچھ دینار ہوں تو ان کی قدر کرے کیونکہ پہلے تو ایسا زمانہ تھا کہ روپیہ پاس ہونے سے دین پر اندیشہ ہوتا تھا اور اب وہ زمانہ ہے کہ روپیہ پاس نہ ہونے سے دین پر اندیشہ ہے اور روپیہ پاس ہو تو دین کی حفاظت رہتی ہے جب حضرت سفیان ثوری ہی کے زمانہ میں

یہ حالت ہو چلی تھی تو اب تو اس کی زیادہ ضرورت ہے (ص۶۶)

یہ ضرورت حضرت کی تجدیدی نظر سے تو کیا نظر انداز ہوتی جن اہل نظر بزرگوں کی حضرت نے آنکھیں دیکھی تھیں، دیکھئے کہ ان کی نظر کہاں تک جاتی تھی۔

حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب کی خدمت میں ایک خان صاحب کسی جائداد کے مقدمہ میں دعا کرانے آیا کرتے تھے ایک بار وہ آئے اور عرض کیا کہ حضرت اب تو فلاں بنئے نے میری زمین دبا ہی لی۔ حضرت نے فرمایا بھائی جانے دو اور اللہ پر نظر کر کے صبر کرو۔ خدا کچھ اور سامان کرے گا"

بظاہر یہ بالکل "بزرگانہ نصیحت" تھی مگر قریب ہی دوسرے حجرہ میں ایک دوسرے بزرگ حضرت محمد ضامن شہیدؒ تشریف فرما تھے وہ یہ نصیحت سن کر باہر نکل آئے اور ان خان صاحب سے فرمایا کہ

ہرگز صبر نہ کرنا جاؤ مقدمہ کرو عدالت میں دعویٰ دائر کرو ہم دعا کریں گے

اور حضرت حاجی صاحب سے فرمایا کہ سبحان اللہ! آپ اپنی طرح ساری مخلوق سے صبر کرانا چاہتے ہیں چاہے کسی کو ہمت ہو نہ ہو آپ کے نہ تو بیوی ہے نہ بچہ اکیلے تھے صبر کر کے بیٹھ گئے اس غریب کے پیچھے بیوی بچے لگے ہیں وہ ان کے فقر و فاقہ پر کیسے صبر کرے گا انجام یہ ہو گا کہ پریشان ہو گا اور توکل کی ہمت ہے ہی نہیں تو کس کس کے مال پر نظر دوڑائے گا۔ (ص۶۷)

امت کی ایک بڑی دشواری کا حل اس موقع پر حضرت حکیم الامتؒ

نے امت کی ایک بڑی عملی دشواری کی طرف متوجہ اور اس کا حل فرمایا ہے ،،
یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ علمار میں باہم اختلاف ہے کوئی ایک چیز کو حرام کرتا ہے تو دوسرا اس کو جائز کہتا ہے کوئی ایک بات کو سنت کہتا ہے تو دوسرا اس کو بدعت بتلاتا ہے اب کس کی مانیں کس کی نہ مانیں لہذا بعض نے یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو ،، (ص ۱۵ اسباب الفتنہ)

مگر اس طرح کے اختلافات تو دنیا کے سارے فنون و معاملات کے بڑے بڑے ماہرین میں بھی دن رات پیش آتے رہتے ہیں ۔
وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا ۔ وہاں کسی ایک کو ترجیح دے کر کیوں پکڑا ۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطبار اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے کوئی کچھ تشخیص کرتا ہے کوئی کچھ ۔ ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مہلک تک بارہا بتلاتا ہے ، وہاں آپ نے سب کو کیوں نہیں چھوڑا کہ افسوس اطبا میں اتفاق نہیں ، ہم کس کا علاج کریں ۔ بس جاؤ مریض کو مرنے دو ہم کسی کا بھی علاج نہیں کرتے ، وہاں آپ کسی نہ کسی کو ترجیح دے کر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں ۔
علیٰ ہذا آپ نے وکلاء کے ساتھ یہی برتاؤ کیوں نہیں کیا جو علمار کے ساتھ کیا گیا ہے کیا وکلا میں باہم اختلاف نہیں ہوتا ، ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر ترجیح کیوں دی جاتی ہے اور سب کو کیوں نہیں چھوڑ دیا جاتا اس کا کیا جواب ہے ؟
ایک وکیلوں اور طبیبوں پر ہی کیا موقوف ، کوئی چھوٹا بڑا معاملہ یا علم و فن ہے

جس میں اختلاف کی گنجائش نہیں اور برابر ہوتا نہیں رہتا۔ معاشیات و سیاسیات ہی کے مسائل و معاملات ہی کو لیجئے کہ ان میں طرح طرح کے اختلافات ہی کی راہ سے آئے دن نئی نئی پارٹیاں بنتی رہتی ہیں۔ عوام سے لے کر خواص تک، بازاروں سے لے کر کونسلوں تک اور افراد سے لے کر اقوام تک ان اختلافات ہی کی بدولت جوتی بیزار فتنہ و فساد، توڑ پھوڑ اور جنگوں پر جنگوں تک کا سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ سوچئے تو سہی کہ مسٹروں کے ان اختلافات کے آگے کیا مولویوں کے اختلافات بھی گرد نہیں؟ جواب امت کے سب سے حکیم وقت سے سننے کا ہے

ایک گہری بات

جو ایک گہری بات ہے وہ یہ کہ دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جاتا ہے دوسری وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جاتے۔ جن کو ضروری سمجھا جاتا ہے ان کو کسی اختلاف کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلافات کے (کسی نہ کسی طرح) ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لیتا ہے اور جن باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ان کو اختلاف کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے وہاں تدبیر و تامل سے ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی یہ قاعدہ ہے طبیعت انسانیہ کا۔ اسی کے موافق یہاں بھی عمل کیا گیا...... (ص ۵۸)

جان چونکہ عزیز ہے اس لئے اس کی صحت و حفاظت کے اسباب میں اختلافات ہوتے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا۔ بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے اس سے گھبرانا نہ چاہئے ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیر خواہوں سے

دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ڈاکٹروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے بس اس کا علاج اختیار کریں گے۔

جان کی طرح یہی معاملہ آدمی مال کے ساتھ کرتا ہے کہ مثلاً مقدمات کے ذریعہ مال کی حفاظت کرنا ہوتی ہے اور وکیلوں میں باہم اختلاف بھی ہوتا ہے تو سب کو چھوڑ کر صبر نہیں کر بیٹھتا بلکہ خود غور و فکر، تحقیق و تجربہ اور دوسروں کی رائے و مشورہ سے کام لے کر کسی نہ کسی کے حوالہ مقدمہ کرنا پڑتا ہے بخلاف اس کے چونکہ دین و ایمان یا خدا و آخرت کی قدر و قیمت دل میں جان و مال کے برابر بھی نہیں رہی اس لئے اس میں علماء و فقہاء کے اختلافات کو بھی ترک کا ایک بہانہ بنا لیا جاتا ہے ورنہ

ایمان عزیز ہی نہیں

اگر آپ ایمان کو عزیز سمجھتے تو علماء میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے جس طرح اطباء (و کلاء وغیرہ) میں کیا جاتا ہے مگر افسوس آپ کو ایمان عزیز ہی نہیں اس لئے سب کو چھوڑ دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں بلکہ ضرور ہے اور آگے یہ بھی تبلاؤں گا کہ ان میں سے کس کی ہے مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کروں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے " (ص ۵۸)

لیڈروں کی علماء سے عجیب فرمائش

بعض لوگ خصوصاً آج کل کے سیاسی لیڈر دین کو اپنی دنیا پرستی میں مخل پاکر اس سے جان چھڑانے کے لئے خود اپنی بات بات پر نا اتفاقیوں کو بھلا کر علماء سے یہ عجیب و غریب انہونی غیر فطری فرمائش بڑے خیر خواہانہ اور واعظانہ انداز میں کیا کرتے ہیں کہ۔

کیا نا اتفاقی ہر حال میں جرم ہے؟

سب مولویوں کو متفق ہونا چاہئے نا اتفاقی بری چیز ہے، تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے یا اس کے لئے کوئی قید بھی ہے؟ اگر علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہو جاتا ہے تو عدالت کو چاہئے کہ اس کے پاس جب کوئی مدعی دعویٰ پیش کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی و مدعا علیہ دونوں کو سزا دیدیا کرے کیونکہ دعویٰ اور انکار دعویٰ لے ہونے سے دونوں میں نا اتفاقی کا ہونا ثابت ہے اور نا اتفاقی (ہر حال میں ایک) جرم ہے، لہٰذا مدعی و مدعا علیہ دونوں مجرم ہوتے۔

مگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دنیا بھر میں شور و غل مچائیں گے کہ یہ کونسا انصاف ہے کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنا دیا گیا اب اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہئے تو آپ ہی عاقل بن کر رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہئے کہ مدعی و مدعا علیہ میں باہم جو مخالفت و نا اتفاقی ہے تو ان میں سے حق پر کون ہے اور ناحق پر کون؟ جو حق پر ہو اس کی حمایت کی جائے اور جو ناحق پر ہو اس کو سزا دی جاتے .....

اختلاف کا ہر فریق مجرم نہیں

غرض کسی معاملہ میں اگر لوگوں میں باہم اختلاف ہو تو اختلاف کے ہر فریق کو مجرم نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ جن کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے اور جو بر سر حق ہو وہ مجرم نہیں، بس یہی سیدھا سادھا اصول اور طریقہ دینی معاملات کے اختلاف میں بھی اختیار کرنا عقل و دانش کی

بات ہوگی نہ کہ علماء کے باہمی اختلاف اور نااتفاقی پر سب کو مجرم اور گردن زدنی قرار دیدینا اور سب پر یہ فرمائش کرنا کہ آپس میں اتفاق کر لو ورنہ ہم سب کو چھوڑ دیں گے۔ چاہیئے یہ کہ:۔

پہلے تحقیق کریں کہ حق پر کون ہے پھر جو ناحق پر ہو اس کو مجرم بنایئے اور اہل حق کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور کیجئے، ورنہ اہل حق کو دوسروں کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور کرنے کے تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کریں جس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا تو اتنی شکایت تو آپ کی ہے کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہونے کی رائے دیتے ہیں، اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں (ص ۵۹)

اختلاف رحمت ہے

البتہ صرف ایک صورت ایسی ہے کہ دوسرا فریق بھی علم وعمل، تحقیق وتقویٰ، دین ودیانت کے اعتبار سے کسی مسئلہ میں اختلاف رائے کا حق رکھتا ہو۔

تو ایسا اختلاف تو اختلاف رحمت ہے اس اختلاف سے فتنہ وفساد کی نوبت نہیں آیا کرتی۔ دیکھئے ائمہ اربعہ میں سب ہی کا تو اختلاف ہے مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق بھی ہیں کوئی ایک دوسرے پر ملامت وطعن نہیں کرتا بلکہ ایک دوسرے کو حق پر سمجھتا ہے اگر ایسا اختلاف ہوتا تو مسلمانوں میں آج یہ پریشانی نہ ہوتی، جو (دن رات) آنکھوں سے نظر آرہی ہے،، (ص ۵۹)

شر کی بات یہ ہے کہ یہ لعنت وملامت یا فتنہ وفساد والا اختلاف دراصل

دین کا اختلاف ہے ہی نہیں تمام تر جاہ و مال یا پیٹ کا اختلاف ہے جو مولویوں سے کہیں زیادہ مسٹروں کو باہم دست و گریباں کئے رہتا ہے ارشاد ہے کہ

سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے یہ اختلاف تو روٹیوں کا ہے میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہل حق کے پاس کافی روپیہ ہو اور وہ سب (اختلاف کرنے والے) فرقوں کی تنخواہ مقرر کر دیں تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے یہ سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے ہے

اور آخر ہر جگہ آج کل کی نام نہاد جمہوریتوں میں برسر اقتدار پارٹی اپنے مخالف بہت سی پارٹیوں اور پارٹی والوں کو تنخواہوں یا عہدوں اور وزارتوں سے روزانہ خریدتی رہتی ہے، البتہ مولوی بیچاروں کا بازار مسٹروں کی حکومت و سیاست میں چونکہ سرد پڑ گیا ہے اس لئے یہ مولود و فاتحہ ہی سے کچھ اپنی گرم بازاری کر لیتے ہیں۔

ایک عالم سے جو بدعات کے بڑے حامی تھے کسی نے سوال کیا کہ تم تو مولود و فاتحہ کو سنت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو اور جو ان سے منع کرے اس کو بہت بُرا بھلا کہتے ہو پھر کیا وجہ ہے کہ تمہاری مستورات بہشتی زیور پڑھتی ہیں جو تمہارے ایک مخالف کی کتاب ہے اور جس میں بدعات کا رد کیا گیا ہے۔

تو انہوں نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ سارا اختلاف اس کی خرابی ہے ورنہ حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے" (ص ۶۰)

خلاصہ یہ کہ نہ اختلاف ہر حال میں برا ہے اور نہ اتفاق ہر صورت میں اچھا ہے بلکہ پہلے آپ حق کو متعین کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علمائے محققین

میں سے حق پر کون لوگ ہیں اور ناحق پر کون۔ اس طرح محققین اور غیر محققین کی پہچان ہو جاتے گی جس کی میں آسان ترکیب بتلاتا ہوں وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ ہیں بعض تو پڑھے لکھے خواہ اردو ہی لکھے پڑھے ہوں، اور بعض ان پڑھ

لکھے پڑھوں کیلئے تحقیق کا طریقہ

پہلے طبقہ کے لئے تو تحقیق حق

کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ..... دونوں طرف کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہو کر انصاف سے دیکھیں کسی کی طرفداری و حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں کیونکہ اعتقاد کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہو گی اور عیب نظر نہ آتے گا"

اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے خدا و آخرت کے خوف و مواخذہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ معاملہ صرف یہاں کا نہیں آخرت میں خدا کے سامنے حق و ناحق کے قبول اور اس کی جاو بیجا طرفداری کی جوابدہی اور فیصلہ ہو گا یَفْصِلُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ہ اس کے بعد

انشاء اللہ تعالیٰ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن میں خود بخود حق واضح ہو جاتے گا جب ایک کا حق پر ہونا معلوم ہو جائے تو بس اسی سے تعلق رکھو اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو" (صلا)

ان پڑھوں کے لئے

یہ طریقہ تو پڑھے لکھے لوگوں کے واسطے تھا اور جو بے پڑھے لکھے ہیں وہ یہ کریں کہ دونوں فریق کے ایک ایک مولوی کے پاس جا کر ایک ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت ان کی فرصت کا

ہو اس میں ان کے پاس بیٹھیں اور ان کی باتیں سنیں اور دیکھیں کہ جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی طرف رغبت پیدا ہو عبادت الٰہی کا شوق بڑھے اور خدا کی نافرمانی سے دل میں خوف و نفرت ہو اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو بس اس کو اختیار کر لیں اس سے ہر بات پوچھا کریں۔ اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جایا کریں۔

اور یہ طریقہ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی مفید ہے محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت معلوم نہیں ہوتی جیسی پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے" (ص ۶۳)

ہا! امت کا مشکل ہی سے کوئی مرض ہوگا جس کی حکیم الامت کے ہاتھوں حاذقانہ تشخیص کے ساتھ حق تعالیٰ نے تیر بہدف نسخہ تجویز نہ کر دیا ہو۔ لیکن مرض جب اپنے کو مریض ہی نہ جانے بلکہ مرض ہی کو عین صحت، تو اس کا علاج کس سے ہو علماء کے باہمی اختلاف کو بھی نفس پرستوں نے حق سے گریز کا کیسا بہانہ بنا رکھا ہے اور بظاہر معلوم بھی ایک معقول عذر ہوتا ہے کہ ہر شخص خود تو عالم و محقق نہیں بن سکتا اور علماء میں خود بہتیرے مسائل میں اختلاف ہے ہم کس کی مانیں کس کی نہ مانیں لہٰذا آسان راہ یہ ہے کہ سب کو چھوڑ دیں یا ترقی کر کے اس عذر سے دین و مذہب ہی کو خیرباد کہہ دیں۔ لیکن حکیم الامت کی حاذقانہ تشخیص آپ نے دیکھی کہ اولاً تو ہمارا یہ بظاہر معقول عذر ہی سرے سے نامعقول اور تارِ عنکبوت ہے۔

دین کے معاملہ میں سب سے بڑا مرض اس لئے کہ دین جیسا معاملہ جس کا اصل

تعلق آخرت جیسی ابدی زندگی کے بناؤ بگاڑ سے ہے اس کی اہمیت و وقعت ہمارے دل میں اگر اتنی بھی ہو جتنی دنیا کے کسی معمولی معاملہ و مقدمہ و جسمانی مرض و بیماری کی، تو کیا ہم وکلاء و اطباء کے کسی باہمی اختلاف کی وجہ سے مالی نفع و ضرر یا جسمانی صحت و مرض سے بے پرواہی برت سکتے ہیں، دین کے معاملہ میں ہمارا سب سے بڑا مرض یہی دینی بے پرواہی و غفلت ہے دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہوا کہ دینی مسائل و معاملات میں ہمارے اندر حق بات معلوم کرنے کی سچی تڑپ یا طلب ہی نہیں اور بے طلب و تشنگی جب ہم دنیا کی چیزوں میں رسد و تشفی کی توقع نہیں رکھتے تو پھر دین ہی میں کیوں یہ امید یا ضد ہے کہ وہ زبردستی ہماری حلق میں ٹھونس دیا جائے گا۔ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ؀

ورنہ جو لوگ خدا کی راہ میں سعی و طلب کا حق ادا کرتے ہیں ان سے خود خدا کا کیسا قطعی وعدہ ہے کہ ہم ان پر اپنی راہیں کھول کر رہیں گے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ بلکہ بخاری شریف کی مشہور صحیح حدیث میں تو یہاں تک ہے کہ اگر بندہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھے تو میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں۔۔۔۔۔ وہ چل کر آئے تو میں دوڑ کر آتا ہوں۔

لیکن اگر بندہ بندہ ہو کر سر پھرا اور اکڑا ہے تو پھر خدا خدا ہے اور غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ہے۔

یافت حق کی مقدم شرط طلب ہے

اس لئے یافت حق کی مقدم شرط عالم و جاہل پڑھوں اور ان پڑھ سب کے لئے طلب حق ہے اس کے بعد پڑھوں ان پڑھوں دونوں کے لئے وقت کے مجدد حکیم نے جو تجویز فرما دی ہے وہ انشاء اللہ بالکل کافی ہو گی، بلکہ بے پڑھوں کی طرح پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی زیادہ

اطمینان کی صورت یہی ہو گی کہ فریقین کے علماء کی خالی کتابیں پڑھنے کے علاوہ ان کے کم از کم ایک ایک اچھے مشہور عالم کے پاس چند دن رہ کر ان کے رنگ ڈھنگ کو ضرور دیکھیں اس سے انشاء اللہ ان کے علم و عمل دونوں کا اندازہ بہتر ہو گا دین داری اور دکانداری میں تمیز معمولی سمجھ کا آدمی بھی کر لے گا۔ اس کے باوجود اگر خدانخواستہ دھوکا کھا گیا جس کا احتمال کم ہے تو عند اللہ معذور ہو گا دین کی بڑی نعمت و سہولت یہی ہے کہ اپنی والی کوشش و تدبیر یا وسعت و استطاعت سے زیادہ تکلیف کسی معاملہ میں نہیں دیتا۔

نفس و نفسانیت سے بچنے کی صورت

یہ تو علمائے دین کے باہمی اختلاف کی صورت میں غیر علماء کی اس علمی دشواری کا بے خطر آسان حل تھا کہ وہ اختلاف کرنے والوں میں سے عملاً کس کی پیروی کریں، اسی سلسلہ میں ذرا تفصیل کے ساتھ فتنہ و فساد کی اس جڑ کو کاٹا گیا ہے جو اختلاف کو مخالفت و عداوت تک پہنچا دیتی ہے اور اختلاف رائے کو اپنے حدود میں رہنے نہیں دیتی ہر فرد و فریق دوسرے فرد و فریق کی دشمنی و بیخ کنی، سب و شتم، لعن و طعن پر اتر آتا ہے جو خود اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ ایسے اختلافات کی بناء حق جوئی و حق پسندی نہیں بلکہ نفس و نفسانیت ہوتی ہے اس نفسانیت و عداوت سے بچنے و بچانے کی صورت یہ ہے کہ اتباع تو اس عالم یا فریق کی کی جائے جس کا مذکورہ بالا تدبیر سے برسر حق ہونا معلوم ہو گیا۔

بُرے کو بے ضرورت بُرا مت کہو

مگر بُرا دوسرے فریق کو بھی نہ کہا جائے کسی کو بُرا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو گا..... دیکھو اگر کوئی شخص کسی

حسین پر عاشق ہو جائے تو وہ دوسرے حسینوں کو کیا (بدصورتوں کو بھی) گالیاں نہیں دیتا پھرتا۔ بس یہ کہتا ہے کہ گو کوئی اور بھی حسین ہو ہیں تو اپنے محبوب ہی کا عاشق ہوں،

دل آرامے کہ داری دل درو بست　　دگر چشم از ہمہ فرد بند

کوئی بُرا بھی ہو تو تم اس کو برا مت کہو.... اگر دوسرا تم کو بُرا کہے جب بھی تم اسے کچھ نہ کہو، ذوقؔ نے خوب کہا ہے ؎

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ۔ ہے بُرا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے۔ پھر بُرا کہنے سے اس کے کیوں بُرا مانتا ہے

یزید کو بُرا کہنا کا تذکرہ ہیں کسی نے حضرت حکیم الامتؒ سے پوچھا کہ یزید کو بُرا کہنا جائز ہے یا نہیں؟ جواب دین و امت کے مجدد حکیم نے کیسا عجیب حکیمانہ دیا جو وہی دے سکتا ہے جس کی نظر دین کی اس روح پر ہو کہ دنیا کے ہر معاملہ کو آخرت کی نظر سے دیکھے، فرمایا

ہاں جائز ہے اگر یہ اطمینان ہو کہ تم اس سے اچھی حالت میں مرو گے اور ظاہر ہے کہ مرنے سے پہلے یہ اطمینان ہو ہی نہیں سکتا بس اپنا انجام دیکھنے سے پہلے اس کو بُرا نہ کہنا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ یزید ہی ہم پر ملامت کرے کہ تم مجھے کس منہ سے کہتے تھے ذرا اپنی حالت تو دیکھو"

ورنہ زندگی میں تو آدمی کی پستی و بلندی، پاکی و ناپاکی کا یہ عالم رہتا ہے کہ:۔

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما　　گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما
ایمان چو سلامت بہ لب گور بریم　　احسنت بریں چستی و چالاکی ما

اعتبار بس خاتمہ کا ہے اس لئے اعتبار تو بس خاتمہ کا ہے اور خاتمہ

کا حال خاتمہ سے پہلے کس کو معلوم، لہٰذا ارشاد ہے کہ میاں اپنی خیر مناؤ یہ حکیمانہ جواب تھا، آگے ایک عارفانہ جواب بھی سن لیں۔

عارفانہ بات یاد رکھو کسی کو بُرا بھلا وہی کہے گا جسے کوئی کام نہ ہو اور جو کام میں لگا ہوتا ہے اس کو دوسروں کو بُرا بھلا کہنے کی فرصت ہی نہیں ملتی شیخ سعدی نے لکھا ہے کہ ایک حکیم نے (نام کے؟) کسی درویش کو کسی آدمی سے لڑتے دیکھا اور یہ فیصلہ کیا

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو — چو بگذشت بر عارف جنگ جو

گر ایں مدعی دوست بشناختے — بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

یعنی اگر اس درویش کو خدا کی معرفت حاصل ہوتی تو اسے لڑنے کی فرصت کہاں ہوتی۔ دیکھو اگر ہم اپنے کسی مجازی محبوب (چہ جائیکہ حقیقی محبوب) کو دیکھ لیں تو اس وقت اس کی صورت دیکھنے اور خدمت کرنے میں مشغول ہوں گے یا لوگوں سے کشتم کشتا ہیں

غرض محقق کا پتہ لگانے کے بعد اتباع تو اس کا کرو مگر بُرا دوسروں کو بھی نہ کہو" (صـ ۶۲)

اختلاف کی اصل جڑ یہ گفتگو بجائے خود نہایت مفید اور کام کی ہوتے کے باوجود بظاہر مال و معاش کے مسئلہ سے بہت دور جا پڑی لیکن غور کیجئے تو زیادہ دور نہیں کیونکہ مال و معاش کی محبت و طلب حدود سے نکل کر حب مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو علماء جہلا مولوی و مسٹر سب کے بہتیرے اختلافات اسی سے یعنی وہی روٹی اور پیٹ ہی کے سوال سے پیدا ہوتے ہیں

اور حب مال ہی سے (یہ اختلافات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ) بعض لوگ دوسروں کی آبرو (تک) کے درپے ہو جاتے ہیں ...... اور اس (محبت مال ہی کی) وجہ سے ہمارے دلوں میں خدا کی محبت نہیں پیدا ہوتی اھ (۹۲)

دین کے اختلافات فساد کا باعث نہیں ہوتے

مسائل دین اور علماء دین میں اختلافات کی نوعیت و حقیقت کی پوری پوری مجددانہ حکیمانہ تحقیق و تفصیل تو الحمد للہ تجدید تعلیم و تبلیغ میں ہو چکی۔ لیکن اوپر کے ضمنی و اجمالی اشارات وارشادات سے اتنا یہاں بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ دین جس کی حقیقت خدا و معاد پر نظر رکھنا ہے وہ اپنی ساخت و مزاج ہی میں ایسا واقع ہوا ہے کہ اس کے اختلافات ہمارے دنیوی و معاشی اختلافات کی طرح فتنہ و فساد تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ باقی اگر کوئی فرد یا فرقہ خود دین ہی کو دنیا کی تجارت بنا لے تو یہ دین عین بے دینی ہوتا ہے اور اس کے اٹھائے ہوئے اختلافات و فسادات دین کے نہیں عین بے دینی کا نتیجہ ہوتے ہیں جو خود دین کی نظر میں دین نہیں دین کی دوکانداری ہے۔ يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا

بڑا مغالطہ یہی ہے کہ دین کو بدنام کرنے والوں نے دانستہ یا نادانستہ دین فروشوں کو دین کا نمائندہ قرار دے لیا یا مشہور کر دیا ہے سو ایسے بدنام کنندہ نیکو نامے چند،، خود دنیا کے کسی علم وفن یا تعلیم و مسلک میں نہیں پائے جاتے اور کیا ان کا ذمہ دار کسی درجہ میں بھی خود اس علم وفن یا تعلیم و مسلک کو ٹھہرایا جا سکتا ہے

لادینی اختلافات کے فسادات

تاہم دین کے ان دین فروش نمائندوں نے بھی اپنے باہمی اختلافات و مناقشات سے روزمرہ کی زندگی کو

اس طرح شور و شر اور بدامنی کا ڈنگل نہیں بتاتے رہتے جس طرح ہمارے جدید لادینی دور کی آئے دن کی لادینی نزاعات و اختلافات کی کشتیاں اور آویزشیں بالکل تازہ مثال لیجئے۔

مہینوں سے ہمارے صوبہ (یوپی) کی مختلف یونیورسٹیوں کے طلباء اور منتظمین کے درمیان محض یونین یا طلباء کی انجمن کے بعض اختلافات کا اکھاڑ کھلا ہوا ہے ان میں سب سے آگے صوبہ کے سب سے امن پسند شہر اور راجدھانی لکھنؤ کی ممتاز یونیورسٹی ہے جو دو مہینے کے قریب اس میدان داری کی بدولت نبدرہ کر اب خدا خدا کر کے جو کھلی تو عین ان سطروں کے دوران تحریر میں تین دن سے اس طرح کی خبریں موٹے موٹے عنوانات سے اخباروں میں نکل رہی ہیں کہ

یونیورسٹی یونین پر پولیس کا دھاوا۔ سو طلباء گرفتار۔ پتھراؤ سے چالیس طالب علم اور چھ پولیس والے زخمی۔ یونین کی عمارت زبردستی خالی کرائی گئی۔ بھوک ہڑتالی طلباء اسپتال پہنچا دیئے گئے۔

آگے اور کیا کیا ہوا اور ہو رہا ہے

ڈاک خانے لوٹے گئے۔ بسیں جلائی گئیں۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ کاٹ کر سینکڑوں ٹیلیفون بیکار کر دیئے گئے۔ سڑکوں کی بجلی کے بلب توڑ توڑ کر شہر بھر میں اندھیرا اور اندھیر کا راج رہا، پولیس نے آتش بازی کی جس سے بے گناہ راہ گیر تک زخمی ہو گئے، رکشے والا ہو یا خواجہ دالامرا۔ میڈیکل کالج کے ایک طالب علم کے دماغ میں گولی پیوست ہو گئی (بالآخر وہ بھی جاں بر نہ ہوا) یونیورسٹی اور حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں کی آرتھی (جنازہ) نکالی اور جلائی گئی۔

پہلے دفعہ ۱۴۴ نافذ ہوئی اس سے بھی امن قائم نہ ہو سکا تو پورے ۶۰ گھنٹے قریب

قریب دن رات کو کرفیو نافذ رہا۔ سیکڑوں آدمی گرفتار ہو کر جیل میں بھر دیئے گئے سارے شہر میں ویرانی چھائی ہوئی ہے

یاد رہے جس اختلاف نے یہ آگ لگائی وہ عوام وجہلا کا نہیں، جدید لادینی تعلیم و تہذیب کی اونچی سے اونچی تعلیم گاہ کے ایک مسئلہ و معاملہ میں، خود اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پانے والوں اور ان سے بھی بڑھ کر ولایت تک کے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتوں ـــ یعنی یونیورسٹی کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں ـ کا مابینی اختلاف ہے

غریب دقیانوسی مولویوں ملانوں یا ان کے مدرسوں کے طلبا و اساتذہ اور منتظمین نے اپنے باہمی اختلافات چکانے کے لئے یہ تازہ تازہ ماڈرن تجربات خواب میں بھی کیوں کئے ہوں گے اور اب دینی و عربی مدرسوں میں بھی یہ اس طرح کی کشمکش کی خبریں کبھی کبھی سننے میں آجاتی ہیں وہ تمام تر اسی ماڈرن تعلیم گاہوں اور تعلیم والوں کا فیض اور تعدیہ ہوتی ہیں۔ پھر ان تعلیم گاہوں سے باہر جو طرح طرح نو پید اقومی وسیاسی ومعاشرتی ومعاشی اختلافات کے فساد انگیز و خون ریز ہنگاموں کی ہر روز خبریں کم وبیش ہر ملک مختلف گوشوں سے اخباروں میں آتی رہتی ہیں کیا وہ اسی ماڈرن لادینی تعلیم کی برکات کے سوا کچھ اور ہوتی ہیں ہاں! بس لادینی تعلیم کے لادینی پروپیگنڈہ کا بھلا ہو کہ

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔

وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہمارے حضرات علماء بھی اس لادینی پروپیگنڈہ کے زہر سے اتنا متاثر ہو چکے ہیں کہ دین کی سیدھی سادھی راہوں کو چھوڑ کر لادینی اختلافات کی فتنہ پرور ٹیڑھی راہوں میں نہ صرف عملاً مبتلا ہوتے رہتے ہیں بلکہ کھینچ تان کر کتاب وسنت سے ان کی تائید وتحسین فرمانے لگے ہیں۔

علماء کا ڈائریکٹ ایکشن

ابھی چند ہی مہینے پہلے پاکستان میں قادیانی دشمن تحریک کے سلسلہ میں نام نہاد راست اقدام (ڈائریکٹ ایکشن) کیسا غلط اقدام تھا جان و مال کی کتنی بربادی اور خونریزی، کم و بیش ہر مسلک کے کتنے علماء اس میں شریک گرفتار اور قید ہوئے اب مقدمات چل رہے ہیں ان میں الگ ان کی رسوائیوں کے ساتھ ساتھ لازماً دین کی بھی رسوائی ہو رہی ہے عدالت کے سامنے بعضوں کے بیانات متضاد و مضحک آرہے ہیں

ان کا حقیقی ڈائریکٹ ایکشن

حضرات علماء کا تو آج سارے اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں میں سیدھا کام (ڈائریکٹ ایکشن) سب سے پہلے پرامن اصلاحی و تبلیغی جدوجہد سے نام کے مسلمانوں کو کام کا مسلمان بنانا ہے نہ صرف نماز روزہ یا عبادات اور حقوق اللہ کے اعتبار سے بلکہ اس سے بھی بڑھکر اخلاق و عادات، معاملات اور معاشرت یا حقوق عباد کے اعتبار سے مسلمان بنانا صد فی صد ہی کہ یہ عملاً نہ کبھی ہوا ہے نہ ہو گا لیکن جدوجہد صد فی صد کی ہی ہونی چاہئے۔ تب جا کر کسی معتدبہ درجہ میں کوئی ایسا موثر اسلامی معاشرہ یا سوسائٹی پیدا ہو گی کہ پھر اسی سے بیرونی جہاد و مدافعت کے لئے سپاہی بھی ملیں گے اور اندرونی تحریکات کو اسلامی نہج پر چلانے والے رضاکار بھی۔ اور پھر کسی مصلحت وقت سے راست اقدام وغیرہ کے کسی نئے طریقہ کو بھی اختیار کرنے کی اگر ضرورت ہوئی تو اسلامی روح کے ساتھ علماء و عوام سب اس کو استعمال و اختیار کر سکیں گے اور کرنا کہیں جائز یا مستحب اور کہیں واجب ہو گا ابھی تو ان تحریکوں میں حصہ لینے والے عام مسلمان ہی نہیں

ان کے رہنما اور لیڈر بلکہ خود بہتیرے علما تک اسلام کا نعرہ لگانے کے ساتھ ساتھ ہی اسلام کے حدود و قیود کو قدم قدم پر توڑتے اور پامال کرتے ہیں جس سے اسلام کا نام ملبند ہونے کے بجائے بدنام ہوتا ہے اور دین کے دشمنوں کے لئے ملا ازم پر استہزا کا مواد فراہم ہوتا ہے۔ بات میں بات نکل آئی، تاہم غور کیا جائے تو جڑ اکثر اختلافات وفسادات کی — خواہ پرانے مولویوں کے ہوں یا نئے مسٹروں کے — غیر معادی معاشیات یا پیٹ ہی ہے خصوصاً آج کل، پہلے اگر کسی بھلے آدمی کو کہہ دیا جاتا کہ وہ پیٹ ہی پیٹ ہے تو اس کو گالی سے کم اپنے حق میں نہ جانتا۔ لیکن اب تو ایک طرف سے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم گاہوں اور یونیورسٹیوں کے اندر علانیہ یہ فلسفہ پڑھایا جاتا ہے کہ انسان اور انسانی زندگی کے سارے مسائل و مشاغل کا نچوڑ صرف پیٹ اور روٹی یا معاش اور معاشیات ہے تو دوسری طرف عملی زندگی و سیاست میں اس فلسفہ کی مؤمن و منکر تمام حکومتیں اپنی رعایا اور شہریوں کو جو عملی سبق سب سے زیادہ پڑھاتی اور رٹاتی اور اپنے سارے اصلاحی و تعمیری منصوبوں اور تجویزوں کے جو اغراض و مقاصد بتاتی رہتی ہیں کم و بیش سب کی تان روٹی اور پیٹ یا مادی و معاشی زندگی ہی کی سرگرمیوں پر ٹوٹتی ہے۔

بڑی اہم معاشی تجدید بہرحال یہ تو درمیان میں ایک ضروری استطرادی بات کی کچھ تفصیل آگئی، اصل گفتگو انفاق کے ذیل میں مجدد وقت کی ایک بڑی اہم اصلاحی تجدید حفاظت مال کی چل رہی تھی ماحصل اس کا یہ تھا کہ گو اسلامی و قرآنی معاشیات میں کسب مال کے بجائے زیادہ تعلیم و ترغیب انفاق مال کی ہے لیکن اس انفاق کا مطلب جس طرح معاصی میں خرچ کرنا نہیں اسی طرح مباحات میں بھی روپیہ اڑانا یا اسراف اور فضول خرچی سے کام لینا قرآن و اسلام کی معاشی تعلیم کے قطعاً

منافی ہے اور اسراف کا یہ مرض جو بہت سے ایسے دیندار دں تک میں پایا جاتا ہے جو مال و معاش کے کسب وحصول میں حرام وحلال جائز و ناجائز کی احتیاط کرتے ہیں اس کا بڑا منشاء اپنے مکسوب یا کمائے ہوئے مال کو خود اپنا سمجھ بیٹھنے کی غلطی اور غلط فہمی ہوتی ہے حالانکہ ہمارے پاس ہماری حلال طیب کمائی بھی جو کچھ ہے وہ بھی دراصل ملک اللہ تعالیٰ ہی کی ہے جیسے غلام کی کمائی آقا کی ہوتی ہے جب ہم خود ہی اپنے نہیں تو ہماری کوئی چیز کیسے اپنی ہو گی۔

بس دو باتیں قابل لحاظ ہیں ہم اور ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے ایمانی و اسلامی تعلیمات کی رو سے سب کے حقیقی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہیں ہماری حیثیت محض امین کی ہے ہمارا کام فقط اصل مالک کی مرضی یا احکام شریعت کے مطابق اس امانت کو خرچ کرنا ہے کتاب وسنت کی رو سے جو انفاق اسلامی معاشیات کی جان ہے اس کی نوعیت تمام تر یہی ہے کہ ہم اپنی کمائی کی کوئی پائی بھی خدا کی مرضی یا شریعت کی اجازت کے بغیر خرچ نہ کریں، اسلام کی انفاقی معاشیات کی اس حقیقت و نوعیت کے سمجھنے میں علماء و صلحاء تک سے عملاً جو غلطی اور غلط فہمی ہوئی ہے اسباب الفتنہ ہی میں ایک موقع پر اس کو مختصراً لیکن نہایت وضاحت کے ساتھ دور فرمایا گیا ہے کہ

> بس دو باتیں قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ آمد قاعدہ کے موافق ہو دوسرے یہ کہ خرچ قاعدہ کے موافق ہو بعض لوگ آمد میں تو احتیاط کرتے ہیں (کہ سود، رشوت، دغابازی وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں) مگر خرچ میں اس کی رعایت نہیں کرتے بس یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارا مال ہے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔

مال ہمارا نہیں اسلام کی انفاقی معاشیات یا خرچ کے معاملات میں سب سے اہم و اقدم بات یہی یاد اور مدنظر رکھنے کی ہے کہ ہماری کمائی بھی ہماری نہیں کہ اس کو جس طرح چاہیں خرچ کریں۔

جب تم خود ہی اپنے نہیں بلکہ خدا کے ہو تو پھر تمہارا مال کدھر سے تمہارا ہوا تم محض امین ہو اور مال تمہارے ہاتھ میں امانت ہے اور امانت میں خیانت کرنا جرم ہے لہٰذا مال میں تم مرضیٔ حق (یعنی احکام شریعت) کے خلاف کسی تصرف کے مجاز نہیں،، (ص ۶۵)

اس امانتی حقیقت کو نہ صرف قرآن مجید میں اس کلی عنوان سے بار بار دہرایا گیا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے سب اللہ ہی کا ہے وہی اس کا مالک حقیقی ہے لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ بلکہ خود انفاق کی ترغیب و تحریص کی آیات و احکام میں بھی مال و معاش یا رزق کی ملک و عطا کی نسبت خود اپنی ہی طرف فرما کر ہم کو خرچ کرنے پر ابھارا اور اس کا حکم دیا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ۔ نفس رزق کے علاوہ رزق کی کمی و زیادتی تنگی و فراخی یا بسط و قدر کے بارے میں بھی بکثرت اور حصر کے ساتھ فرمایا کہ،، اللہ ہی جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے

فرد و جماعت و قوم و حکومت کوئی ملک و مال کی مالک نہیں

غرض اسلامی معاشیات کی رو سے مال و معاش اور اس کے کسب و حصول کے ذرائع و وسائل کا مالک نہ فرد ہے نہ جماعت یا قوم و حکومت، سب کا مالک حقیقی بالکلیہ اللہ تعالیٰ ہے انسان کو محض امین یا عارضی و مجازی طور پر تکوینی و تشریعی مصلحتوں سے مالک و متصرف بنا دیا ہے تو اس سے حقیقی ملکیت یا من مانے تصرفات

کے حقوق اس کو کیسے حاصل ہو جا سکتے ہیں اسباب الفتنہ کی طرح اسباب الغفلۃ کے سلسلہ میں بھی انفاق یا مالی تصرفات کی نسبت یہی ارشاد ہے کہ:۔

سب کچھ حق تعالیٰ ہی کا ہے انسان یہ سمجھتا ہے کہ مال ہمارا ہے جہاں چاہیں اڑائیں۔ مگر یہ غلطی ہے انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے حق تعالیٰ کا ہے جس میں وہ محض امین ہے کہ جہاں خدا کی اجازت ہو وہاں صرف کرنے کا اختیار ہے اور جہاں ممانعت ہو وہاں اس کو ہرگز صرف کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے (ص۸)

آگے شادی بیاہ کے مصارف کی مثال سے معاصی و مباحات دونوں میں اس عدم اختیار کی کچھ تفصیل

کہ بعض جگہ تو خرچ کرنا گناہ بھی ہے جیسے ناچ رنگ میں اور تفاخر کی رسموں میں مگر بہت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمانے میں تو (حلال وحرام کی) احتیاط کی ضرورت ہے لیکن خرچ کرنے میں کیا ضرورت ہے اس خیال کا منشاء یہی ہے، تو انسان صرف کرنے میں اپنے کو خود مختار سمجھتا ہے جس کا غلط ہونا ابھی ابھی معلوم ہو چکا" (ص۹)

علماء و مشائخ تک مبتلا بعض لوگ ناچ رنگ کے کھلے ہوئے معاصی سے تو احتراز کرتے ہیں لیکن فخر و مباہات کی رسموں میں صرف کرنے میں ان کو بھی باک نہیں ہوتا جن سے غرض صرف یہی ہوتی ہے کہ "نام ہو" اور اس میں بہت سے علماء و مشائخ تک لتنے مبتلا ہیں کہ ایک اچھے عالم اور بڑے مشہور عالم و شیخ کے بیٹے نے اپنی صاحبزادی سلمہا کے نکاح میں راقم ہذا کو مدعو فرمایا تھا چھوٹی چھوٹی باتیں تو

بہت سی ان کی شان کے خلاف نظر آئیں لیکن نام ونمود کا مظاہرہ سب سے بڑھ کر جہیز کی نمائش میں کیا گیا تھا ایک بڑے چبوترہ پر جہیز کا سارا سامان ایک ایک چیز کو خوب پھیلا کر چن دیا گیا تھا تاکہ آنے جانے والے بے تکلف اس کی دید اور داد کا حق ادا کر سکیں۔

گو صاحب تقریب میرے مخدوم اور مخدوم زادہ مگر تاہم بڑے بے تکلف دوست تھے میں نے عرض بھی کیا کہ یہ نمائش آپ کے علم و صلاح کو اور بھی زیب نہیں دیتی مگر ان کے نزدیک یہ کچھ زیادہ لائق التفات بات نہ تھی، خود اس نالائق کو اپنی شرکت پر تاسف ہوا۔ غرض عوام نہیں بہت سے علما و مشائخ دیندار و مقتدا بھی رسوم میں روپیہ صرف کرنے کو برا نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اس میں حرج کیا میں کہتا ہوں کہ جناب ذرا اس غرض کو تو دیکھئے نیت پر تو نظر کیجئے کہ (اس طرح کی باتوں یا) دھوم دھام میں نیت کیا ہوتی ہے صرف تفاخر و ریا ہی کی تو ہوتی ہے کہ ہمارا نام ہو، لوگ کہیں کہ بڑا حوصلہ کا آدمی ہے اور جب نیت یہ ہے تو بتلائیے کہ یہ افعال کہاں جائز ہے۔

مگر لوگوں نے مباحات میں اتنی وسعت سمجھ رکھی ہے کہ گویا ان میں بری بھلی نیت تک پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا نہ اسراف اور فضول خرچیوں کی ان میں کوئی حد بندی ہے

مباحات کا قاعدہ حالانکہ مباحات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ فی نفسہ جائز ہیں لیکن اگر ان کو بری نیت سے کیا جائے تو ناجائز ہو جاتے ہیں مگر افسوس کہ اب تک تو یہ بات بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی کہ نام و نمود کا قصد کرنا کوئی برا کام ہے اس میں گفتگو اور بحث

کی جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو علم دین کی خبر نہیں حدیث وقرآن پڑھتے نہیں۔ (ص۹)

جو پڑھتے بھی ہیں سمجھتے نہیں

بیشک بہت سے لوگ بے خبر بھی ہیں لیکن کیا کہا جائے کہ علم دین کے اچھے اچھے خبرداروں ہی کو نہیں دن رات قرآن وحدیث پڑھنے پڑھانے والوں، دینی مسائل ومباحث پر بڑی بڑی کتابیں لکھنے والوں تک کو اس آفت میں گرفتار ہی نہیں بلکہ قرآن وحدیث کا نام لے لے کر زور شور سے اس کی تائید کرتے دیکھا، بس یہی ہوسکتا ہے جیسا کہ خود آگے حضرتؒ فرماتے ہیں کہ "جو پڑھتے ہیں وہ اکثر سمجھتے نہیں" بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ سمجھنا چاہتے نہیں۔

میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

ورنہ تو دین کی سمجھ رکھنے والے کے لئے بالکل معمولی سمجھ کی بات ہے کہ اخلاص جس کا ہر چھوٹے بڑے عمل میں مطالبہ ہے اس کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا یا شریعت کی اتباع کے سوا نام ونمود، فخر ونمائش وغیرہ کی کوئی بھی اور نیت رکھنا گناہ کیا محققین عارفین کی نظر میں تو ایک گونہ شرک ہے گو خفی سہی، لباس کا معاملہ بظاہر کیسا معمولی اور مباح معاملہ ہے لیکن

شہرت کا لباس

حدیث کو دیکھئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من لبس ثوب الشہرۃ البسہ اللہ ثوب الذلۃ یوم القیامۃ یعنی جو کوئی شہرت اور نام کے لئے کپڑا پہنے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا۔ حالانکہ کپڑے میں کچھ زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا

مگر شہرت کیلئے اتنا خرچ کرنا بھی جائز نہیں پھر جہاں اس (نام و شہرت کی) غرض کیلئے ہزاروں روپے برباد ہی پھر جائیں وہ رسمیں کیسے جائز ہو سکتی ہیں ۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ ستر پوشی، موسمی ضرورت اور معمولی صفائی کے درجہ تک واقعی کپڑے میں کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا، خود راقم ہذا کا تجربہ ہے کہ کھانے پینے سے بھی بہت کم پہننے اوڑھنے میں خرچ ہوتا ہے مگر کب؟ جبکہ واقعی و واجبی ضرورتوں پر اکتفا کیا جائے ورنہ اس لباس میں اگر قل من حرم زینۃ اللّٰہ التی اخرج لعبادہ کی جائز زیب و زینت سے تجاوز کرکے تعیش و نمائش میں آدمی پڑ جائے تو کھانے پینے سے کہیں زیادہ لباس خصوصاً عورتوں کا لباس و زیور ہی دیوالہ نکال دیتا ہے اور آج کل تو لباس کا کیا ذکر فیشن کی متوالی عورتیں لپ سٹک اور غازوں وغیرہ پر ہر ملک کا کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہا رہی ہیں ظاہر ہے کہ اس فیشن پرستی بلکہ فیشن بازی کا نمود و نمائش کے سوا اور مقصود ہی کیا ہوتا ہے خصوصاً جب اس بناؤ سنگار کا اہتمام باہر نکلتے یا سینما اور کلب جاتے وقت زیادہ ہوتا ہے، حضرت علیہ الرحمۃ نے تو پرانے فیشن کی پردہ میں رہنے والی عورتوں تک کا رنگ یہ لکھا ہے کہ جب وہ کسی تقریب یا محفل میں جمع ہوتی ہیں تو زیور و لباس ہی کا دیکھنا دکھلانا ان کا خاص مشغلہ ہوتا ہے ۔

ہاتھ پاؤں کا زیور تو ہر ایک کو خود ہی نظر آجاتا ہے اس کے دکھلانے میں زیادہ اہتمام کی ضرورت البتہ گلے اور کان کا زیور دوپٹہ کی وجہ سے چھپا ہوتا ہے تو اس کے لئے کبھی کھجلانے کے بہانہ دوپٹہ کو سرکا دیا جاتا ہے تاکہ سب دیکھ لیں کہ اس کے کانوں میں اتنے زیور ہیں اور گلے میں اتنے ،، صـ۱۰۱

دعوت زنا ذوق نمود کا یہ نسوانی فیشن بھی اب دنیا تو سی ہو چکا اب تو پردہ کی محفل سے زیادہ بے پردہ کلبوں کانفرنسوں بلکہ بازاروں اور سڑکوں پر اور عورتوں سے زیادہ مردوں سے اپنے حسن وجمال، زیبائش وآرائش کی داد لینا مقصود ہوتی ہے اور فخر ونمائش سے بھی بڑھ کر مردوں کو آنکھوں کی زنا کی علانیہ دعوت ہوتی ہے

حرام میں شرکت بھی حرام اسلامی تعلیمات ومعاشیات کی رو سے فخر ونمائش کی باتوں یا رسموں میں خود روپیہ برباد کرنا ہی حرام نہیں بلکہ ایسی چیزوں میں کسی طرح کی شرکت یا ہمت افزائی بھی قطعاً ناجائز اور معصیت ہے
کیونکہ اس سے معصیت میں اعانت (اور ہمت افزائی) ہوتی ہے
اگر لوگ (ایسی نام ونمود کی باتوں میں اور) رسموں میں شرکت نہ کریں
تو کسی کو ان میں روپیہ برباد کرنے کا موقع ہی نہ ملے (ص ۹)

ایسی دعوت میں شرکت ممنوع موقع ملنا کیسا کوئی بھول کر بھی ایسی باتوں کے پاس نہ جائیگا آدمی روپیہ پیسہ یوں ہی خوشی سے تھوڑا ہی برباد کرتا ہے اس لئے اگر کسی سوسائٹی اور سماج میں ان خرافات سے اتنی بیزاری ہو کہ لوگ شریک ہونا تک پسند نہ کریں تو کون احمق روپیہ خرچ کر کے دوستوں عزیزوں کی الٹی بیزاری اور ناپسندیدگی کا سودا کرے گا یہ تو سب کیا ہی جاتا ہے شریک ہونے والوں کو دکھلانے اور ان سے داد حاصل کرنے کی غرض سے اسی بنا پر اسلام خود معصیت کے ارتکاب ہی کو نہیں اس میں کسی طرح کی شرکت واعانت

یا ہمت افزائی کو بھی معصیت ہی قرار دیا ہے حدیہ کہ ایسی دعوت اور کھانے تک میں شرکت سے منع کیا گیا ہے جو زیادہ تر نمائش یا فخر و مباہات کے لئے کی گئی ہو۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن طعام المتبارئین ان یوکل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخصوں کا کھانا کھانے سے بھی منع فرمایا جو باہم فخر کے لئے کھلاتے ہوں۔

دعوت ولیمہ سنت ہے اس میں بھی اگر نیت اچھی نہ ہو یا نام و نمود کی آمیزش ہو تو اسی حدیث کی بناء پر امام شعرانی نے ایسے ولیمہ میں بھی شرکت کو ناجائز کہا ہے (صفا) ——— اس سلسلہ میں حضرت مجددؒ نے عورتوں کے خرچ کی بعض ایسی ناجائز صورتوں کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی ہے جو کم و بیش سب ہی مسلمان گھروں میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے کہ

شوہر کے مال میں عورت کے عزیزوں کا کوئی حق نہیں بعض عورتیں رقمیں جوڑ جوڑ کر خاوند سے چھپا کر اپنے گھروں کو بھیج دیا کرتی ہیں کسی بہانہ سے باپ کو دیدیا کسی بہانہ سے ماں کو دیدیا یہ سخت گناہ ہے مرد کے مال میں عورت کے عزیزوں کا شرعاً کوئی حق نہیں اگر دینا ہے تو مرد سے پوچھ کر دینا چاہئے خاوند جو مال عورت کو بالکل بطور ملک کے دے ڈالے اس میں سے بلا اجازت تو عورت کو صرف کرنا جائز ہے اور جو مال اس کو ہبہ نہ کرے بلکہ گھر کے خرچ کے واسطے دے یا جمع

رکھنے کے لئے۔ اس میں بلا اجازت صرف کرنا ہرگز جائز نہیں حتیٰ
کہ سائل کو بھی دینا جائز نہیں [1] (ص۱۴۱)

خیر و خیرات تک کا حق نہیں بعض عورتیں غضب کرتی ہیں کہ کسی وعظ
وغیرہ سے جوش میں آکر بے سوچے سمجھے زیور تک چندہ میں دیدیتی ہیں۔ حالانکہ
جو زیور خاوند نے محض پہننے کے لیے دیا ہو وہ چندہ میں دینا بدون
خاوند کی اجازت کے جائز نہیں
اس سے بڑھ کر غضب یہ کہ
لینے والے بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ قصداً عورتوں میں وعظ
کہتے ہیں کہ زیور حاصل ہو"
کوئی سفیر واعظ اس طرح خاص کر عورتوں میں چندہ ہی کے لئے وعظ کہا کرتے تھے
ایک دن کسی عورت نے اپنے کان کی بالیاں سونے کی چندہ میں دیدیں
سفیر صاحب بڑے خوش ہوئے تھوڑی دیر میں خوشی کرکری ہو گئی ۔۔۔۔ خاوند
سفیر صاحب کے پاس آیا کہ آپ کو میری بیوی نے سونے کی بالیاں چندہ
میں دے دی ہیں وہ واپس کیجئے وہ اس کی ملک نہیں میری ہے
اس نے بغیر میری اجازت کے دیا ہے، سیدھی اور معقول بات تھی

---

[1] ابھی حال ہی میں ایک دوست نے اپنی بڑی دردناک مصیبت لکھی اور مشورہ طلب کیا کہ پنشن کافی نہیں ہوتی اور بیوی کو جو کچھ خرچ دیا جاتا ہے اس میں سے وہ اپنی ماں اور بھائی کو بھی بھرتی رہتی ہے میرے بڑھاپے اور بیماری پر رحم نہیں کھاتیں۔ بس یہی حکم اور ضد ہے کہ جہاں سے بنے کماؤ اور لاؤ حالانکہ یہ بیوی صاحبہ ماشاء اللہ خود حضرت تھانویؒ کی مریدہ ہیں

مگر سفیر صاحب کسی طرح واپس دینے کو تیار نہ تھے اور اس سے جھگڑنے لگے آخر وہ سفیر صاحب خود حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور بڑا عذر یہ کیا کہ میں تو سو روپیہ کی رسید کاٹ کر دے چکا ہوں اب اگر بالیاں واپس دوں تو مدرسہ والے روپیہ مجھ سے وصول کر لیں گے میں نے (حضرتؒ نے) کہا کہ اس کی تدبیر یہ کیجئے کہ اس رسید پر ان کے قلم سے لکھوا لیجئے کہ ہم نے چندہ واپس لے لیا اور دو گواہیاں بھی کرا لیجئے

(التحصیل والتسہیل صفحہ ۱۶۱)

اسی طرح کانپور کے ایک واقعہ کا ذکر فرمایا ہے کہ

کسی کی بیوی نے مراد آبادی حقہ ایک مدرسہ میں (محض) عاریتہً دیدیا خاوند نے بیحد سختی کی، غرض جبتک اجازت صراحتہً نہ ہو یا ظن غالب نہ ہو اس وقت تک عورتوں کو چندہ میں کچھ نہ دینا چاہیئے (صفحہ ۱۶۲)

خود حضرت کو اس معاملہ میں اتنی احتیاط تھی کہ :۔

مستورات میں چندہ بلقان کے لئے وعظ کہا تو یہ کہدیا کہ عورتوں سے زیور نہ لیں گے اور اگر کوئی زیور لایا تو اس میں خوب کھود کرید کی کہ یہ زیور تمہاری ملک ہے یا بیوی کی؟ اگر بیوی کی ہے تو اس نے خوشی سے دیا، یا تمہارے کہنے سے اور اگر اس نے دیا تو تمہاری بھی رائے ہے یا نہیں؟ جب اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ میاں بیوی دونوں کی رضامندی سے دیا جا رہا ہے اس وقت قبول کیا جاتا ‘‘

دیکھا آپ نے کہ انفاق اور وہ بھی خالص نیکی اور دین کے کاموں میں۔ اس میں بھی حکیم الامت کی حکیمانہ تجدیدی و اصلاحی نظر کہاں کہاں جاتی اور امت کیسی کیسی مصلحتوں پر پڑتی ہے! آگے ایک بڑا اگر عورتوں کو فضول خرچی سے بچانے

کا یہ ارشاد ہے کہ زیادہ مال و زیور پر ان کو قبضہ نہ دیا جائے بس ضرورت کے موافق تھوڑا سا روپیہ ان کو دیدیا جایا کرے (ص ۱۶)

مردوں کو تنبیہ زیور و لباس وغیرہ میں نمود و نمائش کی راہ سے عورتوں میں فضول خرچی کا مرض جو پیدا ہو جاتا ہے اس کا ایک بڑا سبب ان کا آپس میں ملنا جلنا ہوتا ہے کہ اس سے ایک دوسری کی ریس اور برابری، بلکہ سب سے بڑھ جانے اور کسی حد پر نہ ٹھہرنے والی ہوس پیدا ہو جاتی ہے اس پر تنبیہ فرماتے ہیں کہ:۔

> میں مردوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ عورتوں کی فرمائشوں کا زیادہ تر سبب ان کا باہم ملنا جلنا ہے جب یہ محفلوں میں جمع ہوتی ہیں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر حرص کرتی ہیں کہ کاش میرے پاس بھی فلاں کا سا زیور اور کپڑا ہو۔“ (ص ۱۱)

اسی سلسلہ میں چار پانسو [۵] پانے والے ایک اچھے بڑے عہدیدار کا سبق آموز واقعہ خود اپنے علم کا بیان فرماتے ہیں کہ:۔

> ابتداء میں ان کی یہ حالت تھی کہ اپنی تنخواہ کا زیادہ حصہ اپنے غریب عزیزوں پر صرف کرتے تھے۔ بہت سے محتاجوں کی انہوں نے ماہوار تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں اپنے اوپر بہت کم خرچ کرتے تھے گھر میں کھانا پکانے والی تک نہ تھی بیوی اپنے ہاتھ سے سارا کام کرتی تھیں نہ زیور تھا نہ بڑھیا کپڑے اپنے ہاتھ سے آٹا تک پیس لیتی تھیں۔“

کیسا قابل رشک اسلامی فاطمی زندگی کا نمونہ تھا جبتک آدمی مال کو خود اپنی ملک کی بجائے خدا کی امانت جان کر اور واجبی واجبی ضرورتوں پر قناعت کر کے ایسی سیدھی سادی زندگی نہ بسر کرے مالی ایثار و قربانی یا غریبوں اور حاجتمندوں

پر انفاق کی گنجائش ہی کہاں سے نکل سکتی ہے۔

آگے دیکھئے یہی بیوی صاحبہ دوسروں سے مل جل کر ان کی ریس میں کیا رنگ لاتی ہیں ان عہدہ دار کی بدلی سہارنپور ہوئی کرایہ کا مکان ایک سر رشتہ دار صاحب کے پڑوس میں ملا۔ یہاں کچھ دن تو وہی پہلی سی سادہ زندگی اور اس کی برکت سے پہلے ہی کی طرح خیر و خیرات کے مصارف جاری رہے کچھ دن بعد سر رشتہ دار صاحب کے گھر والوں نے اپنی نئی پڑوسن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی عہدہ دار صاحب نے پہلے تو ٹالا مگر بالآخر بھیجنا پڑا۔

یہاں آکر دیکھا کہ سر رشتہ دار صاحب کی بیوی اور بچیاں سر سے پیر تک سونے کے زیورات میں لدی ہوئی ہیں اور گھر میں فرش و فروش ساز و سامان بھی بہت کچھ ہے کھانا پکانے والیاں ایک چھوڑ دو دو نوکر ہیں اور بیوی صاحبہ کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتیں بس بیٹھی بیٹھی سب پر حکومت کرتی ہیں۔

اب تو آنکھیں کھلیں کہ تنخواہ تو سر رشتہ دار صاحب کی میرے میاں سے کم ہے اور پھر ان کے ہاں ایسی رونق ہے اور میرے میاں کی اتنی تنخواہ پھر بھی میرے اوپر نکبتی برستی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ

وہاں سے آتے ہی میاں پر برسنا شروع کیا کہ تم مجھ کو بہت تنگ رکھتے ہو تم سے کم تنخواہ والوں کی بیویاں مجھ سے اچھی حالت میں ہیں اور میں ایسی مصیبت میں ہوں مجھ سے کھانا نہیں پکایا جائے گا نہ میں آٹا پیسوں گی پکانے والی نوکر رکھو اور مجھ کو بھی زیور و لباس عمدہ عمدہ بنا کر دو جیسا کہ سر رشتہ دار صاحب کی بیوی کا ہے آخر بیچارے

مجبور ہوئے اور سب ہی کچھ کرنا پڑا۔ (ص۱۱)

شمع انجمن بیوی جب ایک پرانی پردہ نشین چراغ خانہ بیوی کے ہاتھوں میاں کو اس طرح مجبور ہونا پڑا۔ تو نئی شمع انجمن کلبوں ناچ گھروں میں جانے والی بازار میں گھومنے شاپنگ کرنے والی اور طرح طرح کے نسوانی زیب وزینت کے سامانوں سے بھری دوکانوں اور ہم جنسوں کو آراستہ پیراستہ دیکھنے والی بیگموں اور لیڈیوں پر بھلا کون صاحب بہادر اتنے بہادر ہیں کہ قابو پاسکیں خصوصًا جب ان کے اندر حجاب وحیا تک کی دینی و اخلاقی روح ناپید ہے اور خود ہی بیوی سے زیادہ غیروں کی نظر میں بیگم صاحبہ کے حسن وجمال کو دوبالا دیکھنا دکھانا چاہتے ہیں تو اسلامی ایثار وانفاق کا اس ماڈرن غیر معادی معاشیات کے آس پاس بھی کیسے گذر ہو سکتا ہے دراں حالیکہ مذکورہ بالا سیدھے سچے مسلمان عہدہ دار کی سچی اسلامی معیشت ومعاشرت اس بے دردی سے قربان ہوئی کہ بعد کو کسی موقعہ پر الٰہ آباد میں حضرتؒ سے ملے تو کہنے لگے کہ جناب شیخ کامل (سررشتہ دار صاحب کی بیوی) کی تھوڑی دیر کی صحبت کا وہ اثر ہوا کہ میری سالہا سال کی صحبت کا اثر دم بھر میں زائل ہو گیا اب نہ وہ خیر خیرات رہی نہ صدقات رہے، ساری تنخواہ گھر ہی میں خرچ ہو جاتی ہے پھر بھی پورا نہیں پڑتا بس رات دن زیوروں کی فرمائش ہے اور کپڑوں برتنوں کا رونا ہے آج کل مکان بنانے کی فرمائش پوری کرنے میں مشغول ہوں۔

اسی لئے امت کے حکیم کی حکیمانہ رائے یہی تھی کہ عورتوں کو آپس میں (ضرورت سے زیادہ) ملنے نہ دیا کرو ایک خربوزہ سے دوسرا خربوزہ رنگ پکڑتا ہے عورتوں سے زیادہ عورتوں کے نام نہاد حقوق آزادی کی وکالت کرنے والے اور آپس میں

عورتوں کیا غیر مردوں تک سے اپنی بیویوں، بیٹیوں کو بے محابا ملنے ملانے پر اصرار کرنے والے ظاہر ہے کہ "ملا ازم" کی اس راتنے کو کس غیظ و غضب سے سن رہے ہوں گے۔

مثالی بیویاں لیکن حقائق و واقعات تو بہر حال کسی کے غیظ و غضب سے ڈرا اور بدلا نہیں کرتے، نہ یہ سمجھا جائے کہ ان واقعات کے اظہار سے حضرت حکیم الامت کو عورتوں کی کوئی اہانت مقصود تھی یا سب عورتوں کو یکساں تصور فرماتے تھے حضرت کی تو بڑی بات ہے کون مسلمان حضرت فاطمہ و عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی سی زندگی کی طرف حقارت کی نظر اٹھا کر ایمان کی خیر منا سکتا ہے، نہ الحمدللہ امت اپنے نبی الامت کی بیٹی (فاطمہ) اور اپنی ماؤں (امہات المؤمنین) کو اتنا بھلا چکی ہے کہ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی خود دوسروں کو سبق دینے والی اور واقعی "شیخ کامل" بیویوں کی مثالیں سرے سے عنقا ہوں۔ خود حضرت نے اسی اسباب الغفلت میں کئی ایسی مثالیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے ہر ایک ایمانی زندگی کا مستقل درس ہے

> حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی کا جب نکاح ہوا تو ان کے خاوند ۔۔۔۔ کی تنخواہ زیادہ نہ تھی اس لئے بالائی آمدنی میں کچھ زیادہ احتیاط نہ تھی لیکن صاحبزادی نے پہلے ہی دن ان سے کہدیا کہ میں تمہارے گھر اسوقت تک کھانا نہ کھاؤں گی جبتک بالائی آمدنی سے تم توبہ نہ کروگے غرض ان اللہ کی بندی نے جاتے ہی خاوند سے توبہ کرائی اور عہد لیا کہ آئندہ کبھی رشوت نہ لی جائے (ص۲)
> ایک دوسری اسی طرح کی مومنہ صالحہ نے ایک اور عجیب صورت اختیار کی۔

ان کے خاوند تحصیلدار تھے جن کے متعلق آبکاری کا انتظام بھی تھا
ان کی بیوی نے اپنے خاوند کی آمدنی کو ہاتھ نہ لگایا نہ اس میں سے
زیور بنایا نہ کپڑا۔ کمال یہ کیا کہ مقام ملازمت پر رہنے کے زمانہ میں
غلہ اور نمک تک ہر چیز اپنے میکے سے منگاتی تھیں۔ اور شرافت
یہ کہ شوہر کو اطلاع تک نہیں کہ ان کو رنج نہ ہو "

تھانہ بھون کے قریب ایک قصبہ کاندھلہ ہے جہاں اچھے اچھے علماء و صلحاء ہی نہیں ہوتے رہے عورتیں تک بڑی صالحہ ہوتی رہیں ان ہی میں سے ایک بی بی کا ذکر ہے کہ ان کے شوہر کے ہاں کچھ زمین رہن تھی جس کی آمدنی وہ اپنے صرف میں لاتے تھے مگر ان بی بی رہن کی اس آمدنی سے ایک حبہ نہیں کھایا۔ آگے ارشاد ہے کہ

مردوں سے بڑھ کر مضبوط دیندار بیویاں

میں سچ کہتا ہوں
کہ بعض عورتیں مردوں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہیں اس لئے
جو عورتیں یہ کہتی ہیں کہ ہم مجبور ہیں خاوند جو لاتا ہے وہی کھانا پڑتا
ہے یہ محض ان کے لچر بہانے ہیں اگر زیور اور کپڑوں کی فرمائش نہ کیا
کریں تو بہت سے مرد خود ہی رشوت سے توبہ کر لیں اور جو کوئی
پھر بھی لے تو عورتیں ہمت کر کے ان سے کہدیں کہ ہمارے پاس
رشوت کا مال نہ لانا۔ صرف حلال تنخواہ کا روپیہ لانا ورنہ آخرت میں
ہم تمہارے دامنگیر ہوں گے دیکھئے پھر مردوں کی کتنی جلدی اصلاح
ہوتی ہے۔

ایسی باتیں بھی اب کون سنتا ہے! ماشاء اللہ! بی بی میاں دونوں مہذب ہیں، ایک قریب ترین نوجوان عزیز جو طبعاً خاصے سعید ہیں اور ابتدا

دینی تعلیم و تربیت ہی سے کرائی گئی تھی سترہ پارے حفظ بھی کر لیئے تھے بعد کو ان کے قریب تر سرپرستوں نے دوسری راہ پر ڈال دیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابھی چند مہینے قبل دو سال سے کم بیاہی بیوی کو بیگم صاحبہ ہی نہیں پوری پوری میم صاحبہ بنانے کیلئے نومولود بچی کے ساتھ لندن جا پہنچے ہیں! کیسی عبرت کی بات ہے کہ ان کو یتیم چھوڑ کر مرنے والی ماں نے اپنے شوہر کو نماز روزہ ہی کا پابند نہیں بنا لیا تھا داڑھی تک رکھالی تھی، خیال ہوتا تھا کہ انگریزوں سے آزاد ہو کر خصوصاً اسلامی تہذیب و ثقافت کے نعروں سے بننے والے پاکستان کو بہت کچھ انگریزیت سے بھی آزادی مل جائیگی لیکن ہندوستان سے بھی بڑھ چڑھ کر وہاں دن دونی رات چوگنی ترقیاں فرنگی معاشرت و ثقافت ہی کے حصہ میں آرہی ہیں ان عزیز سعید نے بھی پاکستان ہی کی اس فضا سے بی بی بچی سمیت لندن کی بلند پروازی کا سبق لیا۔

عورتوں کی مردانہ اسلامیت کا ایک اور سبق

غرض مسلمان مردوں عورتوں سب ہی کے ہاتھوں اسلام کشی کی یہ المیہ داستانیں اب نایاب کیا کمیاب بھی نہیں رہی ہیں بلکہ شرمناک حدود تک روز افزوں ترقیاں ہی ترقیاں ہیں! لیکن رخصت ہونے والی مسلمان عورتوں کی مردانہ اسلامیت اور اسلامی معیشت ہی کا ایک اور سبق خود حضرت علیہ الرحمۃ کی والدہ مرحومہ کا خود حضرت ہی کی زبان سے سن لیں:-

> میری والدہ نے سارے زیورات اتار کر والد صاحب کے سامنے پھینک دیئے تھے اور یہ فرمایا کہ یا تو ان کی زکوٰۃ دو ورنہ اپنے پاس رکھو میں نہ پہنوں گی، آخر مجبور ہو کر والد صاحب نے سب کی

زکوٰۃ دی جب وہ زیور پہنا گیا۔ (ص ۲۱)

یہ تو آخر حضرت ہی کی والدہ ماجدہ تھیں۔ اس ناکارہ کا جو خود دین و دنیا کے کسی کام کا نہیں خود اپنے گھر کا تجربہ یہ رہا کہ تھوڑی بہت دین کی باتیں جو بتاتا اور سناتا رہا اس کا عملی اثر مردوں سے زیادہ عورتوں ہی نے لیا والدہ مدظلہا کے علاوہ ایک بہن کا تو ماشاء اللہ یہ حال ہے کہ شوہر کے گھر میں جو غیر اسلامی بدعات و خرافات اور مشرکانہ رسوم و عادات تک بھری تھیں ان سب کو تو خیر نکال باہر ہی کیا حج بھی اپنے ساتھ کرا کے چھوڑا۔ زکوٰۃ کے معاملہ میں البتہ شوہر کو آمادہ کرنا مدت تک دشوار رہا مگر اب بحمداللہ خود میرے ذریعہ سے ادا کرتی رہتی ہیں لڑکیاں بھی ان کی لڑکوں سے زیادہ دیندار ہیں خود اس نامہ سیاہ کی اولاد میں بھی لڑکی ہی اللہ کے فضل سے مومنہ صالحہ ہے اور لڑکے زیادہ تر میری شامت اعمال لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔

عورتوں سے مردوں کی اصلاح

یہ واقعات شاہد ہیں کہ عورتیں اگر ذرا مردانہ ہمت سے کام لیں تو مسلمان گھرانوں کی معاشی و معادی دونوں زندگیاں بہت زیادہ آسانی سے اسلامی بن سکتی ہیں۔ خود اپنی والدہ ماجدہ کا اوپر والا زیور کی زکوٰۃ کا واقعہ نقل کر کے حضرت ہی آگے فرماتے ہیں کہ:۔

ذرا عورتیں اس طرح کر کے تو دیکھیں، انشاء اللہ خود بخود مردوں کی اصلاح ہو جائے گی کیونکہ جس طرح بعض دفعہ مرد سے عورت کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح عورت سے مرد کی اصلاح ہوتی ہے اور زوجہ صالحہ (نیک بیوی) تو وہی ہے جو مرد کو دین میں محتاط بنا دے نہ یہ کہ پہلے سے بھی اور زیادہ بے احتیاط بنا دے۔ (ص ۲۱)

اسلامی معاشیات اصلاً اگرچہ تمامتر انفاقی معاشیات ہے اور اس کے تمام اطراف وجوانب پر سیر حاصل بحث کے لئے کم از کم ایک ضخیم مجلد درکار تھا۔ لیکن سلسلہ تجدید کی محدود گنجائش میں نہ اس کی گنجائش، نہ راقم نالائق کا علم و قلم اس کا حق ادا کرنے کے لائق [۱]۔ تاہم ایک مستقل باب کی گنجائش کی حد تک اس نااہل نے بھی اپنی بساط بھر اسلامی بلکہ خالص قرآنی معاشیات میں انفاق کو جو اہمیت حاصل ہے اس کے خاص خاص پہلوؤں کو اوپر پیش کر دینے کی ایک ابتدائی کوشش کی ہے۔ ابتدائی اسلئے کہ اہل نظر کی نظر ابھی تک اس کم نظر کے علم میں اسلامی یا دینی و معادی معاشیات کے اس پہلو پر کہنا چاہیئے کہ پڑی ہی نہیں، لوگ زیادہ تر کتاب و سنت پر بھی آج کل کی جدید لادینی یا غیر معادی معاشیات ہی کے ابواب و مباحث کا رنگ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے رہتے ہیں جو معاملہ تجری دور میں مرعوبیت ہی کی بدولت اسلام کے عقائد و ایمانیات کے ساتھ چلا تھا وہی کم و بیش اب معاشیات و سیاسیات کے ساتھ چلا جارہا ہے کہ رد و قبول دونوں کی آنکھوں پر عینک فرنگیوں ہی کی بنائی اور لائی ہوئی چڑھی ہے۔

اسلامی انفاق کی نوعیت و وسعت

البتہ امت کے حکیم مجدد ہی کے ہاں نفس انفاق کی اسلام میں جو نوعیت اور وسعت ہے اس کے متعلق خالص کتاب و سنت پر مبنی حکیمانہ و مجددانہ تعلیمات و اصلاحات کے کئی اہم پہلو ملتے ہیں اتنا تو اوپر ہی واضح ہو چکا کہ مال و معاش کے کسب و حفاظت کے جو اوامر و نواہی قرآن و حدیث میں ہیں ان سے بھی مقصود بالذات کسب و حفاظت نہیں، انفاق ہی کے مقاصد و مصالح اور حقوق و فرائض کی تکمیل ہے نہ کہ حریصوں اور بخیلوں کی طرح کما کما کر

---

[۱] یہ حق تو حق یہ ہے کہ اپنے زمانہ میں مودودی گیلانی اور دریابادی کے قلم ہی کے ادا کرنے کا تھا

جمع کرنے کی اجازت، خود قرآن نے کیسے سخت تہدیدی طنزیہ عنوان سے خبر دی ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ	جو لوگ سونا اور چاندی کما کما کر جمع کرتے
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا	اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ	ان کو بڑے درد ناک عذاب کی
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (پ ۱۰ توبہ)	خوشخبری سنا دو

اسی طرح بخل کرنے والوں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ "یہ اپنے حق میں بخل کو جو خیر جان رہے ہیں وہ در اصل ان کے حق میں شر ہی شر ہے وہ دن دور نہیں کہ بخل سے جمع کیا ہوا مال قیامت میں خود ان بخیلوں کے گلے کا ہار بنا دیا جائے گا۔
سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ حدیث میں ہے کہ سانپ بنا کر ان کی گردن میں لٹکا دیا جائے گا

کسب نہ فرض ہے نہ واجب کسب جو کنز و بخل سب کا مبنیٰ ہے اس کی اہمیت تو مجدد وقت نے سنت ہی کی بنا پر اتنی گھٹا دی کہ یہ نہ سنت ہے نہ فرض، بس زیادہ سے زیادہ مُباح ہے کیونکہ قبل ظہور نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دنوں کسب معاش کا سلسلہ فرمایا ہے جس سے بہت سے بہت اس کا مباح ہونا ثابت ہوا۔ لیکن بعد نبوت آپ نے کسب کا کوئی سلسلہ نہیں فرمایا (استرار التوبہ ص ۱۸)

اسلامی انفاق کا مطلب جب خود کسب ہی بالذات مقصود و مامور نہیں تو کسب سے جمع کئے ہوئے مال کی حفاظت کے لئے اس پر سانپ بن کر بیٹھ جانا کب جائز ہو گا) اسی طرح انفاق جو کسب مال کا اصل مقصود ہے اس کا مطلب بھی کسی طرح کا اسراف و تبذیر قطعاً نہیں ہو سکتا کہ آدمی مال کو معصیتوں اور عیاشیوں

ہیں اڑاکر شیطان کا بھائی بنجائے اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنَ یا زندگی کی واقعی ضروریات ومباحات میں اعتدال سے نکل کر فضول خرچیوں میں پڑجائے یقین رکھو کہ خدا فضول خرچی کرنیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ہ

ہم اپنے مال کے مالک نہیں

اسلام کی کتاب اور نبی الاسلام کی سنت سے اوپر "معاشیاتِ انفاق" کے باب میں خوب اچھی طرح ثابت ہوچکا کہ اسلامی معاشیا میں انفاق کے معنی شریعت کے احکام کے مطابق یا اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے لئے خرچ کرنے کے ہیں اسی بناء پر حضرت مجدد نے بار بار اور کتنا زور اس پر دیا ہے کہ اپنے مال وملک میں ہماری حیثیت اصل مالک کی قطعاً نہیں محض اللہ تعالیٰ کے امین یا خزانچی کی ہے کہ بغیر کسی خیانت کے اس کی مرضی وحکم کے موافق خرچ کرتے رہیں۔

اسلامی انفاق کا اصل مقصد بھی معاشی مسائل کا حل نہیں

آخر میں اول وآخر سب سے زیادہ توجہ سے سننے اور یاد رکھنے کی بات یہی ہے جس کو سُن کر جدید لادینی معاشیات والے مسٹر ہی نہیں بہت سے دینی واسلامی معاشیات کا نام لینے والے مولوی بھی غالباً چیں بجبیں ہوئے بغیر نہ رہ سکیں کہ اسلام کی معاشیات کے حقیقۃً انفاقی معاشیات ہونے کے باوجود اس انفاق کا حقیقی واصلی مقصد معاشی مسائل ومشکلات کا حل ہرگز نہیں، مطلوب بالذات اُس سے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی وفرمانبرداری اور آخرت کی فلاح ونجات ہے اور یہی اسلام کی دینی ومعادی اور آج کل کی لادینی وغیر معادی معاشیا

کا بنیادی فرق بلکہ تضاد ہے کہ آجکل قومی وملکی علمی وادبی کاموں، اسکولوں اور کالجوں، اسپتالوں اور یتیم خانوں بلکہ مذہبی اداروں تک میں جو چندے دیئے جاتے ہیں وہ زیادہ تر نام ونمود، لحاظ ومروت، زور واثر یا زیادہ سے زیادہ ان کاموں اور اداروں کی دنیوی ضرورتوں اور مشکلوں کو پورا اور دور کرنے کے خیال سے دیئے جاتے ہیں اور ان کو بھی دینی اعتبار سے مصارف خیر شمار کیا جاتا ہے اور خود مسلمان بھی اس مغالطہ کا بالعموم شکار ہوتے ہیں

اسلام میں محض محل انفاق کا اعتبار نہیں

حالانکہ اسلام جس انفاق کی تعلیم ومطالبہ کرتا ہے اس کا فقط محل انفاق کے اعتبار سے بظاہر خیر ہونا بالکل کافی نہیں باطن یا روح یعنی نیت انفاق کے لحاظ سے بھی خیر ہونا لازم ومقدم ہے اور اس نیت سے مراد وہی خدا ورسول کی رضا جوئی وفرمانبرداری اور آخرت کی فلاح ونجات کی نیت ہے، یہاں تک کہ انفاق کا محل ومصرف اگر کسی نادانستہ غلطی اور غلط فہمی سے غلط بھی ہو جائے لیکن نیت صحیح ہو تو وہ انفاق عنداللہ صحیح یا ماجور ومقبول ہوگا، مثلاً کسی غنی کو فقیر یقین کرکے زکوٰۃ وصدقہ دیدیا۔ بخلاف اس کے کہ دیا محتاج ومستحق ہی کو یا کسی خالص دینی ادارہ، مدرسہ ویتیم خانہ کو مگر نیت خدا کی خوشنودی اور آخرت کی بہبودی کی بجائے کسی حاکم یا حکومت کی خوشی یا خوف تھا۔ یا خدا وآخرت سے قطع نظر کرکے زیادہ سے زیادہ خود اس محتاج اور ادارہ کی محض معاشی ومالی مشکل کا دور کرنا مطلوب تھا تو یہ انفاق اسلامی یا معادی معاشیات کا صحیح انفاق نہ ہوگا کیونکہ اس میں خدا ومعاد کی نیت ہی سرے سے ندارد ہے

ایک انفاق پر کیا موقوف

زندگی کا کوئی عمل بھی خواہ نماز روزہ ہی ہو

دینی اسوقت تک قرار نہیں پا سکتا جبتک خدا ورسول کی رضا وطاعت یا فلاح وآخرت کی نیت سے نہ کیا گیا ہو۔ اسی نیت کا نام اخلاص وللہیت ہے حتیٰ کہ اگر کسی اسلامی حکم وتعلیم کی کوئی بظاہر دنیوی مصلحت خود قرآن وحدیث میں بیان فرمادی گئی ہو تو بھی ایمان واخلاص کی شان کمال یہی ہوگی کہ مومن کی نیت ونظر بالذات اس حکمت ومصلحت پر نہ ہو بلکہ اس پر کہ خدائے حکیم نے اس حکمت وغرض سے یہ حکم دیا ہے، ایمان کی نظر وہی ہے جو ہر حال میں خدا وآخرت پر رہے یہانتک کہ ہم کو اگر کوئی حکم قطعاً بلا کسی ظاہری حکمت ومصلحت کے دیا جاتا تو بھی ہماری بندگی وعبدیت کا حق وفرض بلا چون وچرا اس کی اطاعت ہی ہوتا۔

زباں تازہ کردن زا قرارِ تو ۔۔۔ نینگیختن حکمت از کارِ تو

دین اور بیدینی کا جوہری تضاد

بہرحال معاشی اور غیر معاشی مشاغل و اعمال میں دین اور بیدینی کا جوہری تخالف وتضاد یہی نیت ہے کہ کون کام خدا و آخرت کے ارادہ سے کیا گیا ہے اور کون خالص دنیوی غرض ومصلحت سے ــــــ خدا کی کتاب کے بعد سب سے صحیح کتاب بخاری شریف کی سب سے پہلی متواتر حدیث یہی ہے کہ ہر قسم کے اعمال وافعال کے عنداللہ رد وقبول کا انحصار تمام تر نیت ہی پر ہے ــــ انما الاعمال بالنیات ــــ اور ہر شخص کو صرف وہی ملیگا جو اس نے نیت کی ہوگی ــــ انما لامرئ مانوی۔

صحاح ہی کی ایک روایت میں اس مدعا کی تشریح اس طرح ہے کہ قیامت کے دن پہلے تین شخص پیش ہوں گے ایک حافظ وقاری، جس سے اللہ تعالیٰ سوال فرمائے گا کہ تو نے کلام مجید میں جو سیکھا پڑھا تھا اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ وہ عرض کرے گا کہ دن رات پڑھتا پڑھاتا اور تلاوت کرتا تھا، اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ تو

جھوٹا ہے تیری غرض تو اس سے یہ تھی کہ دنیا میں لوگ تجھ کو قاری و حافظ جانیں اور کہیں سو یہ کہا گیا

دوسرا شخص جو کسی جہاد میں بظاہر شہید ہوا تھا اس سے پوچھا جائے گا کہ تو کس لئے قتل ہوا عرض کرے گا کہ تیری راہ میں جہاد کیا تھا اس میں مارا گیا۔ ارشاد ہوگا تو بھی جھوٹا ہے تُو تو جہاد میں اس لئے شریک ہوا تھا کہ بہادر و مجاہد کہا جائے تو ایسا کہا گیا۔

اسی طرح تیسرے سے جو مالدار تھا دریافت فرمایا جائے گا کہ تجھ کو جو مال و دولت میں نے عطا کیا تھا اس سے کیا کام لیا؟ عرض کرے گا کہ خیر و خیرات کی، عزیزوں کی مدد کی۔ جواب ملیگا کہ تو بھی جھوٹا ہے تیری نیت تو اصل میں یہ تھی کہ تجھ کو فیاض و مخیر کہا جائے چنانچہ کہا گیا۔ بالآخر ان سب کو جہنم رسید کر دیا جائے گا۔

مدعا یہ کہ بظاہر نیک سے نیک عمل بھی اگر خدا و آخرت کی نیت سے نہیں بلکہ محض دنیا کے نام و نمود و شہرت کے لئے کیا گیا ہے تو دنیا میں یہ مطلب پورا ہو گیا۔ خدا و آخرت کی نیت سے جب کیا ہی نہیں کیا گیا تو خدا کی طرف سے آخرت میں اس پر کوئی اجر و ثواب کس منطق سے مل سکتا ہے

خود "اسلام" کی لغوی حقیقت قرآن شریف میں نفس رضا جوئی (ابتغاء رضا) کی کثیر آیات کے علاوہ (مخلصین له الدین) وغیرہ دوسری آیات سے بھی اسی اخلاص کا مطالبہ کیا گیا ہے، خود لفظ اسلام کی لغوی و معنوی حقیقت تمام نفسانی و دنیوی اغراض و مقاصد، منافع و مضار سے قطع نظر کر کے، بالکلیہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی یا رضا و خوشنودی کے حوالہ کر دینے کے ہیں پھر "مسلم" کی صفت جا بجا "حنیف" آتی ہے اور ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کے

دین وملت کی اتباع کا خصوصیت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ
إِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا اور جن کا سب سے نمایاں وصف "حنیف" ہی فرمایا گیا ہے
اس حنیف کے معنیٰ بھی سب سے کٹ کر ایک (خدا) ہی کے ساتھ جڑ جانے یا
اسی کے ہو رہنے کے ہیں۔ یعنی خدا کی رضا وخوشنودی یا حکم کے سامنے نہ خود اپنی
خوشی وخواہش کی پرواہ ہو نہ کسی دوسرے عزیز سے عزیز اور محبوب سے محبوب کی۔ نہ جان
ومال کی کسی بڑی سے بڑی قربانی میں تامل ہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ جیسے
بیٹے کی اور بیٹے نے خود اپنی جان جیسی عزیز ترین متاع کی قربانی وسپردگی جس شان
سے کی تھی وہ اس حنیفیت اور اسلامیت والی سپردگی ہی کا تو کامیاب امتحان
تھا دونوں کی اس بے چون وچرا سپردگی کو عین سپردگی کے موقعہ پر اسلام ہی کے
لفظ سے اس طرح تعبیر فرمایا گیا کہ فَلَمَّآ اَسْلَمَا یعنی جب دونوں کے دونوں نے
اپنے کو اللہ کی مرضی کے سپرد کر دیا۔

لیکن یہاں ہماری گفتگو کا اصل تعلق مال کی قربانی یا انفاق سے ہے۔
حضرت جامع المجددین علیہ الرحمۃ نے اس بحث میں سورہ بقرہ کی جو آیات اپنے وعظ
التحصیل والتسہیل مع التکمیل والتعدیل میں تجدیدی اصلاح وتعدیل کے لئے اختیار
فرمائی ہیں ذیل میں کچھ ان کی ضروری مناسب محل تفصیل اس وعظ اور خود حضرت
ہی کی تفسیر بیان القرآن سے پیش کی جاتی ہے آیات کا تفسیری ترجمہ یہ ہے کہ

جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضا جوئی کی راہوں میں (اور اسی رضا جوئی
کی غرض سے) اپنے نفس میں (انفاقی) پختگی (یا ذہنیت) پیدا کرنے
کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک ایسے باغ کی ہے جو کسی
بلندی پر واقع ہو (جہاں کی آب وہوا زیادہ بارآور ہوتی ہے اور)
اس پر زور کا پانی برسا ہو جس کی بدولت وہ باغ خوب دوگنا چوگنا

پھلا ہو۔ اور اگر زیادہ زور کا پانی اس پر نہ بھی پڑا ہو تو (خود اس زمین کی صلاحیت ایسی ہے کہ) ہلکی سی بارش بھی کام دے جاتی ہے اور تم نے جو کچھ بھی (رضاجوئی یا جس نیت سے بھی) کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے (ویسا ہی بدلہ دے گا)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

اسلامی انفاق کی دو غرضیں

ان آیتوں میں انفاق کی دو غرضیں بیان فرمائی گئی ہیں مقدم غرض تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی یا رضاجوئی ہے اور دوسری اسی رضاجوئی کی عادت کو اپنے نفس میں پختہ و راسخ کرنا۔ یعنی وہی ایسی انفاقی ذہنیت پیدا کرنا کہ جب جو کچھ حسب استطاعت خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا موقع آئے خوشی خوشی خدا کی خوشنودی کی نیت سے خرچ کیا جائے نفس کی تنگی یا طبیعت کا بخل مانع نہ ہو۔ اسی کو حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ

یہاں دو غائتیں مذکور ہیں اول غایت تو ابتغاء مرضات اللہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ اپنا مال اللہ کی رضا طلب کرنے میں خرچ کرتے ہیں اس کے بعد ایک اور غایت بیان فرماتے ہیں وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی دوسری غرض انفاق کی یہ ہے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں...... اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض بخیلوں کو انفاق میں بہت دشواری ہوتی ہے۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ۔۔۔۔۔۔ ور زر طلبی سخن دریں ست (ص ۳۳)

بخیلوں پر کیا موقوف خالص اللہ کی راہ و رضا میں خرچ کرنا سخیوں کے لئے بھی آسان نہیں ہوتا جبتک مجاہدہ سے اس کی عادت یا ذہنیت نہ پیدا کی جائے بہر حال ان آیات میں

"انفاق کی تنگی و دشواری رفع کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم انفاق (جب کرو) اس نیت سے کرو کہ اس سے (اللہ راضی ہوں گے اور) نفس میں (اللہ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کرنے کی) قوت پیدا ہو گی اور (اس طرح) انفاق سہل ہو جائے گا۔

انفاقی مجاہدہ (کیونکہ) بار بار اس نیت سے انفاق کرو گے تو یہ مادہ راسخ ہو جائے گا" (ص ۳۳) مطلب وہی ہوا جس کو اوپر معاشیات انفاق کے باب میں راقم ہٰذا نے انفاقی ذہنیت پیدا کرنے سے تعبیر کیا ہے کیونکہ سارے معاشی مفاسد کی بڑی جڑ انفاق اور نفع رسانی کے بجائے کسب و حصول اور نفع اندوزی کی حرصی ذہنیت ہے عقل کی بات بھی یہی ہے کہ جس معاشرہ کے افراد میں نفع اندوزی کے بجائے نفع رسانی کی عادت یا ذہنیت زیادہ ہو گی اس میں معمولاً و لازماً ہر شخص کو دوسروں سے از خود نفع اس سے زیادہ ہی پہنچ جائے گا۔ جتنا وہ براہ راست نفع اندوزی کی حریصانہ ذہنیت اور ناجائز راہوں سے حاصل کرتا۔ لیکن آج کل معاشیات یا طرح طرح کی معاشی دعوتوں ہی کو سیاست کا سب سے چلتا ہوا نعرہ و حربہ بنا کر حرصی کسب یا نفع بازی کا صور اتنی زور سے پھونکا گیا ہے کہ قدرتہً ہر طرف انفرادی و اجتماعی قومی (بین الاقوامی) نوچ کھسوٹ یا استحصال ہی کا دور دورہ اور گرم بازاری ہے۔

بار بار اس نیت سے خرچ کرنا کہ اس سے نفس میں خرچ کرنے کی قوت و عادت پیدا ہو۔ اس کا مدعا بھی دراصل رضائے الٰہی کا حاصل کرنا ہی ہے اسی کو بیان القرآن میں ان ہی آیتوں کی تفسیر میں اور واضح فرما دیا ہے کہ

حاصل اس نیت کا یہ ہوگا کہ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو اور ایسی عادت ہو جاتے کہ آیندہ ہمیشہ اللہ کی رضا حاصل کیا کریں پس ان دونوں غایتوں (اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ اور۔ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کا حاصل رضائے الٰہی ٹھہری حالاً بھی اور مآلاً بھی۔ خوب سمجھ لو۔

رضائی انفاق کی مثال

اللہ تعالیٰ کی راہ و رضا میں انفاق کی تمثیل اوپر کی جن آیات میں ہے ان سے پہلے کی آیات میں ریائی انفاق کی تمثیل ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے اس ریائی انفاق کے مقابل رضائی انفاق کے معاملہ میں جو اصلاحی تنبیہ و تجدید حضرت مجدد نے فرمائی ہے وہ عمل کے لئے خصوصاً اہم اور یاد رکھنے کی ہے رضائی انفاق کا مطلب ظاہر ہے کہ اخلاصی انفاق ہے یعنی خالص اللہ کی رضا جوئی کے سوا اور کوئی نیت و محرک انفاق میں شریک نہ ہو لیکن ایسا کامل اخلاص بغیر کافی مجاہدہ کے کم از کم ابتدا میں میسر ہونا عملاً ناممکنات سے ہے اس لئے قرآنی تمثیل و تشبیہ کا مطلب ذرا اور ذہن نشین کر لینا ضروری ہے"

"وابل سے مقصود اخلاص کی تشبیہ ہے جس کی دلیل اوپر کی آیات ہیں کیونکہ اوپر ریائی انفاق کی مذمت ہے کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ

الاٰخِرِ ۔ اس کے بعد اخلاص فی الانفاق کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اور جب وَابِلٌ سے مراد اخلاص ہے اور اس کے مقابلہ میں طَلٌّ مذکور ہے ۔ وَابِلٌ کہتے ہیں موسلا دھار بارش کو اور طل کہتے ہیں پھوار کو، تو اس تقابل سے معلوم ہوا کہ وَابِلٌ سے اخلاص کامل مراد ہے اور طل سے اخلاصِ قلیل ۔

حاصل یہ ہوا کہ اگر اخلاص کامل ہو تو نفقات میں ترقی زیادہ ہوگی اور اگر قلیل ہو تو وہ بھی (نفس) ترقی کے لئے کافی ہے۔ گو زیادہ ترقی نہ ہو"

آگے مزید اصلاح و تنبیہ یہ ہے کہ

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اخلاص قلیل بھی مطلوب ہے، بلکہ اس سے وہمیوں کا علاج کیا گیا ہے کیونکہ اگر اخلاص کامل ہی کا مطلوب ہونا ان کے ذہن نشین ہو جائے تو ان سے کوئی عمل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ پہلے ہی دن اخلاص کامل میسر نہیں ہو سکتا" (ص ۳۴)

ریائی انفاق کی مثال

اب ان آیات کو لیجئے جس میں اسس اخلاصی انفاق کے مقابلہ میں ریائی انفاق کی نوعیت کو تشبیہ و تمثیل سے واضح فرمایا گیا ہے ارشاد ہے کہ :۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰی	اے ایمان والو تم احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات (یا احسان) کو برباد مت کرو۔

اسس کے بعد فرمایا۔

كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

جو شخص اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھانے کے لئے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر سو اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر جس پر کچھ مٹی ہو پھر اس پر زور کی بارش پڑے جو اس کو بالکل صاف کر دے ایسے لوگوں کو اپنے ہاتھ کی کمائی ذرا ہاتھ نہ لگے گی اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو رستہ نہیں بتلاتے۔

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خالص نیت کے سوا انفاق کے اور جتنے بھی دواعی و محرکات ہوتے ہیں ان سب کا مطلوب پھیر پھر کر غیر اللہ ہی ہوتا ہے خواہ اپنے نفس کی خوشی و خواہش یا نام و نمود اور عزت و شہرت ہو، خواہ دوسروں کا ڈر، دباؤ یا لحاظ و مروت ہو، اور ظاہر ہے کہ خدا و آخرت پر صحیح ایمان نہ رکھنے والوں ۔ کافروں مشرکوں یا منافقوں ۔ کے انفاق کی نوعیت کم و بیش یہی ہوتی ہے ۔ یہ شان تو خاص خدا و آخرت کو مدنظر رکھنے والوں ہی کی ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کی ذات و خوشنودی کے سوا کسی اور نیت و غرض سے خرچ ہی نہیں کرتے۔ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ

ایک بڑی خرابی و خامی البتہ ایک بڑی خرابی و خامی اکثر خیرات کرنے والوں میں یہ ہوتی ہے کہ کرتے تو وہ خدا کی رضا اور آخرت کے ثواب ہی کی

نیت سے ہیں لیکن جن کے ساتھ وہ یہ سلوک واحسان کرتے ہیں کچھ نہ کچھ زبانی وعملی ممنونیت اور شکر گذاری کی توقع قائم کر لیتے ہیں جس میں اگر ان سے کوتاہی ہوتی ہے تو برا مانتے ہیں اور بہتیرے زبان سے بھی ایسی صورت میں اپنا احسان جتلانے اور یاد دلانے پر اتر آتے ہیں بلکہ ایذا رسانی کے برتاؤ تک سے نہیں چوکتے اور سب کیا کرایا مٹی کر دیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ وہی ہوتی ہے کہ نفس پوری طرح اپنے نفسانی جذبات سے پاک یا اس کا تزکیہ نہیں ہوتا کہ خدا و آخرت کے سوا کسی اور طرف کسی طرح کے اجر و بدل کے لئے نظر اٹھے ہی نہیں۔ اسی لئے خدا کی رضا جوئی۔ یا اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ پر نفس کو پوری طرح جمائے رکھنے کے لئے انفاق کی دوسری غرض تَثْبِيتًا مِنْ اَنْفُسِهِمْ بتلائی تاکہ مَنّ وَاَذٰی کے سے منافی اخلاص افعال و حرکات کا صدور نہ ہو۔ درحقیقت یہ نفس و طبیعت کے طبعی رجحان و تقاضے کے خلاف ہے بڑا مجاہدہ کہ آدمی احسان کر کے اس کو زبان تک پر نہ لائے اور جس پر احسان کیا ہے اس کی محسن کشی کی حرکتوں پر بھی نہ زبان سے اپنا احسان بتلائے اور نہ کسی برتاؤ سے اذیت پہنچائے

اللہ اکبر اس سے اندازہ کیجئے کہ اسلام کی انفاقی معاشیات کے پوری طرح اسلامی ہونے کے لئے نہ صرف یہ شرط ہے کہ عین انفاق کے وقت و موقع پر خدا کی خوشنودی اور آخرت کی بہبودی کے سوا اور کوئی نیت نہ ہو بلکہ بعد کو بھی اس انفاق کو اسلامی یعنی خالص خدا و آخرت کے لئے باقی رکھنے کا تقاضا بھی یہی ہے کہ زبان و عمل یا قال و حال کے کسی عنوان سے اس کو جتلایا تک نہ جائے اللہ اکبر! خالص لوجہ اللہ اور معادی انفاق کی اس روح سے آج کل کے اس خالص لغیر اللہ اور بے روح معاشی انفاق کو دور کا بھی کوئی واسطہ ہے جس سے

اسلامی معاشیات پر خامہ فرسائی کرنے والے بالعموم مقابلہ وموازنہ فرماتے ہیں

انفاق کی شرط صحت و شرط بقاء

آگے آیاتِ بالا کے یہ تفسیری فوائد وحقائق ذرا خود مفسر تھانوی کی تفسیر، بیان القرآن ۔ سے پڑھ لیں

طاعات کی صحت وبقاء کے لئے جس طرح ایمان شرط ہے حتیٰ کہ کافر کی کوئی طاعت صحیح ومقبول نہیں ۔ اور اگر طاعت کے بعد کافر ہو جائے تو وہ طاعت باقی نہیں رہتی اس کو اصطلاح شرع میں حبط کہتے ہیں اسی طرح نصوص سے ثابت ہے کہ علاوہ ایمان کے اور بھی بعض شرطیں صحت وبقاء کی بعض طاعات میں ہوتی ہیں جیسے نماز کے لئے وضو شرط ہے

پس یہاں بھی اس آیت اور آیت سابقہ میں لَا یُتْبِعُوْنَ کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق کے لئے ایمان کے ساتھ کہ شرط صحت نیز شرط بقاء ہے اخلاص بھی ایک شرطِ صحت اور ترک منّ واذیٰ شرطِ بقاء ہے اس لئے منافق ورائی (ریاکار) کے انفاق کو باطل کہا گیا کہ اس میں شرط صحت ہی مفقود ہے اور منّ واذیٰ کو بھی مبطل (باطل کرنے والا) کہا گیا کہ اس میں شرطِ بقاء مفقود ہے ”

دیکھا آپ نے کہ جس طرح کافرانہ معاشیات کا انفاق بظاہر انفاق ہونے پر بھی اسلامی معاشیات کی نظر میں باطل اور غیر صحیح یا سرے سے انفاق ہی نہیں اسی طرح مسلمانوں اور اسلامی معاشیات والوں کو اس سے بھی ہوشیار رہنا چاہئے کہ اسلامی انفاق انفاقِ اسلامی ہو کر بھی بعد کو منّ واذیٰ سے صحیح معنیٰ میں اسلامی باقی نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ اس منّ واذیٰ کو صدقات وخیرات کا اسی طرح باطل کرنے والا ٹھہرایا گیا جس طرح ریاکار یا منافق وکافر کا انفاق عین اپنی ذات ہی میں باطل ہوتا ہے آگے اس تشبیہ کی

وجہ ولطف کو بھی سن لیں

چونکہ بطلانِ ثانی (یعنی منافق اور ریاکار کے انفاق کا باطل ہونا) زیادہ ظاہر ہے (جیسا کہ مشبہ بہ کو ہونا چاہئے) بطلانِ اول (منّ واذیٰ والے بطلان) سے اس لئے ثانی کو اول سے تشبیہ دی گئی اور مشبہ بہ میں جو دو قیدیں لگائی گئی ہیں ایک انفاق کی اور دوسری ریا کی یہ محض مشبہ کی تقویت (یعنی اس کو زوردار بنانے) کے لئے، ورنہ ہر دو امور (انفاق اور ریاء بجائے خود) فرداً فرداً بھی موجب بطلان ہیں اور تقویت سے یہ فائدہ ہوا کہ منّ واذیٰ سے نفرت دلانے میں مبالغہ ہو گیا۔" (بیان القرآن)

غیر ایمانی انفاق کی مثال

خلاصہ یہ کہ خدا و آخرت پر ایمان سے خالی غیر اسلامی معاشیات یا معاشی نظامات کے تحت انفاق کی مثال اسلامی معاشیات کی نظر میں خود اسلام کی کتاب قرآن مجید کی رو سے بالکل ایسی ہے۔

جیسے ایک چکنا پتھر جس پر کچھ مٹی آگئی ہو (اور اس میں کچھ گھاس پھوس جم آتا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے سو اس کو (جیسا تھا ویسا ہی کا ویسا) بالکل صاف کر دے۔ اسی طرح منافق یا کافر کے ہاتھ سے بظاہر اللہ تعالیٰ کی راہ میں اگر کچھ خرچ ہو گیا جو ظاہر میں ایک نیک عمل معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے نفاق نے اس کو ویسا ہی کورا کا کورا ثواب سے چھوڑ دیا چنانچہ آخرت میں (ایسے انفاق کرنے والے) لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی۔" (بیان القرآن)

بس زیادہ سے زیادہ دنیا میں اس انفاق والوں نے نام و نمود وغیرہ کے جو ریائی یا منافقانہ و کافرانہ مقاصد مدنظر رکھے ہیں وہ کچھ ہاتھ لگ جائیں گے ورنہ ایسا ریائی

انفاق صحیح و مستحق حاجتمندوں تک کم ہی پہنچتا ہے جس سے ان کی حقیقی معاشی دشواریاں دور ہوں۔ اکثر اس طرح کے ریائی لادینی انفاق والوں کو دیکھا جاتا ہے کہ اسپتالوں اسکولوں وغیرہ کے لئے تو بڑے بڑے چندے دیدیتے ہیں لیکن اپنے عزیزوں دوستوں، جان پہچان اور پاس پڑوس والوں کو فقر وفاقہ کی زندگی گذارتے بے حسی کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں

انفاق کے بعض تکمیلی لوازم اسلامی معاشیات کے ایمانی ورضائی انفاق کی بنیادی نوعیت وخصوصیت ذہن نشین ہو جانے کے بعد اب اس کی بعض اہم تکمیلی لوازم کی تفصیل پر انشاء اللہ اس بحث وباب کو ختم کر دینا ہے انفاق کی نوعی حقیقت اصل میں ایثار وقربانی ہے یعنی دوسروں کی خوشی وخواہش پر اپنی خوشی و خواہش کو قربان کرنا اور اس کو ترجیح نہ دینا۔ بالفاظ دیگر اپنی حاجت وضرورت یا رغبت دلپسند کی چیز دوسرے کو دیدینا اس میں صرف روپیہ پیسہ یا مال وزر ہی داخل نہیں۔ البتہ چونکہ روپیہ پیسہ سے کم وبیش سب ہی مادی ضرورتیں خریدی اور خواہشیں پوری کی جاسکتی ہیں اس لئے انفاق یا خرچ کرنے سے بالعموم روپیہ پیسہ ہی خرچ کرنا مراد لیا جاتا ہے اور یہ دوسروں کو دینا کسی ایثار وقربانی کی روح کے بغیر آسان نہیں ہوتا اس کی محبت کے مقابلہ میں بعضوں کو جان تک دینا سہل ہوتا ہے

گرجاں طلبی مضائقہ نیست   گرزر طلبی سخن دریں ست

انفاق کے وسیع معنیٰ اور اہم شرائط ورنہ نفس انفاق وسیع معنی میں جان ومال، وقت وقوت، جاہ وعزت، اپنی ضرورت ورغبت کی سب ہی چیزوں کو دوسروں کے لئے خرچ یا قربان کرنے کو شامل ہے اس توسیع وتعمیم کے ساتھ ایثار

و انفاق کا دوسرا لازمہ اس چیز کا کسی نہ کسی درجہ میں محبوب و مرغوب ہونا ہے جو ہم خود اپنی محبت و رغبت کو قربان کر کے دوسرے کو دیتے یا اس پر خرچ کرتے ہیں جب تک انفاق و ایثار کے وسیع مفہوم میں اس محبت و رغبت کو بھی شریک نہ کیا جائے نہ کیفاً انفاق کمال حاصل ہوتا ہے نہ کما حقہ، حکماً اس کے ہمہ گیر مقاصد پورے ہوں گے معاشیاتِ انفاق کے ان دونوں اسلامی لوازم و مطالبات کو کتاب اسلام کے ایجاز و اعجاز نے ایک ہی آیت میں اس طرح جمع فرما دیا ہے کہ "تم پوری پوری بھلائی یا دنیا و آخرت دونوں کی کامل خیر و فلاح اس وقت تک ہرگز نہ پا سکو گے جبتک ایسی چیزوں میں سے نہ خرچ کرتے رہو جو تم کو محبوب و مرغوب ہیں۔
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ہ اس آیت میں انفاق کے ساتھ مال کی قید و شرط نہ لگا کر جاہ و مال، وقت و قوت وغیرہ جو شئی بھی ہماری محبت و رغبت کی ہو سب ہی کے انفاق و ایثار کو عام قرار دیا گیا ہے جس میں آدمی کے کام آنے والی مالی و غیر مالی تمام چیزوں کا انفاق داخل ہو گیا۔

دوسری طرف انفاق کی ان چیزوں کا خود انفاق کرنے والے کی نظر میں محبوب و پسندیدہ ہونا بھی ضروری قرار دیا گیا۔

انفاق کی ان شرائط کے نتائج

انفاق میں ان دونوں شرطوں کے جمع ہو جانے سے نہ صرف انفاق کی ساری خوبیاں اور کمالات اس میں جمع ہو جاتے ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی ہر طرح کی بھلائیوں یا خیر و صلاح کا دامن بڑی حد تک جان و مال ہر طرح کی محبوب چیزوں کے کسی معاشرہ میں انفاق کی عام عادت و ذہنیت ہی سے بندھا ہوا ہے اور ہر طرح کی برائیوں یا شر و فساد کی بڑی جڑ کسی معاشرہ میں ان ہی دونوں شرطوں کے جامع انفاق کا فقدان ہوتا ہے کہ لوگ عام ضرورت

کی چیزوں خصوصاً محبوب و پسندیدہ چیزوں سے دوسروں کی حاجت روائی کرنا ان کو دینا تو الگ رہا، الٹے ان سے چھین جھپٹ، نوچ کھسوٹ یا استحصال ہی کی فکر و تدبیر میں زیادہ لگے رہتے ہیں۔ لادینی معاشیات و سیاسیات کی اسی غیر انفاقی ذہنیت یا کسبی حرص نے تمام دنیا کو انفرادی و اجتماعی فتنہ و فساد سے بھر دیا ہے قرآن مجید کی اوپر والی ایک ہی آیت نے اس شر و فساد کا قلع قمع فرما کر خیر و فلاح کو تمام و کمال جمع فرما دیا ہے مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ نے "البر" کا ترجمہ "خیر کامل" فرمایا ہے جس میں کماً و کیفاً دنیا و آخرت دونوں کی پوری پوری بھلائی آجاتی ہے۔ لغت کی رو سے بھی "بر" کے مفہوم و معنیٰ میں نہ صرف صداقت و دوستی، اطاعت و فرمانبرداری تک کی نیکیاں داخل ہیں بلکہ وسعت یعنی نیکی کے کاموں میں توسع اور پھیلاؤ کا تصور بھی شریک ہے ؎ اور جس سوسائٹی یا معاشرہ میں ہر طرح کی محبوب چیزوں کے انفاق یا ایک دوسرے پر خرچ کرنے کی جتنی زیادہ وسعت اور عام عادت ہوگی لازماً اتنی ہی زیادہ اس میں ہر طرح کی خیر و فلاح کو عموم یا پھیلاؤ بھی حاصل ہوگا۔

نیکی کی روح

لیکن نیکی و خیر کے لادینی تصورات کے خلاف "بر" کے دینی تصور کی حقیقت و ماہیت یا اصل روح دین یا خدا و آخرت پر ایمان ہے جس کے بغیر دین و مذہب کے ظاہری رسوم و شعائر کا بھی دین میں کوئی اعتبار نہیں۔ لہذا جو خیر و خیرات یا انفاق اس روح سے خالی ہو وہ اسلامی معاشیات کا انفاق قطعاً نہ ہوگا۔ بر کی اسی ایمانی و اسلامی یا باطنی روح کو سورہ بقرہ ہی میں دوسری جگہ دہرایا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ بر یہ (یعنی اس طرح کے ظاہری رسوم

قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَفِي الرِّقَابِ

و افعال کا نام) نہیں (کہ مثلاً) تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ بڑی (کی جان) یہ ہے کہ آدمی خدا و آخرت فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے (اور اس ایمان کی قوت سے) مال کی محبت کے باوجود عزیزوں، یتیموں غریبوں، مسافروں، سائلوں (کی حاجت روائی) اور غلاموں کی گردن چھڑانے (یعنی ان کو آزاد کرانے) میں مالی مدد کرے

تقویٰ کی بنیاد

زمانہ جاہلیت میں حج کے سلسلہ میں ایک رسم و عادت یہ بھی کہ احرام کی حالت میں لوگ اپنے گھر کے صدر دروازہ سے نہ نکلتے بلکہ پشت کی طرف سے نکلتے تھے، آگے رکوع میں اس رسم و لزوم کی مثال دے کر متنبہ فرمایا کہ یہ بھی

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

کوئی بِر (یا نیکی کی بات) نہیں کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ۔ بِر (تو اصل میں) یہ ہے کہ آدمی تقویٰ کی زندگی اختیار کرے۔ باقی گھروں میں ان کے معمولی دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو (یہی تقویٰ کی جڑ ہے) تاکہ فلاح پاؤ۔

تقویٰ کی زندگی اور اس کی حقیقت خود اس آیت سے معلوم ہو گئی کہ وہ نام ہے خدا سے ڈرنے یعنی زندگی کے سارے اعمال و احوال میں خدا کی رضا

خوشنودی یا اطاعت و فرمانبرداری کو پیش نظر رکھنے کا

غرض آل عمران کی پیش نظر آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں جس برِّ کامل کے حصول کو مرغوب و محبوب چیزوں کے انفاق پر موقوف و منحصر ٹھہرایا گیا ہے اس میں یہی دو باتیں یہاں خصوصیت سے لائق توجہ ہیں ایک تو اس انفاق کی تعمیم ۔ یعنی اس سے مراد صرف مالی انفاق ہی نہیں بلکہ مال وجاہ، وقت وقوت وغیرہ جس چیز سے بھی آدمی دوسرے کو کسی طرح کا نفع پہنچا سکے، دوسرے نفع رسانی یا انفاق کی ان چیزوں کا خود انفاق کرنے والے کی نگاہ میں محبوب و مرغوب یا قابل قدر ہونا حضرت مجددؒ نے اس آیت کے تحت ان دونوں پر دو مستقل بیانوں (۱) افناء محبوب اور (۲) انفاق محبوب کے سلسلہ میں گفتگو فرمائی ہے

تفسیر قرآن میں حضرت مجدد کی انتہائی احتیاط

عرفاً و معمولاً انفاق سے چونکہ مال ہی کا خرچ کرنا سمجھا جاتا ہے اور حضرت کو علم و عمل دونوں میں احتیاط و تقوی کا بے انتہا اہتمام تھا۔ خصوصاً تفسیر میں جبتک سلف یا اکابر کا کوئی قول نہ مل جاتا تفرد سے کام نہ لیتے نہ خالی اپنی رائے پر وثوق و اعتماد فرماتے

> اور یہی میں علماء و طلباء کو نصیحت کرتا رہتا ہوں کہ تفسیر قرآن کے متعلق جب کوئی بات ان کی سمجھ میں آیا کرے تو جبتک سلف کا کلام اس کی تائید میں نہ مل جاتے اس وقت تک اس پر اعتماد نہ کیا کریں کیونکہ تفسیر بالرائے بہت سخت ہے (افناء محبوب ص۱۵)

انفاق کی تعمیم عرف عام میں یا

بظاہر لفظ انفاق خاص ہے انفاق مال کے

ساتھ، مگر میرے دل میں ایک بار یہ خیال آیا تھا کہ یہ عام ہے انفاق
مال وبذل (خرچ) نفس وبذلِ جاہ وبذلِ علم وغیرہ سب کو"
آگے ارشاد ہے کہ
اس کے ساتھ ہی علامہ قسطلانی کا یہ قول نظر سے گذرا کہ انفاقِ
محبوب میں بذل جاہ وبذل نفس وبذلِ علم بھی داخل ہے اس سے
میرا دل بہت خوش ہوا۔ لیکن اگر لغت سے اس کی تائید نہ ہو اور
انفاق ان سب کو عام نہ ہو تو علامہ قسطلانی پر پھر بھی اعتراض نہیں
ہو سکتا۔ کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے عموم لفظ کی وجہ سے
بذلِ نفس وبذلِ جاہ وبذل علم کو اس آیت میں نہیں داخل کیا
بلکہ دلالۃ النص کی وجہ سے داخل کیا ہے کیونکہ مال بمقابلہ جاہ
ونفس وعلم کے ادون (ادنیٰ درجہ کی چیز) ہے تو جب انفاقِ
مال پر کامل بر حاصل ہوتی ہے جو ادنیٰ ہے تو بذل اعلیٰ سے بدرجۂ
کامل حاصل ہوگی (ص ۱۴)
اس سے بڑھ کر یہ کہ
اسی بناء پر بیضاوی رحؒ نے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کی تفسیر
میں بعض صوفیاء کا قول نقل فرمایا ہے وَمِنْ اَنْوَارِ الْمَعْرِفَةِ
يُفِيْضُوْنَ کہ انہوں نے افاضۂ انوار ومعرفت کو بھی انفاق میں
داخل کیا ہے کیونکہ یہ انفاقِ مال سے اعلیٰ ہے تو جب ادنیٰ کا
انفاق محمود ہے اعلیٰ کا انفاق کیوں نہ محمود ہوگا۔ غرض بیضاوی و
قسطلانی کا قول دیکھ کر مجھے تعمیم انفاق کی ہمت ہوئی ورنہ اس سے
پہلے اس خیال کے اظہار کی جرأت نہ ہوتی تھی (ص ۱۵ افناء المحبوب)

امر بالمعروف بھی انفاق ہے انفاق کی اس تعمیم و توسیع کے بعد
ظاہر ہے کہ اس میں مال کے ساتھ نہ صرف جاہ اور علم کا انفاق داخل ہو جاتا ہے بلکہ
وقت و قوت وغیرہ تمام ایسی چیزوں کو انفاقِ مال پر قیاس کیا جا سکتا ہے جس سے
دوسروں کو کسی قسم کا نفع پہنچے، اسی بناء پر حضرت مجدد کی تجدیدی توسیع نے امر
بالمعروف کو کہ وہ بھی انفاقی علم ہے اور دعا تک کو داخل فرما دیا ہے کہ اس سے
بھی دوسروں کو نفع پہنچتا ہے لیکن ہم نے عام طور سے بہت سے بہت بس
روزہ نماز کو اسلام سمجھ رکھا ہے جو شیطان کا بڑا دھوکہ اور نفس کا سب سے بڑا مرض
ہے کہ اس طرح آدمی لوگوں میں دیندار آسانی سے مشہور ہو جاتا ہے، "انفاق محبوب"
میں نفس و شیطان کے اس فریب کی پردہ دری اس طرح فرمائی گئی ہے کہ

> یہ بھی ایک بڑا مرض ہے کہ عبادات و مجاہدات میں بھی انہیں کو اختیار
> کرتے ہیں جن سے شہرت ہو، چنانچہ نماز روزہ اور ذکر و شغل بہت
> لوگ کرتے ہیں مگر جن عبادات میں شہرت نہ ہو، جیسے نگاہ کا روکنا
> دل کو شہوت سے بچانا، ایسے کام بہت کم لوگ کرتے ہیں کیونکہ ان سے
> شہرت نہیں ہوتی۔
>
> اسی طرح ایک خاص عبادت و مجاہدہ ہے جس کو ہم نے چھوڑ
> رکھا ہے جو کہ ایک شہوت کا علاج ہے اور وہ طاعت انفاق
> ہے بہت لوگوں کے کچھ معمولات نماز روزہ اور ذکر و تلاوت وغیرہ
> کے مقرر ہیں مگر طاعتِ انفاق کا کوئی معمول نہیں (ص ۱)

کہ مثلاً اپنی آمدنی کا کوئی خاص حصہ خیر و خیرات کرنے کا معمول بنا رکھا ہو [1]

---

[1] خود حضرت علیہ الرحمۃ کا معمول یہ تھا کہ اپنی آمدنی کا پورا چوتھائی حصہ کارِ خیر کے لئے نکال دیتے تھے۔

بعضے مال کی حد تک بھی انفاق کا کچھ معمول یا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اور کسی طرح کی خدمت یا نفع رسانی کو انفاق میں نہیں شمار کرتے خصوصًا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علمی انفاق کا تو علمار تک میں شاذ و نادر ہی اب کسی کو اہتمام ہوتا ہے باقی عام طور پر اپنوں پرایوں، عزیزوں، دوستوں، پاس پڑوس والوں کو دینی کوتاہیوں نماز روزہ تک کے معاملات میں دوسروں کی کچھ کہنا، سننا سمجھانا بجھانا یا اپنے اثر اور دباؤ سے کام لے کر روک ٹوک کرنا تو گویا سرے سے دینی و اسلامی فرائض کا کوئی جزء یا خیر خواہی و نفع رسانی کا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔

ساری دنیا کی ہلاکت و بربادی کا بڑا سبب

حالانکہ کتاب و سنت دونوں کی منصوص و صریح تعلیمات سے صاف و صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عمومی و قومی صلاح و اصلاح کا دار و مدار بڑی حد تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائی پر ہے مسلمانوں کے بہ حیثیت قوم و امت و بہترین امت ہونے کی بڑی امتیازی علامت و خصوصیت یہی بتائی گئی ہے کہ

"تم بہترین امت (قوم) ہو جو (اپنے پرائے مسلمان اور غیر مسلمان کی تمیز و تفریق کے بغیر) سارے انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہو کہ تم ان کو معروف (یا بھلائی) کا حکم کرتے اور منکر (یا برائی) سے روکتے ہو۔ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ حدیث میں اس فریضہ کی عمومی و اجتماعی یا معاشرتی و سماجی اہمیت کے لئے ایسا سخت تاکیدی و تہدیدی عنوان اختیار فرمایا گیا ہے کہ راقم حروف تو جب پڑھتا ہے کانپ

اٹھتا ہے اور یقین کرنا پڑتا ہے کہ صرف مسلمانوں ہی کی نہیں ساری دنیا کی ہلاکت
و تباہی کا بڑا سبب ہم مسلمانوں کی اس سب سے کارگر اصلاحی فریضہ سے غفلت ہے
قسم کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم معروف
کا امر اور منکر کی نہی ضرور ضرور کرتے رہنا ورنہ جلد ہی اللہ تعالیٰ تم
پر اپنا عذاب بھیج کر رہیگا پھر تم خُدا کو پکارو گے اور وہ تمہاری
سنے گا بھی نہیں۔

دوسری روایت میں حضورؐ ہی کا ارشاد ہے کہ

بنی اسرائیل میں سب سے پہلے یہی خرابی پیدا ہوئی کہ ایک آدمی دوسرے
سے ملتا (اور اس کو کسی برائی میں مبتلا پاتا تو کہتا کہ) اے خدا سے
ڈر یہ تو کیا کر رہا ہے ایسا کرنا جائز یا حلال نہیں، پھر دوسرے دن
اگر اس سے ملنا ہوتا اور بدستور اسی حال پر (یا اسی بُرائی میں مبتلا)
پاتا تو اتنا بھی نہ ہوتا کہ اس کے ساتھ کھانے پینے سے باز رہتا
جب نوبت یہاں تک پہنچی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں کی بیمار
ایک دوسرے پر پڑی (یعنی جماعتی حیثیت سے سب ایک ہی طرح
کے بدکار ہو گئے)

اس کے بعد آپؐ نے سورۃ مائدہ کی آیات لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ
اِسْرَآئِیْلَ سے اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ تک پڑھ کر فرمایا [1]

---

[1] یعنی بنی اسرائیل پر خدا کی لعنت کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو
برائیوں یا منکرات سے روکتے نہ تھے

خوب یاد رکھو! اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بھلائی (معروف) کا
حکم اور برائی (منکر) کی ممانعت (آپس میں ایک دوسرے کو)
ضرور ضرور کرتے رہو اور ظالم (کو ظلم کرتے دیکھو تو اس) کا ہاتھ
(جہاں تک ہو سکے) ضرور پکڑ لو اور اس کو ظلم سے روک کر حق کی
طرف پھیر کر اس کا پابند کر دو، ورنہ تمہارے دلوں کو بھی اللہ تعالیٰ
ایک دوسرے پر مار دیگا (یعنی سب ہی کے دلوں میں ظلم و جور،
معاصی و منکرات کے ارتکاب کی یکساں قساوت پیدا کر دے گا)
پھر تم کو بھی اسی طرح لعنت زدہ یا راندۂ درگاہ کر دے گا جس طرح
بنی اسرائیل کو کر دیا۔

اور حدیث ہی کا یہ عام حکم تو معلوم و مشہور ہی ہے کہ، جو شخص بھی تم میں سے
کسی برائی کو دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے مٹا دے (یعنی جہاں تک اپنی طاقت
سے کام لے کر روک سکتا ہو روک دے) اگر اتنی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے
روکے اگر زبان سے بھی (کسی عذر کے باعث) نہ روک سکے تو (کم از کم)
دل سے برا جانے (کہ اس میں کسی طرح کی شرکت و اعانت یا ہمت افزائی
نہ کرے) اور یہ ایمان کا سب سے کمزور (بالکل آخری) درجہ ہے یعنی اتنا بھی نہ
ہو سکے تو ایمان ہی کی سلامتی و خیر نہ جانئے [۱]

امر بالمعروف معاشی مشکلات کا بھی بڑا حل ہے آج اگر مسلمانوں
کے معاشرہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایسا تاکیدی حکم انفاق یا رواج

---

[۱] یہ سب روایات صحاح کی ہیں جو ریاض الصالحین سے منقول ہیں ۱۲

ہاتھ اور زبان سے نہ سہی قلب ہی کے درجہ میں بھی اتنا جاری ہوتا کہ لوگ معاصی و منکرات میں کم از کم معاشرت ہی سے اپنی قلبی بیزاری و ناگواری کو ظاہر کر دیا کرتے تو ڈھیٹ سے ڈھیٹ یا بے حیا سے بے حیا آدمی کے لئے بھی یہ دشوار ہی ہوتا ہے کہ وہ علانیہ کسی ایسی برائی میں مبتلا ہو جس کو گھر باہر اعزہ و احباء یا سوسائٹی ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھتی ہو ایسے معاشرہ میں بلا کسی قانونی یا حکومتی سزا و خوف کے بھی برائیوں کا پھلنا پھولنا دشوار ہی ہوگا۔

پھر سوچیئے کہ اس کی بدولت خود مالی و معاشی برائیاں اور خرابیاں کتنی دور ہو جا سکتی ہیں ہر طبقہ و درجہ کے مسلمانوں کا کتنا روپیہ پیسہ ان کی کھلی ہوئی عیاشیوں بدکاریوں اور گناہوں کے علاوہ طرح طرح کی نام و نمود کی عادتوں اور رسم و رواج کی فضول خرچیوں کی نذر ہو جاتا ہے یہ اگر بچ بچا کر اسلام کی صحیح انفاقی تعلیمات کے مصارف میں صرف ہو تو مسلمان معاشرہ میں کوئی فرد بھی ننگا بھوکا رہ سکتا ہے؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ معروف و منکر کے امر و نہی کا انفاق خود مال کے انفاق کو ایسے صحیح راستہ پر ڈال سکتا ہے جس سے بہت سی معاشی مشکلات و مسائل کا حل از خود نکل آتا ہے،،

اس لئے مجدد وقت حکیم الامت نے انفاق مال کی طرح امر بالمعروف کو بھی انفاق کی ایک فرد قرار دے کر دراصل معاشی خرابیوں کی بھی بالواسطہ ایک بڑی مجددانہ و حکیمانہ اصلاح فرما دی ہے فرماتے ہیں کہ انفاقِ مال ہی کی طرح

انفاق کی ایک خاص فرد کو کہ امر بالمعروف ہے ...... لوگوں نے بالکل چھوڑ دیا ہے اس کے متعلق بھی کسی نے کچھ معمول مقرر نہیں کیا بلکہ لوگوں نے تو اس کے متعلق یہ سبق یاد کر لیا ہے کہ علیکم بدین خود

وموسٰی بدین خود، حالانکہ یہ مثل خود ہی غلط ہے کیونکہ اس سے تو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے دین کا الگ الگ ہونا اور باہم تفرق فی الدین ہونا لازم آتا ہے حالانکہ خود آیت قرآن سے دونوں کا ایک ہونا اور دونوں میں باہم افتراق نہ ہونا منصوص ہے شَرَعَ لکم من الدین ما وصّٰی بہ نُوحًا وَّالَّذِیٓ اَوْحَیْنَآ الیک وَمَا وصینا بہ ابراھیم وموسٰی وعیسٰی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ ۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب انبیاء علیہم السلام کو ایک ہی دین قائم کرنے کا حکم ہوا تھا۔ (ص۱۳۱)

جاہلوں کا ذکر نہیں انہوں نے نوع طرح کے عامیانہ فلسفے گڑھ رکھے ہیں، مثلاً یار کی یاری سے مطلب یار کے فعلوں سے کیا مطلب،، تم بڑے بڑے عالموں تک "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" کا پرچار بے تکلف خود قرآن و حدیث کی دلیلوں اور شہادتوں سے کرتے دیکھا سنا ہے کھلے کھلے معاصی و منکرات سے چشم پوشی کو عین حکمت و دانائی جانا اور بتلایا جاتا ہے بلکہ الٹے فاسقوں فاجروں کی تکریم و تعظیم کا سبق پڑھایا جاتا ہے اس کے بعد معروف و منکر کے امر و نہی کو مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ کے اس انفاق میں داخل کرنے کا سوال ہی کیا رہ جاتا ہے جس کو ذٰلِکَ الْکِتٰبُ سے ہدایت یابی کی نماز کے بعد ہی دوسری شرط قرار دیا گیا ہے وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۵

حکم انفاق کی وسعت میں دعا تک داخل لیکن مجدد تھانوی نے حکم انفاق کی اس وسعت میں امر بالمعروف سے بھی بڑھ کر دعا تک کو شریک فرما دیا ہے اور کیوں نہ فرما دیتے جب کہ انفاق کی اصل روح نفع رسانی ہے تو نفع و ضرر کا جو حقیقی مالک ہے خود اس کی بارگاہ میں عرض و التجا سے بڑا اور کیا کام نفع رسانی کا ہو سکتا ہے لہذا جن کے پاس مال و علم وغیرہ کچھ اور انفاق کے نہیں۔

وہ دعا سے نفع پہنچائیں پس یہ کام یعنی دعا تو سب کے کرنے کا ہے یعنی اہل مال و اہل علم بھی دعا سے غافل نہ ہوں سب ہی کو مسلمان کے لئے دعا کرنا چاہئے اس میں بھی مسلمانوں کو بہت نفع ہوتا ہے بشرطیکہ دل سے دعا کی جائے یہ سب اقسام ہیں نفع کے جو انفاق کے افراد ہیں بعض حقیقۃً بعض حکماً۔ (ص ۲۷)

خود حدیث سے انفاق کی انتہائی تعمیم و توسیع مطلب وہی کہ انفاق کی جوہری حقیقت چونکہ دوسرے کو نفع پہونچانا ہے اس لئے جس چیز سے اور جس طرح بھی کسی کو نفع پہونچایا جا سکے وہ انفاق کے حکم میں داخل ہے اور حکیم الامۃ علیہ الرحمۃ نے انفاق کے حکم کی جو اتنی توسیع فرمائی ہے یہ خود نبی الامت علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ کی فرمائی ہوئی تعلیم کی تجدید کے سوا کچھ نہیں۔ ایک متفق علیہ حدیث میں تو یہاں تک توسیع فرما دی گئی ہے کہ ہر نیک کام صدقہ ہے کل معروف صدقۃ اور خود

نیکی کے مفہوم میں اتنی وسعت کہ اگر تم کسی سے خندہ پیشانی سے ملو تو اس کو بھی چھوٹی اور حقیر نہ جانو لا تحقرن من المعروف شیئا ولو ان تلقی اخاک بوجه طلق

مقصود اسلام کا اس سب سے معاشرہ کے ہر فرد میں وہی نفع رسانی کی عادت پیدا کرنا ہے جس کو اوپر معاشیات انفاق کے باب میں انفاقی ذہنیت سے تعبیر کیا گیا ہے اسی معنی میں ایک اور متفق علیہ حدیث میں بلا استثناء ہر امیر و غریب مستطیع و غیر مستطیع مسلمان پر صدقہ کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ علی کل مسلم صدقة۔ اس سے قدرۃً سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر کسی کے پاس روپیہ پیسہ سرے سے نہ ہو تو کیا کرے کہاں سے صدقہ دے حضرات صحابہ رضؓ کو یہی اشکال ہوا۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو تو وہ

فلیعمل بیده ینفع نفسه ویتصدق قالوا فان لم یستطع ولم یفعل قال فیعین ذا الحاجة الملهوفة قالوا فان لم یفعله قال فیا مر بالخیر قالوا فان لم یفعل قال فیمسك عن الشر فانه له صدقة۔

اپنے ہاتھ سے کام کرے اور اس طرح جو ملے اس سے خود منتفع ہو اور صدقہ بھی کرے عرض کیا کہ کوئی اس قابل بھی نہ ہو کہ اپنے ہاتھ سے کام کرکے کچھ کما سکے فرمایا تو کسی حاجت مند ستم رسیدہ کی کسی اور طرح مدد کرے عرض کیا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے فرمایا کسی بھلائی یا نیکی کا حکم ہی کر دے (یعنی امر بالمعروف)

حدیہ کہ جب صحابہ رضؓ نے اس پر بھی عرض کیا کہ اگر کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکے تو فرمایا کہ کم از کم دوسروں کو اپنی ذات سے کوئی گزند یا ضرر پہنچانے ہی سے بچے تو اس

کے حق میں یہی صدقہ ہو جائے گا۔ فیمسک عن الشر فانہ لہ صدقۃ
ایک اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں بڑے عجیب عنوان سے انفاق یا صدقہ
کی تعمیم وتاکید اس طرح فرمائی گئی کہ آدمی کے جسم میں سیکڑوں جوڑ بند ہیں ان
میں سے ہر ایک کی طرف سے ہر طلوع آفتاب کے دن (یعنی ہر روز صدقہ کرنا واجب ہے
کل سلامی من الناس علیہ صدقۃ کل یوم یطلع فیہ الشمس

مسلمان کی پوری زندگی انفاق ہی انفاق

جس کی صورت ہی کیا
ہو سکتی ہے سوا اس کے کہ روزانہ زندگی کے تمام چھوٹے بڑے اعمال وافعال
کو صدقہ یا انفاق قرار دیدیا جائے، یعنی مسلمان کی پوری زندگی سے اسلام کا
مطالبہ ہے کہ وہ دوسروں کے حق میں انفاق ہی انفاق یا سراپا نفع رسانی بن جائے
ارشاد ہے کہ کسی معاملہ یا جھگڑے میں

یعدل بین الاثنین صدقۃ	دو شخصوں کے درمیان انصاف کر دینا
ویعین الرجل علی دابتہ	یہ بھی صدقہ ہے کسی کو سواری پر سوار
فیحمل علیھا ویرفع علیھا	کرانے یا اس کا سامان رکھوانے میں
متاعہ صدقۃ وکل خطوۃ	مدد دینا بھی صدقہ ہے نماز کے لئے
یخطوھا الی الصلوٰۃ صدقۃ	جو قدم اٹھتا ہے ہر قدم صدقہ ہے
ویمیط الاذی من الطریق	راستے سے کوئی کانٹا پتھر گندگی وغیرہ
صدقۃ۔ (متفق علیہ)	ایسی چیز دور کرنا جس سے راہ گیر کو تکلیف
	ہو یہ بھی صدقہ ہے۔

بواسطہ و بلا ارادہ نفع رسانی بھی انفاق ہے

حضرت انسؓ کی ایک

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود براہ راست کسی کو کچھ دینے یا نفع پہنچانے کے بغیر بواسطہ یا بلا ارادہ ہماری ذات یا مال سے کسی انسان کیا حیوان کو بھی اگر نفع پہنچ جائے تو وہ بھی رحمت حق سے صدقہ ہی میں شمار ہو جاتا ہے، مثلاً کسی مسلمان کے لگائے ہوئے درخت یا کھیت سے کوئی آدمی یا جانور یا چرند و پرند کچھ کھالے تو وہ بھی اس کی طرف سے صدقہ ہو جائے گا ما من مسلم یغرس غرسًا اویزرع زرعًا فیاکل منه انسان اوطیر اوبهیمة الا کانت له صدقة صحیح مسلم کی ایک روایت یہاں تک ہے کہ جو چیز چوری ہو جائے وہ بھی صدقہ ہے، جامع ترمذی کی ایک روایت حضرت ابوذر رضؓ کی زبانی ہے کہ اپنے بھائی (مسلمان) کے سامنے مسکرا دینا بھی صدقہ ہے ــــ تبسمك فی وجه اخیك صدقة۔ پھر آگے ہے کہ

کسی بھی اچھی بات یا معروف کا امر کرنا صدقہ ہے کسی بری بات یا منکر سے منع کرنا صدقہ ہے کسی بھولے ہوئے کو راستہ بتا دینا صدقہ ہے آنکھوں (وغیرہ) سے معذور کی مدد کرنا صدقہ ہے راستہ سے کانٹے پتھر ہڈی وغیرہ کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دینا صدقہ ہے اپنے ڈول سے کسی کو پانی دیدینا صدقہ ہے۔

<u>**جانوروں تک کو نفع رسانی انفاق ہے**</u> یہ سب روایات مشکوٰۃ شریف باب فضل الصدقہ سے ماخوذ ہیں۔ حاصل سب کا دو ہی باتیں ہیں ــ ایک صدقہ یا انفاق کی بنیادی و جوہری حقیقت نفع رسانی کی ممکن توسیع و تعمیم کہ وہ محض مالی انفاق کا نام نہیں بلکہ مالی و غیر مالی جس بظاہر ادنیٰ سے ادنیٰ چیز سے بھی باواسطہ یا بلاواسطہ بارادہ یا بلا ارادہ کسی جاندار انسان و حیوان کسی کو

کوئی نفع وراحت پہنچ جائے سب صدقہ ہی صدقہ یا انفاق ہے دوسرے یہ کہ اس طرح لوگوں میں نفع اندوزی سے زیادہ نفع رسانی کی عادت پیدا ہو۔

غور کیا جائے تو معاشی ہی نہیں، سارے انفرادی واجتماعی فسادات کی بڑی جڑ نفع رسانی کی عادت وذہنیت کے بجائے نفع اندوزی بلکہ نفع بازی کی روزافزوں لعنت ہے اور کیوں نہ ہو؟ انفاق کی روح ایثار وقربانی ہے جو فرد ومعاشرہ قوم وملک سب کے لئے امن وامان راحت واطمینان کی ضمانت ہے بخلاف اس کے نفع اندوزی کی بنیاد نفس پرستی وخود غرضی ہے خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی وقومی، جو ہر طرح کے شر وفساد جنگ وجدال کا سرچشمہ ہے اس لئے سلامتی اس میں ہے کہ کسب وانتفاع کے رجحانات کو ضروری وجائز حدود سے آگے بالکل نہ نکلنے دیا جائے چہ جائیکہ اس کی ترغیب وتحریص یا اس کو عین ترقی قرار دیدیا جائے

اسلامی انفاق کا ایک اور بڑا مطالبہ

انفاق میں توسیع وتعمیم کے علاوہ اسلامی انفاق کا ایک اور قرآنی مطالبہ انفاق کی چیز کا خود انفاق کرنے والے کی نظر میں محبوب ومرغوب ہونا ہے، آگے کچھ اس کی تفصیل وتجدید کے پہلو بھی ملاحظہ ہوں۔ سب سے پہلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ آدمی کو مال یا انفاق کی چیز سے اگر سرے سے کوئی محبت ورغبت ہی نہ ہو تو اس کے کسی دوسرے کو دیدینے یا

انفاق میں کمال ہی کیا ہوا حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں محبت کی قید صاف بتارہی ہے کہ محبتِ مال ہی موجب فضیلت انفاق ہے صوفیا نے اس کو خوب سمجھا ہے، مولانا رومؒ فرماتے ہیں

شہوت دنیا مثال گلخن است   کہ از و حمام تقویٰ روشن است

کہ تقویٰ کی گرم بازاری تو شہوت (محبت) دنیا ہی سے ہے، اگر شہوت دنیا نہ ہو تو تقویٰ میں کمال ہی کیا رہا۔ اس کو کیسی اچھی مثال سے بیان فرمایا کہ شہوت دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے حمام کا ایندھن تو جس طرح حمام ایندھن سے روشن ہوتا ہے اسی طرح تقویٰ کا حمام دنیا کی شہوت (محبت) سے روشن ہوتا ہے اگر یہ نہ ہو تو حمام تقویٰ سرد پڑ جائے،

اس مثال میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ شہوت دنیا کو دل میں جمع نہ کرنا چاہئے بلکہ حمام میں جھونک دینا چاہئے، کیونکہ یہ خس و خاشاک گھر میں جمع کرنے کی چیز نہیں پھونکنے اور جلانے ہی کے کام کی ہے (افناء محبوب ص۲۱)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا یا مال کی محبت بذاتِ خود مذموم و مضر نہیں

انفاق سے اصلاح اعمال کا کام

بلکہ اگر اس کو دین کے کام میں لایا جائے تو مفید ہے حضرات صوفیاء نے اس سے اصلاح اعمال میں بہت کام لیا ہے مالی جرمانہ تک مقرر کیا ہے کہ (مثلاً) جب غیبت ہو جائے یا تہجد ناغہ ہو جائے تو کچھ صدقہ مالیہ بطور جرمانہ ادا کیا جائے یہ طریقہ میں بھی تجویز کرتا ہوں،

مگر جرمانہ اتنا ہو کہ نہ تو بہت گراں ہو جس کا دینا دشوار ہو نہ اتنا کم ہو کہ بالکل گراں نہ ہو ورنہ اثر ہی کیا ہوگا اس طریقہ سے جلد اصلاح اعمال ہو جاتی ہے کیونکہ مال کا خرچ کرنا نفس پر گراں ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس گرانی کا منشاء مال ہی ہے تو دیکھئے صوفیا نے اس محبت مال سے کتنا بڑا کام لیا (ص۳۳)

بخل کی اصلاح

اور اگر کسی میں بخل کا مرض ہو تو اسی طریقہ سے اس کا بھی علاج ہو جاتا ہے کہ پہلے
نفس کو تھوڑا خرچ کرنے کا عادی کیا جائے جس سے پہلے پہل تو نفس میں گرانی ہوگی لیکن اسی طرح عمل کرتے کرتے ایک دن دل کھل جائے گا اور بخل کا مادہ ضعیف ہو جائے گا۔

ایک شبہ کا حکیمانہ جواب

آگے ایک شبہ کا جواب ہے کہ جب ثواب کا صدور مال کی محبت اور اس کے خرچ کرنے میں نفس کی مزاحمت و گرانی ہے اور مجاہدہ سے عادت پڑ جانے پر یہ ناگواری یا گرانی قدرۃً کم یا زائل ہو جاتی ہے بلکہ عادت کے خلاف کرنے میں گرانی ہوتی ہے تو پھر نہ نفس کی مزاحمت و گرانی رہی نہ اجر و ثواب ملنا چاہیئے۔

جواب یہ ہے کہ ثواب ضرور ملیگا کیونکہ اس حالت پر پہونچا تو ہے (مجاہدہ کی) مصیبت ہی جھیل کر اور گو اس وقت بلا مجاہدہ بلکہ بعض اوقات بلا ارادہ کے عمل کا صدور ہونے لگا۔ مگر پہلا ارادہ و مجاہدہ وارادہ اب بھی اس کے ساتھ متعلق ہے عادات کی طرح عبادات میں بھی یہی بات ہے کہ پہلا ارادہ و مجاہدہ اخیر تک متعلق رہتا ہے اس کی مثال کیسی تسلی بخش ارشاد ہے کہ

جیسے مشی (یعنی چلنے) میں ارادہ تو (شروع کے بس) دو چار قدم کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اس کے بعد پھر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی قدم خود بخود اٹھتا چلا جاتا ہے لیکن چلنے کو پھر بھی اختیاری (یا

ارادی) فعل ہی کہا جاتا ہے کیونکہ ابتدا میں اس کے ساتھ ارادہ
اس حیثیت سے متعلق ہوا تھا کہ اتنی دور چلوں گا۔ یہی حال عبادات
کا ہے کہ جس عمل کے ساتھ ابتدا میں ارادہ و مجاہدہ متعلق ہوتا ہے
وہ اس عمل کی تکمیل ہی کیلئے متعلق ہوتا ہے اس لئے اخیر تک ان
دونوں کا تعلق باقی رہتا ہے گو عمل کرنے والے کو اس کا احساس
ہی نہ ہو اور وہ یہی سمجھتا ہو کہ میں بدون ارادہ کے عمل کر رہا ہوں"(صا۲۳)

مال کی محبت کے باوجود اس کا خدا کی راہ میں انفاق غرض مال کی
محبت ہونا یا باقی رہنا نہ معیوب نہ مذموم ہے نہ اس محبت کا بالکلیہ فنا کر دینا
مامور و مطلوب، بلکہ مطلوب یہی ہے کہ مال کی محبت کے باوجود اس کو خدا کی
محبت و راہ میں خرچ کیا جائے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس راز پر مبنی
عجیب ارشاد ہے:۔

آپ کے زمانہ میں کسی غزوہ سے بیشمار مال و دولت لایا گیا تو آپ نے
حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ آپ کا ارشاد ہے زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ
الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ
مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ ط کہ لوگوں کی نظر میں اپنی شہوتوں
(یا خواہشوں) کی محبت مستحسن کر دی گئی ہے یعنی عورتوں اولاد
اور سونے چاندی کے ڈھیروں کی محبت لوگوں کے قلوب میں
آراستہ کر دی گئی ہے۔

اور اے پروردگار جب آپ نے خود ہی کسی مصلحت سے اس کی محبت
کو مزین کر دیا ہے تو یہ درخواست کرنا کہ ہمارے دل میں اس کی

محبت ہی نہ رہے خلافِ ادب ہے اس لئے ہم یہ درخواست
نہیں کرتے بلکہ یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس محبت کو اپنی رضا کا
ذریعہ بنا دیجئے۔
سبحان اللہ! جس کی رائے موافق وحی و کتاب ہوتی تھی اس کی فہم وحی کا کیا کہنا
تو دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر آج کون عارف
ہوگا؟ آپ نے

وقت کی تجدیدی اصلاح حُبِ مال کے زوال کی دعا
نہیں کی کیونکہ حب مال میں حکمتیں ہیں (صـ ۳۳)
ایک بڑی حکمت تو یہی ہے کہ اگر مال کی محبت نہ ہو تو آدمی کو نہ مال کمانے کی فکر
ورغبت ہوگی نہ جمع کرنے کی، اور جب نہ کمائے گا نہ جمع کرے گا نہ بچائیگا
تو خدا کی راہ میں خرچ کیا اور کہاں سے کرے گا۔ آگے اس سلسلہ میں ایک
بڑی حکیمانہ تجدید و اصلاح کی بات سننے کی ہے کہ

حرام ذریعہ معاش کا جواز بعض طبائع کے لئے (بلکہ اکثروں
کے لئے خصوصاً اس زمانہ میں) بقدر ضرورت مال جمع کرنا ضروری
ہے ان کا تقویٰ مال ہی تک رہتا ہے اگر مال ہے تو نماز روزہ
بھی ہے ورنہ کچھ نہیں اس لئے ہمارے حضرات بعض لوگوں کو
ترک ملازمت سے منع فرماتے ہیں بلکہ بعض کو ناجائز ملازمت
کے ترک سے بھی منع فرمایا کہ جب تک حلال ملازمت (یا کوئی
دوسرا ذریعہ معاش) نہ ملے اس وقت تک اس کو کئے جاؤ اور

استغفار و توبہ کرتے رہو کیونکہ گو یہ ملازمت حرام ہے مگر ایمان کی وقایہ (محافظ) ہے ایسا نہ ہو کہ افلاس کی پریشانیوں میں ایمان ہی جاتا رہے (صـ ۲۳۳)

مال نہ ہونا ہلاکت دین کا سبب ہو سکتا ہے

ہمارے حضرات میں خصوصیت سے نام اپنے مرشد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا لیا ہے کہ وہ بقدر ضرورت مال جمع کرنے کی ہدایت فرماتے تھے اس زمانہ کا ذکر ہی کیا۔ امام ثوریؒ جیسے جلیل القدر تابعی کا بھی اپنے زمانہ ہی میں لوگوں کو مشورہ تھا (جس کی تفصیل اوپر کہیں گذر چکی) کہ آج کل کسی کے پاس کچھ درہم ہوں تو ان کی حفاظت کرے کیونکہ ایک زمانہ میں تو مال کا جمع کرنا ہلاکت دین کا سبب تھا مگر آج کل مال کا نہ ہونا ہلاکت دین کا سبب ہے اور اوپر چلئے تو حضرات صحابہ میں جہاں خود حضورؐ نے ایک طرف حضرت صدیق اکبرؓ کا سارا مال و متاع خدا کی راہ میں قبول فرمالیا وہاں بعضوں کو سختی کے ساتھ اس سے روکا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہم جیسے ضعیفوں کی رعایت سے سال بھر کا نفقہ ایک دم سے اپنی ازواج کو دیدیا ہے کہ ہم کو جواز کے ساتھ اتباع سنت کا بھی ثواب ملے، یہ تو علماء کے مذاق پر حضورؐ کے اس فعل کی توجیہ تھی۔

آگے ایک دوسری توجیہ حضرات صوفیہ کے مذاق پر ارشاد ہے، راقم حروف کے جی کو یہی زیادہ لگتی ہے کیونکہ

حضرات صوفیہ کی فہم حدیث

اس میں اظہار عبدیت تھا کہ حضورؐ کو بھی غلہ کی احتیاج تھی ورنہ تو

بعض اولیاء نے تو ایک دن کا بھی خرچ نہیں رکھا اور وہ یقیناً حضورؐ سے زیادہ متوکل نہ تھے مگر حضورؐ نے اظہار عبدیت کیلئے سال بھر کا نفقہ جمع کیا تھا اور اسی اظہار عبدیت کے لئے دعا کرنا ترک دعا سے افضل ہے کیونکہ شکستگی اور اظہار عجز اسی میں ہے اور یہ حق تعالیٰ کو محبوب ہے۔ ع

ہر کجا پستی است آب آنجا رود" (ص ۲۵ افناء المحبوب)

لگے ہاتھوں توکل کی صحیح حقیقت بھی سن لیجئے۔

توکل کی صحیح حقیقت

توکل کے ایک معنیٰ تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد ہو کہ جو وہ چاہیں گے وہی ہو گا۔ اور عمل یہ ہو کہ خلاف شرع تدبیر سے رک جائے یہ عقلی توکل ہے جس کا بندہ مکلف ہے اس سے زیادہ کا مکلف نہیں، اور ایک توکل کا حال یہ ہے کہ کسی وقت یہ خطرہ بھی نہ آئے کہ آج روٹی ملے گی یا نہیں یہ حال مطلوب و مامور نہیں، اگر عطا ہو جائے تو ملنا محمود ہے نہ عطا ہو تو نہ ملنا محمود ہے، یہ تو محققین کا فیصلہ ہے، باقی مغلوبین سو ان میں سے بعض نے تو کہا ہے کہ مقام توکل کی اصلاح بھی پیٹ کا دھندا ہے حضرت منصورؒ نے ایک سالک سے پوچھا کہ آج کل کیا شغل ہے کہا کہ مقام توکل کی تصحیح کر رہا ہوں فرمایا عمر بھر پیٹ ہی کے دھندے میں رہو گے محبوب کے ساتھ دل لگانے کا کب وقت آئے گا۔ سو یہ آثار مغلوبیت کے ہیں۔ علوم نہیں۔

ورنہ جس توکل کا معاشی یا دنیوی معاملات میں اسلام کی طرف سے مطالبہ ہے وہ ترکِ تدبیر نہیں بلکہ:۔

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اعتقاد رکھو کہ اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا

اور تدبیر خلاف شرع نہ کرو، بس واللہ تم متوکل ہو، واللہ تم متوکل ہو
واللہ تم متوکل ہو۔ (ص ۲۷)

انفاق محبوب کی تحقیق و تفصیل

غرض اسلام نے نہ مال و معاش کی جائز طلب و تدبیر سے روکا ہے نہ اطمینان قلب کے لئے بقدر ضرورت مال جمع کرنے سے منع کیا ہے اور نہ مال کی نفس رغبت و محبت کو مذموم بتایا ہے بلکہ اس کی مرغوبیت و محبوبیت کو مقبول و مبرور انفاق کی شرط ٹھہرایا ہے کہ جبتک تم ایسی چیزوں کو خرچ نہ کرو گے جو تم کو محبوب ہوں بر یا نیکی کے کمال کو پا ہی نہ سکو گے یعنی جو چیز تم اللہ کی راہ و رضا میں خرچ کرتے ہو وہ جتنی زیادہ سے زیادہ تم کو خود پسند و محبوب ہو گی اتنا ہی زیادہ سے زیادہ تم نیکی کا کمال یا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حاصل کر سکو گے، حضرات صحابہ حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے جیسے حریص تھے اس کا اثر یہ تھا کہ جب یہ آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہ رضؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ:

> اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جبتک محبوب چیز نہ خرچ کرو گے اسوقت تک بر کامل نہ حاصل کر سکو گے اور مجھ کو زیادہ محبوب مال باغ (موسومہ) بیرحاء ہے تو گویا ان کی فہم میں بر کامل کا حصول احب الاشیاء (سب سے محبوب چیز) کے انفاق پر موقوف تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تقریر فرمائی۔

یعنی تردید نہیں فرمائی اس سے بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر ہے اور نیکی کے حاصل کرنے کے لئے جو چیز خرچ کی جائے اس کا صرف محبوب ہونا

کافی نہیں بلکہ اپنی سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہونا ضروری ہے لیکن دراصل یہ مطلب بالکل نہیں اس میں تو مِمَّا تُحِبُّوْنَ ہ سے صراحۃً صرف محبوب ہونے کا مطالبہ ہے ۔

احبیّت (یعنی سب سے زیادہ محبوب ہونے) کی قید نہیں اور حدیث میں حضرت ابو طلحہ کا قول ان احب الاموال الیّ بیرحاء جو وارد ہے تو کسی دلیل سے اس کا مما تحبّون کی تفسیر ہونا ثابت نہیں ۔ بلکہ حضرت ابو طلحہ نے از خود یہ ظاہر کرنا چاہا کہ گو حصول بر نفس محبوب شئے سے بھی ہو سکتا ہے مگر میں اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کو حاصل کرنے کی تمنا میں احبّ الاشیاء (اپنی سب سے محبوب شئی) کا انفاق کرنا چاہتا ہوں ۔" (صنـ۳۰ـ)

یہ حضرات صحابہ خصوصاً اکابر صحابہ رض کا خاص رنگ و مذاق تھا کہ خدا کی زیادہ سے زیادہ رضا جوئی اور آخرت کے ثواب میں اپنی والی کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے جان و مال ہر معاملہ میں بڑی سے بڑی فداکاری اور قربانی پر تلے رہتے تھے ورنہ آیت کا صاف سادہ مطلب یہی ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے ردی یا ناکارہ چیز ہی کو چھانٹ کر نہ نکالا جائے

غرض تم مطلق محبوب مال کے انفاق سے بھی بر حاصل کر لو گے خواہ اَحَبّ (سب سے زیادہ محبوب) نہ ہو، ہاں ، دل خول نہ ہو کہ موٹی بھیڑ خواجہ خضر کے نام (صنـ۳۰ـ)

بلکہ اللہ کے نام پر اچھی چیز ہی خرچ کرو جو پیاری ہو (البتہ) یہ ضروری نہیں کہ سب سے زیادہ پیاری ہو، سو پیارا تو ایک پیسہ بھی ہے مجھے خود اپنی حالت معلوم ہے کہ ایک پیسہ بھی ضائع ہو جاتا ہے تو دو چار منٹ تک

تردد رہتا ہے تو ایک پیسہ کا خرچ کرنا بھی انفاق مما تحبون میں داخل ہے پس اس کا لحاظ انفاق میں ضروری ہے کہ جو چیز بھی خرچ کرو وہ (تم کو خود کچھ نہ کچھ) محبوب ہو، گو کسی دولتمند کے نزدیک وہ غیر محبوب ہی ہو" (ص ۳۱)

اس بات کو خود قرآن مجید میں دوسری جگہ بالکل کھول کر واضح فرما دیا گیا ہے۔

اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ کی تفسیر

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ. کہ اپنی کمائی میں سے پاکیزہ کو خرچ کرو اور اس میں سے خبیث (یا خراب چیز کے خرچ کرنے) کا قصد نہ کرو

پس ہر شخص اپنی کمائی میں سے محبوب کو خرچ کرے گو وہ کسی نواب و بادشاہ کے نزدیک خبیث (یا خراب) ہی ہو مگر تمہارے نزدیک خبیث نہ ہونا چاہیئے اس میں غرباء کی رعایت کی گئی ہے۔ اگر طیبات ما کسبتم نہ فرماتے بلکہ انفقوا طیبات فرماتے تو غرباء کو فکر ہوتی کہ ہمارے پاس تو جتنا کچھ بھی ہے امیروں کی نظر میں سب ہیچ ہی ہے طیبات کاملہ ہم کہاں سے لائیں۔

اس لیے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ طیبات کاملہ کی ضرورت نہیں بلکہ تمہارے پاس جو کچھ ہے اس میں سے پاکیزہ مال خرچ کرو چھانٹ چھانٹ کر ردی مال اللہ کے لیے نہ نکالو" (ص ۳۲)

❁ ❁ ❁

بعض کوتاہیاں

اسی سلسلہ میں بعض کوتاہیاں اور فوائد ایک اور وعظ بنام شفاء العی سے نقل کرنے کے لائق ہیں ارشاد ہے کہ

جب کوئی مرتا ہے تو دو طرح کی چیزیں ہوتی ہیں ایک معمولی چیز جیسے چارپائی چادر وغیرہ تو عادت یہ ہے کہ ان کو لِلّٰہ دیا جاتا ہے اور قیمتی چیزوں کو آپس میں بطور تبرک تقسیم کیا جاتا ہے اور دونوں میں کوتاہی برتی جاتی ہے (صـ ۱۸)

اول یہ کہ عموماً (مردہ کی) ان مستعمل چیزوں کو منحوس سمجھا جاتا ہے مثلاً جس چارپائی پر انتقال ہوا ہے اس کو خود استعمال کرنا معیوب خیال کرتے ہیں جن کپڑوں میں انتقال ہوا ہے ان کو گھر میں رکھتے عار آتی ہے،

غضب ہے کہ منحوس سمجھتے ہوتے خدا کے نام پر دیتے ہیں ......

افسوس لوگوں کو شرم نہیں آتی (کہ مثلاً اسی طرح) جب کھانا سڑ گیا تو اللہ کے واسطے ہوگیا (اور کسی غریب کو دیدیا) ورنہ اپنے کھانے کا تھا۔ نیا کپڑا اپنے لئے اور جب پھٹ گیا تو اللہ کے نام تھوپ دیا، غرض جو شئی نکمی ہوجائے وہ اللہ کے نام پر دیدی جاتی ہے

ایک سوال

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیچارے بہت سے غریب غربا ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ان سڑی گلی پھٹی پرانی چیزوں سے بھی بھلا ہوجاتا ہے تو کیا ان کو سرے سے پھینک دیا جایا کرے۔

جواب یہ ہے کہ پھینکو نہیں بلکہ مساکین ہی کو دو مگر اس نیت سے دو کہ ان کی حاجت رفع ہو اور خالص خوشنودی حق کے لئے دو تو

وہ اچھی چیز ہی ہونی چاہیئے اور فرق دونوں میں اس سے معلوم ہوگا کہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور صدقہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ دریافت کرنے پر فرمایا کہ صدقہ تو اللہ کو خوش کرنے کے لئے جس کا مصرف فقراء ہیں اور ہدیہ میرے خوش کرنے کے لئے ہے۔

صدقہ و ہدیہ کا فرق

صدقہ و ہدیہ کا یہ فرق بھی بڑا اہم اور یاد رکھنے والا ہے لوگ بالعموم اس سے ناواقف ہوتے اور بڑی غلطیاں کرتے ہیں

ہدیہ سے محض مہدی الیہ (جس کو ہدیہ دیا جاتا ہے) دل خوش کرنا مقصود ہوتا ہے ثواب کی نیت اس میں نہیں ہوتی گو بالواسطہ ثواب مل جاتا ہے کیونکہ تطییب قلب مسلم (یعنی مسلمان کے دل کو خوش کرنا) بھی عبادت ہے لیکن براہِ راست ثواب مقصود نہیں ہوتا ہے"۔ اس واسطے اگر کسی کے پاس صدقہ بھیجیں اور وہ نہ لے تو دوسرے کو دیدیا جاتا ہے اور ہدیہ جس کے پاس بھیجا جاوے وہ نہ لے تو خود کھا پی لیتے ہیں یا مستقل قصد کرکے اور کسی کو ہدیہ دیتے ہیں

اچھی اور خراب چیز کے انفاق میں فرق

جب ہدیہ اور صدقہ میں فرق سمجھ لیا تو ایسا ہی فرق گھٹیا اور بڑھیا چیز کے دینے میں ہے کہ اعلیٰ شیٔ اللہ کے نام پر ثواب کے لئے اور ادنیٰ شیٔ کسی مسکین کو رفع حاجت کے لئے دیدو، گو اجر اس سے بھی مل جائے گا مگر اللہ کے

نام پر خراب شے دینے میں جو بے ادبی تھی اس سے احتراز ہو گیا
کیونکہ تم نے وہ اللہ کے نام پر نہیں دی بلکہ مسکین کی محض رفع حاجت
کے لئے دیدی "(صك)

ایک حدیث کا رفع اشکال

اس سے اس حدیث کا اشکال بھی دور ہو جاتا ہے جس میں آتا ہے کہ جب نیا کپڑا پہنے تو پرانا خیرات کر دے اور نیا جوتا پہنے تو پرانا خیرات کر دے اور اس کی صورت میں ظاہر ہے کہ ردی مال صدقہ کیا جائے گا۔ حکیم الامت کی حکیمانہ رائے میں حدیث کا مطلب یہی ہے
کہ پرانے کپڑے اور جوتے کو اللہ کے نام پر ثواب کی نیت سے
نہ دیا جائے بلکہ اعانت غریب کی نیت سے صدقہ دیا جائے
تم اعانت غریب کے سوا کچھ قصد نہ کرو چاہے اللہ تعالیٰ ثواب
بھی دیدیں۔ خوب سمجھ لو۔
اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (حدیث میں) مراد اس سے وہ پرانا کپڑا
جوتا وغیرہ ہو جو ردی کے درجہ تک نہ پہنچا ہو، یعنی بالکل نکمّا نہ
ہو گیا ہو (افناء المحبوب ص۳۲)

اچھی چیز کے انفاق میں بھی ایک بڑی کوتاہی

ان درمیانی فوائد سے پہلے اوپر شفاء العی کے حوالہ سے خدا کے نام پر صدقہ یا خیرات میں جن دو خرابیوں کو (خصوصاً مردہ کے متروکات میں) بتلانا تھا ان میں سے ایک تو یہی تھی کہ لوگ عام طور پر جن چیزوں کو منحوس جانتے یا اپنے مصرف کی نہیں سمجھتے ان کو خدا کے نام پر دیدیتے ہیں، دوسری خرابی اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اچھی چیزوں کی خیر

وغیرات کرنے میں شرعی احکام کی پرواہ کم ہی لوگ کرتے ہیں
تو سنئے حکم شرعی یہ ہے کہ میت کا کل ترکہ مشترک ہے درمیان ورثہ
کے اور مشترک مال کو بلا اجازت دیگر شرکاء کے صرف کرنا جائز نہیں
پس ترکہ ہی کا ایک کرتہ یا پائجامہ حتیٰ کہ ٹوپی کمربند اور رومال بلکہ سوئی
تک بھی قبل از تقسیم بلا رضا مندی سب ورثاء کے دینا جائز نہیں

اُلٹے گناہ مگر آج کل اس کی مطلق پرواہ نہیں، دیتے ہیں ثواب کیلئے
اور ہوتے ہیں گنہگار، خدا بچائے جہالت سے، مشترک مال خرچ کرنے
میں چند شرطیں ہیں ایک اجازت دوسرے اجازت دینے والے کا
عاقل و بالغ ہونا تیسرے طیبِ خاطر (خوشدلی) سے اجازت دینا
تینوں باتوں کو خوب دیکھنے کے بعد خرچ کیا جائے تو جائز ورنہ حرام
یعنی سب ورثہ سے اجازت لی جائے اور ان میں کوئی نابالغ
نہ ہو، مجنون نہ ہو اور اجازت خوشی سے دیں اگر کسی کے دباؤ یا رواج
کی بنا پر اجازت دیدی تو وہ بھی معتبر نہیں، کیونکہ اس میں طیب
خاطر نہیں ہوتی ۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی وارث کا دل
نہیں چاہتا مگر انکار میں سبکی ہوتی ہے اس لئے اجازت دیدی
جاتی ہے حدیث شریف میں صاف وارد ہے الا لا یحل مال
امرئ مسلم الا بطیب نفسہ یعنی یا درکھو کسی مسلمان کا مال بدون
اس کی دلی خوشی کے لینا حلال نہیں (ص۔)

یہ تو اتفاق سے متعلق درمیان میں بعض ایسی ضروری اصلاحات کا بیان تھا
جس کا اگر پوری طرح لحاظ نہ رکھا جائے تو ثواب کے بجائے اُلٹے گناہ کا کام ہوجاتا ہے

اصل ذکر یہ چل رہا تھا کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ہ میں مطالبہ اپنی سب سے زیادہ محبوب و پسندیدہ چیزوں کے انفاق کا نہیں بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ چھانٹ چھانٹ کر خراب و خستہ چیزوں ہی کو خیرات و صدقات کا مصرف نہ بنایا جائے ورنہ نفس

تحصیل برّ (یا حصول نیکی) کے لئے احب الاشیاء (سب سے محبوب) کا انفاق ضروری نہیں اور حضرت ابو طلحہ کا احب الاشیاء کا خرچ کرنا اس غرض سے تھا کہ وہ خیر کامل کے قصد سے انفاق اعلیٰ کرنا چاہتے تھے حضرات صحابہ کی یہی شان تھی کہ وہ دین کے ہر کام میں اعلیٰ درجہ کا قصد کرتے تھے۔

اس کے علاوہ آگے ہی

خود نص میں ایک قرینہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حصول برّ کے لئے احب الاشیاء (سب سے محبوب) کا انفاق ضروری نہیں اور وہ قرینہ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ

مَا تنفقوا من شی فان اللہ بہ علیم کی تفسیر

دونوں آیتوں کا ترجمہ یہ ہوا کہ تم برّ (کامل نیکی) اس وقت تک ہرگز نہ حاصل کر سکو گے جب تک اپنی محبوب و مرغوب چیزوں میں سے (خدا کے لئے) خرچ نہ کرو (اور یوں) تم جو کچھ بھی خرچ کرو اللہ اس کو یقیناً خوب جانتا ہے قرینہ و مقام سے اس کا ظاہر مطلب یہی ہے کہ نیکی کا کمال تو آدمی کو اپنی محبوب و پسندیدہ چیزوں ہی کے خرچ کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے باقی یوں جو بھی محبوب نا محبوب چیز تم خرچ کرو گے بشرطیکہ وہ بالکل ناکاری نہ ہو اللہ اس کی حیثیت و نوعیت بہر حال پوری طرح جانتا ہے

اسی کے موافق و مناسب ثواب بھی عطا فرمائے گا لیکن عام مفسرین نے دوسری آیت وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ کو پہلی کی تاکید و تعلیل سمجھا ہے کہ تم کو انفاق پر ثواب ضرور ملیگا کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے انفاق سے اچھی طرح واقف ہیں مگر مفسر تھانوی فرماتے ہیں کہ:۔

میری سمجھ میں خود بخود یہ بات آئی تھی کہ یہ آیت پہلی (کی تاکید و تعلیل نہیں بلکہ اس) کے مقابل ہے یعنی پہلی آیت میں انفاق محبوب پر برِ کامل کے حصول کو موقوف کیا گیا تھا اور اس آیت میں مَا تُنْفِقُوْا عام ہے محبوب و غیر محبوب دونوں کو۔

اور اس طرح صاف و ظاہر مطلب وہی نکلتا ہے جو اوپر عرض کیا گیا کہ برِ کامل تو انفاق محبوب ہی سے حاصل ہوگی اور ویسے تم جو کچھ بھی خرچ کرو خواہ محبوب ہو یا غیر محبوب بشرطیکہ ردی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں یعنی (اس کی حیثیت کے مناسب) ثواب کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا گو برِ کامل حاصل نہ ہو۔

آگے حضرت علیہ الرحمۃ تفسیر بالرائے سے بچنے کے لئے حسب معمول غایت احتیاط کی بناء پر فرماتے ہیں کہ

یہ تفسیر میرے ذہن میں آئی تھی مگر میں اس سے مطمئن نہ تھا بلکہ تفسیر میں تلاش کیا تو بیضاوی نے بھی یہی لکھا ہے جو میں سمجھا تھا اس سے میرا جی بہت خوش ہوا اور اطمینان ہو گیا کہ یہ تفسیر بالرائے نہیں البتہ اس تفسیر پر شبہ یہ رہتا ہے کہ ایت سے ردی اور نکمی چیزوں کے انفاق پر ثواب معلوم ہوتا ہے اس کا

جواب یہ ہے کہ اس سے انفاق ردی (بالکل نکمی چیز) کا جواز

یا اس پر ثواب کیسے معلوم ہوا، ہاں اس میں محبوب اور غیر محبوب کی تقسیم ضرور ہو گئی کہ اگر غیر محبوب بھی خرچ کرد بشرطیکہ ردّی قابل نفرت حد تک نہ ہو تو اس پر بھی ثواب مل جائیگا

محبوبیت کے اعتبار سے انفاق کے تین درجے

لہذا جو کچھ آدمی خرچ کرتا ہے محبوبیت اور غیر محبوبیت کے اعتبار سے اس کے تین درجے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ایک محبوب (۲) غیر محبوب (۳) اور ایک ردّی مبغوض (یا قابل نفرت)

پہلے دونوں درجوں پر ثواب ملیگا اول پر زیادہ دوسرے پر کم اور تیسرے درجہ کی ممانعت ہے اس پر ثواب نہ ملے گا (افناء المحبوب ص۴۲)

خلاصہ سب کا

یہ نکلا کہ اسلام نے اپنی کتاب کی صاف و صریح نصوص و تعلیمات کی رو سے البر یعنی نیکی یا خیر و فلاح کے حصول کو اس کے وسیع ترین و کامل ترین معنیٰ و مفہوم میں ـــ جس میں انفرادی و اجتماعی دینی و دنیوی ہر طرح کی بھلائی داخل ہے موقوف ٹھہرا دیا ہے انفاق کے وسیع ترین معنیٰ و مفہوم پر، جس سے مراد نہ صرف روپیہ پیسہ یا مال و زر کا انفاق ہے بلکہ مال و دولت جاہ و عزت وقت و قوت، علم و لیاقت جو اور جس طرح کی بھی ہم کوئی مالی و جانی یا جاہی صلاحیت و اہلیت رکھتے ہوں اور جو خصوصاً ہم کو محبوب ہو اس سے دوسروں کی حسب موقع و محل جو خدمت بھی بن پڑے کرتے رہیں یہی اسلام کی انفاقی تعلیم کا ہمہ گیر مدعا و مطالبہ ہے"

جس ملک و معاشرہ میں ایثار و قربانی کی یہ ہمہ گیر انفاقی روح و ذہنیت جتنی زیادہ عام و تام ہوگی اتنی ہی خود غرضی، مطلب جوئی یا نفس پرستی کی برائیاں ناپید ہوں گی اور غور کیا جائے تو جس طرح سارے سیاسی و معاشی اخلاقی اور معاشرتی شر و فساد کی جڑ مطلب پرستی و خود پسندی ہے ویسے ہی ہر طرح کی خیر و سعادت یا البر کا سرچشمہ ہر طرح اپنی محبوب و پسندیدہ چیزوں اور صلاحیتوں کو دوسروں پر خرچ کرتے یا ان کے کام میں لاتے رہنا ہے بالفاظ دیگر کم از کم اپنے غیر ضروری شوقوں اور خواہشوں کو مغلوب و فناء کر کے دوسروں کی ضرورتوں کو پوری کرنے یا ان کی نفع رسانی میں لگے رہنا ہے۔

صوفیانہ نکتہ

بلکہ سچ یہ ہے کہ انفاق کی روح یا جوہریت ہی دوسروں کو کچھ دینے سے پہلے خود اپنی خوشی و خواہش کا فنا کرنے کا مجاہدہ ہے اسی بناء پر تھانوی حکیم و عارف نے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ پر گفتگو کا ایک مستقل عنوان انفاق محبوب کے علاوہ افناء محبوب، اپنی محبوب چیزوں کو فناء کرنا کا اختیار فرمایا ہے اور اس میں سلوک کے ان احوال و اذواق یا کیفیات و ثمرات تک کے فناء کرنے کو داخل فرما دیا ہے جن کے بالعموم اہل سلوک طالب و شائق ہوتے، بلکہ بہتیرے سلوک و تصوف کا اصل مطلوب و حاصل ان ہی کو جانتے ہیں۔ افناء المحبوب لارضاء المطلوب کے بیان و عنوان کے تحت ارشاد فرماتے ہیں کہ

> جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں انفاق عام ہے بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم و ترک مرغوب وغیرہ سب کو۔ خواہ اس تعمیم کا منشا کچھ ہی ہو، دلالۃ النص ہو یا قیاس ہو۔ تو اب یہ سمجھئے کہ ترک مرغوب

میں یہ بھی داخل ہے کہ احوال و کیفیات کے درپے نہ ہو ذوق و شوق جوش و خروش کا طالب نہ ہو، یہ چیزیں سالک کو مرغوب ہیں مگر مرغوبات کی طلب کو ترک (یا فنا) کر دینا چاہئے کیونکہ یہ بھی انفاق محبوب میں داخل ہے اور بدوں اس کے برّ کامل حاصل نہ ہوگی۔ (ص ۱۵)

تصوّف کا پہلا قدم در اصل سلوک و تصوف کا پہلا قدم ہی خودی اور خود پسندی یا نفس اور نفس پرستی کو فناء کرنا ہے اور جب تک یہ فناء نہ ہو دوسرو پر ہم اپنی محبوب و پسندیدہ چیزوں کے انفاق یا قربان کرنے پر آمادہ ہی کیسے ہو سکتے ہیں، جس پر تمام معاشی و معادی خیر و فلاح (البرّ) کی عمارت کھڑی ہوتی بلکہ صحیح معنی میں سالک و صوفی بنے یا انفرادی و اجتماعی خود غرضیوں اور خود مطلبیوں کو مغلوب و فنا کئے بغیر سچ تو یہ ہے کہ خالص معاشی و دنیوی صلاح و فلاح کا خواب بھی نہ کبھی پہلے شرمندۂ تعبیر ہوا ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے بس یہی حاصل ہے اس کا کہ:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ

معاشی مسائل و مشکلات کا اسلامی حل

اسلام میں معاش کا مسئلہ دراصل کوئی مسئلہ ہی نہیں

ایمان کی بات یہ ہے کہ اسلام کے ایمانی مطالبات (مذکورہ باب بالا) اور ان کے تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے تو معاد کے سوا معاش کیا زندگی کا کوئی بھی معاشی یا غیر معاشی مسئلہ نہ اس معنی میں کوئی مسئلہ رہتا ہے نہ کوئی مشکل، جس معنی میں جدید و عصری معاشیات اور معاشی تعلیمات و رجحانات نے افراد اور جماعتوں، شہریوں اور حکومتوں سب ہی کی پوری زندگی کو خالص معاشی یا دنیوی مسائل و مشکلات میں الجھا رکھا ہے ایمان کے بعد سارے معاشی و دنیوی مسائل میں مسئلۃ المسائل بس ایک ہی مسئلہ رہ جاتا ہے کہ معاشی یا غیر معاشی زندگی کی کسی راہ و روش میں کوئی قدم ایسا نہ اٹھے جس سے معادی زندگی کی منزل ذرا بھی کھوٹی ہو۔ زندگی کے جس مسافر نے سفر ہی کو منزل یا وطن نہیں بنایا ہے وہ سفر کی عارضی و وقتی خوشحالی یا راحتوں اور دلچسپیوں کو کوئی ایسا مسئلہ کیسے بنا سکتا ہے جس میں گم و منہمک ہونے کی بدولت وطن کے مستقل قیام کا گھر گرتا اور بگڑتا ویران اور برباد ہوتا ہے۔

اہل ایمان کی یہی معاشی نظر سلف سے خلف تک رہی

سلف سے خلف تک یہی نقطۂ نظر

بلکہ اس ایمان کی دعوت دینے والے انبیاء علیہم السلام میں بقول مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ اکثر کی حالت معاشی اعتبار سے قریب قریب فقر ہی کی رہی (خیر المال ص۲۴) سب سے بڑھ کر خود نبی الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے امت کے لئے پوری نبوی زندگی کا جو اسوہ و نمونہ چھوڑا ہے اس میں بھی اپنی ذات اقدس ہی کے لئے نہیں اہل و عیال تک کے لئے معاشی معیار کی بلندی یا توسیع و توسع کا دور دور پتہ نہیں۔ ایک موقعہ پر فتوحات سے مال غنیمت بکثرت آیا ہوا تھا حضور انور اس کو لوگوں میں تقسیم فرما رہے تھے تو ازواج مطہرات نے اپنے مصارف میں کچھ توسیع و اضافہ کی درخواست پیش کی اس پر قرآن کی آیات تخییر نازل ہوئیں یعنی ازواج مطہرات کو اختیار دیا گیا کہ چاہے دنیا و معاش کی خوشحالی کو اختیار کرلیں اور چاہے دین و معاد یا خدا و رسول کو

اور خود حضورؐ کو خطاب ہوا کہ

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَھَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝	اے نبی آپ اپنی بیویوں سے کہدو کہ تم اگر دنیا کی زندگی کی اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں کچھ تم کو دنیوی مال و متاع دے دلا کر رخصت خوبی سے کردوں اور اگر تم اللہ و رسول اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو تو اللہ نے تم میں سے ایسی نیک بیویوں کے لئے (آخرت کا) بڑا اجر تیار فرما رکھا ہے

(احزاب ع ۴)

ازواج مطہرات کی مثال

دیکھا آپ نے کہ ان مطہرات و محترمات نے معاذ اللہ کسی ناپاک و ناجائز یا حرام چیز کی درخواست نہیں کی تھی صرف روزمرہ کی معمولی زندگی کی معمولی ضرورتوں ہی میں تنگی و ترشی کو دور کرنے کی خواہش تھی جو آج کل معمولی سے معمولی شہری کا بھی معمولی سے معمولی حق خیال کیا جاتا ہے لیکن اس میں بھی چونکہ بظاہر اور براہ راست اس دنیا کی طلب کا میلان و ارادہ مترشح ہوتا تھا اور ایمان کی اعلیٰ و مثالی زندگی کے شایاں نہیں کہ جائز و مباح دنیا کا بھی خود خدا اور رسول اور آخرت کی دعوت دینے والے گھر والوں کی طرف سے اس عنوان سے اظہار و ارادہ کیا جائے جس سے اس کے کسی درجہ میں بھی بالذات مراد و مطلوب ہونے کا وہم ہوتا ہو اس لئے امت کی مائیں جن کو امت کے گھروں کے لئے تعلیم و تربیت کا اعلیٰ و مثالی نمونہ ہونا تھا ان کی طرف سے کسی ایسی خواہش و درخواست کو بھی پسند نہیں فرمایا گیا جس سے دنیا طلبی کا وہم و شائبہ تک پیدا ہو سکے اور اس پر اتنی سخت تنبیہ فرمائی گئی کہ طلاق تک دیدینے کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیدیا گیا۔

ورنہ فی الواقع ان مطہرات کا قلب و باطن مباح دنیا طلبی سے بھی اتنا مطہر و پاک تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو سب میں کم سن تھیں اور جن کا دنیوی حوصلوں کا سن تھا حضورؐ نے یہ حکم پہلے ان ہی کو سنایا اور فرمایا کہ جواب میں جلدی نہ کرنا، اپنے والدین سے مشورہ طلب کر کے جواب دینا۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کو یہ خیال ہوا کہ عائشہ کم سن بچی ہیں اور بچپن میں دنیا کی حرص ہونا کچھ بعید نہیں تو ایسا نہ ہو کہ جلدی میں دنیا کو اختیار کر لیں، اس لئے فرمایا کہ اپنے والدین سے مشورہ طلب کر کے جواب دینا کیونکہ

ان کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ وہ حضور سے مفارقت کی رائے کبھی نہ دیں گے۔

حضرت عائشہ رضؓ بچپن میں بھی حضرت عائشہ رضؓ ہی تھیں

مگر حضرت عائشہ بچپن میں بھی آخر حضرت عائشہ ہی تھیں تخییر کی یہ آیات سن کر بے تامل فوراً جواب میں فرمایا افی ھذا استامر ابوی کیا میں اس معاملہ میں اپنے والد سے مشورہ کروں گی ؟

قد اخترت اللہ ورسولہ والدار الآخرۃ ، میں نے اللہ و رسول اور آخرت کے گھر کو اختیار کیا۔

قرآن مجید نے اس موقعہ پر عجیب بلیغ تعبیر فرمائی کہ اگر تم دنیا کا ارادہ رکھتی ہو، یعنی دنیا کو کسی درجہ میں بھی اپنی مراد بناتی ہو تو امت کی ماؤں کا ذکر ہے کیا امت کی کسی لونڈی کے بھی زیبا نہیں کہ وہ دنیا کو مراد بنائے یا اس کا بالذات ارادہ کرے، ہاں بواسطہ اور بقدر ضرورت دنیا کا ارادہ استعمال جائز ہی نہیں بلکہ ارادہ آخرت کے واسطے اور اس کی ضرورت سے حسب موقع مامور و مطلوب اور فرض و لازم تک ہے، مسلمان تو درحقیقت نام ہی اس کا ہے جو دنیا یا معاش کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ و مسئلہ کو صرف دین یا معاد کی آنکھ سے دیکھے، دنیا کو خود دنیا کی نظر سے دیکھنا ایمان کی شان کے منافی ہے"

کاشانۂ نبوت کا نمونہ نبوت کی اس تعلیم کا نمونہ خود کاشانۂ نبوت تھا اور یہی تعلیم اس کاشانۂ اقدس سے باہر تھی۔ علوم نبوت کے مجدد حکیم الامت

کا خیر المللی میں ارشاد ہے کہ ایک موقعہ پر حضرت عمر رضہ کاشانہ نبوت پر حاضر ہوئے
ان کی نظر دولت خانہ کی ہیئت پر پڑی تو دیکھا کہ گدے میں کھجور
کے پتھے بھرے ہیں اور کچھ چمڑے لٹکے ہوئے ہیں بس یہ کائنات
حضور (سرور کائنات) صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی تھی نہ بکس
نہ الماری، نہ میز، نہ کرسی، نہ بنگلہ نہ کوٹھی
حضرت عمر رضہ کے آنسو جاری ہو گئے عرض کیا یا رسول اللہ قیصر و کسریٰ
خدا کے دشمن صلیب پرستی کرنے والے ان کے پاس تو یہ ساز
و سامان اور آپ کی یہ حالت! آپ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ
آپ کی امت پر دنیا کی وسعت دیا آج کل کے نعرہ میں معاشی
معیار بلند) فرمادیں (صـ۱۸)

حضرت عمر رضہ کو تنبیہ

یہاں بھی حضرت عمر کا یہ مطلب تھا نہ ہو سکتا تھا کہ
معاذ اللہ وہ خود حضور ص کو قیصر و کسریٰ کی نفس پرستانہ اور عیاشانہ زندگی یا
ٹھاٹھ باٹھ کی رغبت دلا رہے یا امت کے لئے اس کی دعا چاہتے تھے
مدعا فقط اتنا تھا کہ جائز و مباح آرام و راحت میں تنگی نہ فرمائی جاوے مگر عرض
کرنے کے عنوان میں ایک بعید شائبہ اس کا نکلتا تھا کہ گویا دنیا کی وسعت
و فراغت کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی بذات خود مطلوب و مراد بنانے کی کوئی
ایسی شئے ہے کہ اس کے لئے قیصر و کسریٰ کی دنیوی مال و دولت اور جاہ و جلال
والی زندگی کی طرف نظر اٹھائی جائے یا ایمانی زندگی کے مقابلہ ہوا نہ میں اس کا
کسی ترغیبی عنوان سے ذکر آئے، حضور ص نے کس شدومد سے اس شائبہ و واہمہ
کو رد فرمایا

تم اب بھی شک میں ہو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ اَفِی شَكٍّ اَنْتَ يَا عُمَرُ "اے عمر (عمر ہو کر) تم اب تک شک ہی میں ہو؟"

استغفر اللہ! کیا حضرت عمرؓ کا ایمان و یقین رتی برابر بھی ڈانواں ڈول تھا؟ بات اتنی ہی تھی کہ فاروق اعظم کی ایمانی شان و عظمت سے یہ بات بھی فروتر تھی کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی کسی اعلیٰ سے اعلیٰ شان و عظمت یا راحت و دولت پر غلط انداز نظر بھی پڑے، اسی لئے تنبیہ فرمائی کہ

مسلمان کا مسئلہ معاش نہیں معاد (آخرت) ہے

ان لوگوں (دنیا پرستوں کافروں) کو تو جو کچھ ملنا تھا سب کچھ دنیا ہی میں مل گیا وہاں کچھ نہیں اور ہمارے لئے آخرت کی راحت ہے"

یہ تو دونوں جہان کے بادشاہ کا قول وارشاد ہوا۔ عمل کی

اس پر عمل کی حالت

حالت یہ تھی کہ بعض دفعہ آپ کے ہاں مہمان آتے ہیں۔ پوچھنے پر آپ کے سارے گھروں سے جواب آتا ہے کہ گھر میں پانی تو ہے اور کچھ نہیں"

ہمارے جدید معاشیات والے مسلمان گھبرائیں نہیں ان باتوں کے دہرانے کا مقصود ان پر دنیا کی جائز راحت و فراغت اور زیب و زینت کو حرام کرنا نہیں جس کو خدا نے حلال کیا ہو، کسی بندے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ حرام کرے، مقصود صرف اسلامی نقطۂ نظر کو اسلامی بنانا ہے کہ جدید معاشیات کی طرح اسلام

بالذات دنیا یا معاش کو نہیں بلکہ دین یا معاد کو مطلوب و مراد بنانے آیا ہے اور اسی لیۓ اسلام کا پیام لانے والے صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی سے دنیا و معاش کے مسائل کو اس طرح باہر نکال فرمایا کہ امت کو ان کی بالذات مطلوبیت کے وہم و گمان کی بھی گنجائش نہ رہے اور معلوم ہو جاتے

قرآن میں دین کے ساتھ دنیا کی مطلوبیت کا نام بھی نہیں کہ آپ صرف دین کے لئے مبعوث ہوئے تھے قرآن ہی کو دیکھ لیجیۓ کہ دین کے ساتھ کہیں دنیا کی مطلوبیت کا نام بھی نہیں لیا گیا جس جگہ ذکر ہے دین ہی کا بالذات ذکر فرمایا ہے ایک جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جہاں بالذات دنیا کی رغبت دلائی گئی ہو۔

حسنۂ دنیا کے معنی بہت سے اہل علم تک خود دنیا کی مطلوبیت دلیل میں آجکل بے تکلف ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة پڑھ دیا کرتے ہیں حالانکہ کون قرآن کی ادنیٰ سے ادنیٰ فہم رکھنے والا بھی سوچ سمجھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی بھی ایسی چھوٹی بڑی حسنۃ یا بھلائی قرآن کی نگاہ میں کسی درجہ میں بھی حسنۃ کا مصداق ہو سکتی ہے جس سے آخرت کی حسنہ میں رتی بھر بھی فرق آتا ہو بلکہ حسنۂ دنیا وہی ہے جو انجام کے اعتبار سے عین حسنۂ آخرت ہو، نہ صرف قرآن ہی میں دوسرے مقامات پر حسنۂ دنیا کو اسی معنی و مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً سورہ نحل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً یعنی ہم نے ان کو دنیا میں حسنہ عطا کیا۔ کیا حضرت ابراہیم کو قیصر و کسریٰ کی دنیوی دولت و حشمت ایک

دن کے لیئے بھی عطا ہوتی ہیں ؟ بلکہ سورۂ بقر کی خود اسی آیت ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ سے پہلے ہی ان لوگوں کا ذکر ہے جو آخرت سے بے پرواہ ہوکر ربنا ہی دنیا کی راحت و دولت کے حریص ہیں کہ ان کا آخرت میں مطلقاً کوئی حصہ نہ ہوگا۔ فمن الناس من یقول ربنا اتنا فی الدنیا وماله فی الآخرۃ من خلاق ۔ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن نے اس خالص دنیا طلبی کے لیئے لفظ حسنہ کا استعمال تک جائز نہیں رکھا ورنہ بظاہر ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ کا تقابل یہی چاہتا تھا کہ پہلے کی آیت میں فمن الناس من یقول ربنا اتنا فی الدنیا کے بعد بھی حسنۃ ہوتا مگر بے آخرت کی دنیا چونکہ تمام تر سیئہ یا برائی ہی ہے اس لئے اس پر حسنۃ یا بھلائی کا اطلاق ہی کیسے ہو سکتا ہے ؟

موقع کے لحاظ سے اس کا تفسیری فائدہ خود مفسر تھانوی کی تفسیر بیان القرآن سے سن لیں کہ

مفسر تھانوی کی تفسیر و تحقیق

اس آیت سے ہمارے زمانہ کے طالبین دنیا کو شبہ پڑ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طالبان دنیا کی مدح کی ہے جب کہ وہ طالب آخرت بھی ہوں اور یہ بڑی غلطی ہے کیونکہ آیت میں اتنا کا مفعول بہ (یعنی جو چیز مانگی گئی ہے) حسنہ ہے اور دنیا (محض) مفعول فیہ ہے (یعنی وہ جگہ یا ظرف جس میں حسنہ مطلوب ہے) جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا ظرف طلب (طلب کی جگہ) ہے خود مطلوب نہیں بلکہ مطلوب حسنہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ وہ لوگ اس کے

طالب ہیں کہ ہم کو دنیا میں رہتے ہوئے حسنہ یعنی وہ حالت جو
آپ کے نزدیک پسندیدہ و مستحسن ہو عنایت کی جائے اور پسندیدہ
اعمال حسنہ ہیں بس بالذات وہی مطلوب ہوتے۔

رہا دنیا کا مال و متاع تو اس حسنہ میں صرف وہی اور اسی حد تک داخل ہوگا جس
کو اور جس حد تک اعمال حسنہ میں دخل ہو، اسی کو ارشاد ہے کہ

اور دنیا کے جس قدر حصہ کو ان اعمال میں دخل ہے خواہ وہ مال ہو
یا صحت و غیرہ جو کچھ بھی ہو) وہ البتہ اس حسنہ کے تابع ہو کر بالعرض
و بالغیر مطلوب ہو جائے گا۔

خلاصہ وہی ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی آخرت سے قطع نظر کر کے محض دنیاوی
نفع و راحت کے لحاظ سے قرآن و اسلام کی رو سے کوئی حسنہ یا خیر و خوبی کی چیز
ہی نہیں۔

بخلاف اس وقت کی تعلیم و طرز عمل کے جس میں دنیا کو مطلوب
بالذات اور آخرت کو محض برائے نام قرار دے رکھا ہے"

بلکہ اب تو نام بھی غائب ہے اور پورے قرآن کی تفسیریں ایسی ایسی بے محابا
ہونے لگی ہیں کہ قرآن گویا بالکلیہ دنیا ہی کی دولت و حکومت اور عیش و عشرت کی
دعوت لے کر آیا ہے ایسے مفسرین سے تو کچھ کہنا ہی نہیں۔ ورنہ جہاں تک نفس
اس آیت کا تعلق ہے دنیا کی کسی درجہ میں بھی بالذات مطلوبیت کو

مباح شرعی مطلوب شرعی نہیں

حاشا و کلا اس آیت سے (ادنیٰ
لگاؤ) بھی نہیں، غایت ما فی الباب (زیادہ سے زیادہ) اگر طلب دنیا
میں حلال و حرام کی حدود توڑی نہ جائیں، تو اباحت (محض جواز)

کا حکم کردیا جائے گا۔ لیکن مباح شرعی سے مطلوبِ شرعی ہونا لازم نہیں آتا۔ خوب سمجھ لو۔

کسب حلال کا مطلب بھی دنیا طلبی نہیں

جس طرح قرآن کی اس آیت۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً کو بالذات دنیا کی مطلوبیت سے مس بھی نہیں اسی طرح کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ کی سی حدیثوں کو بھی بالذات معاش یا دنیا کے کسب و تعلیم کی ترغیب و تعلیم سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، جیسا کہ معاشیاتِ انفاق کے باب میں پوری طرح واضح ہو چکا بلکہ اصل مقصود کسب حلال پر زور دینا ہے کہ آدمی دنیا کو بالذات مطلوب بنا کر معاش میں حلال و حرام کی تمیز اور حدود سے نہ نکل جائے آگے مجدد وقت ہی کا ارشاد ہے کہ:۔

کسبِ دنیا اور طلبِ دنیا میں فرق و تعلق

میں کسب حلال سے منع نہیں کرتا کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ تو حدیث ہے کسب حلال تو فرض ہے ہاں حب دنیا سے منع کیا جاتا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَةٍ۔ صاحبو! ایک تو ہے کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا، کسب دنیا جائز اور بعض مواقع پر واجب و فرض بھی ہے اور حُبِّ[1] دنیا حرام ہے اور ان میں باہم

---

[1] مراد وہی دنیا یا معاش کو معاد سے قطع نظر کر کے بالذات مطلوب و محبوب بنانا ہے ورنہ مال و دنیا کی نفس محبت تو خود قرآن کی رو سے طبعی اور خداداد ہے تفصیل اپنے موقع پر گذر چکی "

تلازم نہیں نہ کسب دنیا کے لئے حب لازم اور نہ حب دنیا کے لئے کسب دنیا لازم "

دونوں میں تلازم نہیں

حب دنیا اور کسب دنیا میں تلازم نہ ہونے کی تفصیل بھی بڑی اہم وحکیمانہ اور یاد رکھنے والی ہے "

کیونکہ کسب دنیا اس وقت بھی ہو سکتا ہے کہ معاش حاصل کرے مگر اس کے ساتھ شغف (فریفتگی) نہ ہو ، اسی طرح حب دنیا اس وقت بھی ہو سکتی ہے کہ آدمی کمائے بھی نہیں مگر اس کے ساتھ شغف ہو مثلاً کوئی شخص دنیا نہ کماتا ہو مگر دین سے بھی غافل ہو تو اس کو حب دنیا حاصل ہے (گو منفی سہی) اور کسب دنیا حاصل نہیں ، دین سے غافل ہونا بھی حب دنیا ہے اور بعض جگہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں یعنی کسب دنیا بھی اور حب دنیا بھی ، مثلاً ایک شخص دنیا بھی کماتا ہے اور دین سے بھی غافل ہے اور بعض جگہ دونوں نہیں ہوتیں نہ کسب دنیا نہ حب دنیا ۔ مثلاً کوئی شخص کسب دنیا نہیں کرتا اور دین سے بھی غافل نہیں ۔

غرض حب دنیا اور کسب دنیا میں تلازم نہیں بعض محب ہیں کاسب نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی کاسب ہو اور محب نہ ہو

کسب دنیا بعض صورتوں میں فرض تک ہے

غرض اسلامی معاشیات کے منافی وہ حبِّ دنیا ہے جس کو جدید معاشیات والوں نے کسی نہ کسی درجہ میں دین ومعاد سے کاٹ کر بالذات محبوب ومطلوب بنا رکھا ہے ورنہ نفس

کسب دنیا وہ تو اسلام کی معاشی تعلیمات کی رو سے
بعض قیود کے ساتھ ضروری ہے آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ شرعی
فتوے سے تجارت کرنا فرض کفایہ ہے اسی طرح زراعت بھی
فرض کفایہ ہے کیونکہ زندگی موقوف ہے ان چیزوں پر اور ضروریات
(زندگی یا) معاش کی تحصیل فرض کفایہ ہے اور فرض کفایہ یہ ہے
کہ بعض کے کرنے سے بقیہ لوگوں کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے
ورنہ سب پر فرض رہتا ہے ۔

اس لئے علماء کسب دنیا سے کیسے منع کر سکتے ہیں

اس لئے یہ خیال بالکل غلط ہے کہ علماء کسب دنیا سے منع کرتے
ہیں بھلا فرض کفایہ سے کون منع کر سکتا ہے پس محب دنیا ہونا
تو کسی کو جائز نہیں باقی کسب دنیا میں کسی قدر تفصیل ہے "

البتہ اس میں تفصیل ہے

یہ تفصیل بھی بیحد کارآمد اور عملی رہنمائی
کے لئے بڑی حکیمانہ ہے ۔

ایک وہ شخص ہے جس کو کسب دنیا ضروری ہے اور بعض وہ ہیں
جن کے لئے کسب دنیا ضروری نہیں جس شخص کو عدم کسب کی حالت
میں پریشانی ہو تو پریشانی کی حالت میں کسب دنیا ضروری ہے اس
کو چاہیئے کہ کسب دنیا ضرور کرے
ایک وہ لوگ ہیں کہ ان کے دنیا میں مشغول نہ ہونے سے کسی
کا ضرر نہیں نہ خود ان کا نہ اہل وعیال کا سو یہ لوگ اگر کسب دنیا

نہ کریں تو کچھ حرج نہیں خصوص ایسی حالت میں کہ اگر وہ دنیا میں
مشغول ہوں تو دین کی خدمت نہ کر سکیں ان کے لئے کسب دنیا
مناسب نہیں بشرطیکہ تشویش میں نہ پڑیں اللہ کے ایسے بندے
ہر زمانہ میں ہوتے ہیں (صفحہ ۲۹)

اور یہی بندے حضرات انبیاء کے صحیح وارث ہیں کہ بالعموم انبیاء علیہم
السلام کی زندگی بالکلیہ دین کی دعوت و خدمت ہی کے لئے وقف رہی ہے
مگر بعض نا سمجھ یا جاہل
ایسے حضرات پر طعن کرتے ہیں حالانکہ یہ مسئلہ عقلی بھی ہے ..
جو بالکل مذاق جدید کے موافق ہے وہ یہ کہ سرکاری قانون ہے
کہ جو شخص سرکاری ملازم ہو اس کو دوسرا کوئی کام تجارت وغیرہ
کرنا منع ہے ...... اس میں حکمت یہ ہے کہ ایک شخص دو طرف
پورا متوجہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ملازم سرکار دوسرا کام کرے گا تو ضرور سرکاری
کام میں خلل ہوگا اسی لئے اس کو اجازت نہیں کہ بحالت ملازمت
دوسرا کام کرے "(خیر المال صفحہ ۳۰)

پہاڑ کے مقابلہ میں تنکے کا مسئلہ خلاصہ یہ کہ زندگی کے ایک پلڑے
میں اگر معاش کو رکھا جائے اور دوسرے میں معاد کو تو معاش کا وزن اتنا حقیر
ہو جاتا ہے کہ پہاڑ کے مقابلہ میں تنکے کا مسئلہ بھی نہیں رہتا اور اس کو بذات
خود کوئی مسئلہ و مشکل قرار دینے کے معنی خود مسئلہ اور مشکل کے لفظ کو
بے وزن بنا دینے کے ہیں ہزاروں سال کی زندگی کے مقابلہ میں ایک سیکنڈ یا
پل بھر کی زندگی کے بناؤ بگاڑ کے مسائل کی جو بساط ہو سکتی ہے اتنی بھی تو آخرت

کی نہ ختم ہونے والی ابدی اور غیر فانی زندگی کے سامنے ساٹھ ستر برس کی کیا سو دوسو یا عمر نوح ؑ کی بھی تو نہیں کہ بذات خود اس کے کسی مسئلہ ومشکل کو ئی مسئلہ ومشکل کہا جا سکے اسلام کی نظر میں تو دنیا کی اس زندگی کے وہی مسائل مسائل ہیں جن کا دامن بواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی درجہ میں دین یا آخرت سے بندھا ہو، خدا و آخرت کے ایمان کو درمیان سے نکال دینے کے بعد میں بالکل عقلی طور پر پوچھتا ہوں کہ آدم کے بچوں کے مرنے جینے کا کوئی مسئلہ آخر کس بنیاد پر مکھیوں مچھروں یا حشرات الارض کے لاکھوں کروڑوں کی ان گنت تعداد میں ہر وقت مرتے جیتے رہنے کے مسئلہ سے زیادہ کیا رہ جاتا ہے، خس کم جہاں پاک!

معاش کا سب سے پہلا ایمانی حل یہ تو معاشی مسائل ومشکلات کا سب سے پہلا ایمانی و اسلامی حل ہوا کہ دنیا کی فانی زندگی کو آخرت کی غیر فانی زندگی یا معاش کو معاد کے ساتھ جوڑ دینے اور بالکلیہ اس کے تابع وماتحت کر دینے کی صورت میں معاشی مسائل ومشکلات اس معنی میں اور اس حد تک سرے سے مسائل ومشکلات ہی نہیں رہتے جس معنی میں اور جس حد تک غیر معادی معاشیات نے ان کو سمجھ اور بنا رکھا ہے

اس کے بعد جو کچھ بھی تھوڑی بہت حیثیت ان کی ایسی بھی جاتی ہو جن پر مسائل ومشکلات کا اطلاق ہو سکتا ہو ان کا سب سے مضبوط و مستحکم اسلامی حل وہی ہے جو کتاب کے اولین باب "معاشیات عبدیت" کی زیب عنوان خود آیات قرآن میں منصوص ہے کہ انسان کو محض عبدیت وعبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ اپنے یا دوسروں کے رزقی یا معاشی مسائل ومشکلات کے حل کے لئے، اس کا ذمہ تو قطعیت وانحصار کے ساتھ رزق رسانی کی سب سے مضبوط

و پختہ قوت رکھنے والے خود خدا نے اپنی ذات پر لے رکھا ہے اور پھر قرآن ہی میں جا بجا آگاہ فرمایا گیا کہ رزق و معاش میں کمی و زیادتی، فراخی و تنگی و بسط و قدر بالکلیہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے اور اسی کی بندہ پرورانہ مشیت پر مبنی ہے یبسط الرزق لمن یشآء و یقدر و اللہ بصیر بالعباد اور حدیث میں یہاں تک آتا ہے کہ جس شخص کے لئے کم یا زیادہ جتنا بھی رزق مقرر و مقدر کر دیا گیا ہے جب تک اس کا ایک ایک دانہ پورا نہ کر لے کسی طرح مر ہی نہیں سکتا تو اب کسی فرد کے فاقہ سے مرنے کی اس کے سوا صورت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ دوسری بیماری آزاری کی طرح اس کی موت کا ظاہری سبب یا حیلہ خود فاقہ ہی کو بنا دیا گیا ہو

انسان ہی نہیں ساری مخلوقات کی پرورش کی ذمہ داری خدا پر

اسلامی تعلیم کی رو سے ساری مخلوقات کا تعلق اپنے خالق سے عبد و رب یا بندہ و بندہ پرور کا ہے، بندہ یا غلام کا کام صرف بندگی اور طاعت و عبدیت ہے باقی بندہ پروری یا ربوبیت یعنی بندہ کی واجبی حاجتوں اور ضرورتوں کو برابر پوری کرتے رہنا یہ ذمہ داری تمام تر رب العالمین یا مخلوقات کے سارے بیشمار عوالم کے پروردگار عالم ہی کی ہے انسان سے نیچے کی جمادی و حیوانی مخلوقات اپنی بندگی کے فرائض و واجبات غیر فکری فطرت و جبلت کی رہنمائی میں ادا کرتی ہے اور ان کی پرورش و ربوبیت بلا ان کے فکری و شعوری ارادہ و اختیار پر مبنی تدابیر کے ہوتی رہتی ہے۔

البتہ انسان کو زمین پر چونکہ خدا کے خلیفہ و امین کا منصب دے کر پیدا

ؔ وما خلقت الجن والانس الالیعبدون ۔ الآیۃ

کیا گیا ہے اس لئے لازم تھا کہ خلافت و امانت کے فرائض منصبی کی ادائی کے بقدر اس کو ارادہ کی آزادی واختیار بھی عطا ہو اور اسی آزادی ارادہ واختیار سے وہ اپنی دنیوی زندگی یا معاشی حاجتوں کی سربراہی میں کام لے مگر خلیفہ و بندہ رہ کر نہ کہ خدا بن کر۔ آگے جس طرح آقا و مالک کو یہ حق ہے کہ غلام کی استعداد و استطاعت کے موافق چاہے تو اس کے سپرد ایسا کام کرے جس سے خود غلام کی کوئی حاجت و ضرورت قطعاً نہ پوری ہوتی ہو مثلاً یہ کہ پاؤں دابتے رہو، پنکھا جھلتے رہو، یا سرے سے کوئی کام نہ کرو بس ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہو، اسی طرح مالک کو یہ حق بھی ہے کہ کوئی ایسی خدمت حوالہ کر دے جس سے خود غلام کی بھی کوئی حاجت پوری ہو سکتی ہو مثلاً کسی تجارت یا زراعت کے کام میں لگا دے اور اسی کی آمدنی و پیداوار سے خود اس کے کھانے کپڑے وغیرہ کی ضرورتوں کو پورا کر دے مگر اس کا مطلب یہ نہ ہو گا کہ دوکانداری یا کھیتی باڑی کے اس کام کے بغیر وہ غلام کو ننگا بھوکا رکھتا، غلام کا پیٹ بھرنا اور تن ڈھکنا تو بہر حال آقا کی ذمہ داری ہے چاہے کسی ارضی وسماوی آفت کی بدولت کھیت میں ایک دانہ بھی پیدا نہ ہو اور دکان سے ایک پیسہ کی آمدنی بھی نہ ہو، ہاں اگر اس میں خود غلام کی کسی ارادی واختیاری غفلت و کوتاہی کو دخل ہے تو اس کی سزا و تنبیہ میں کچھ فاقے بھی غلام کو کرا دیئے جا سکتے ہیں جس کی وجہ واجبات بندگی میں قصور ہو گا۔ نہ یہ کہ آقا کی قدرت میں غلام کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے کا کوئی دوسرا ذریعہ بجز اس کے نہ تھا ہی نہیں کہ وہ خود اپنی سعی و تدبیر سے کچھ نہ کچھ پیدا کرے اور اسی سے اپنی ضرورتوں کو پورا کرے، غلام تو اگر سرے سے اپاہج اور ناکارہ ہو یا وقتی طور پر بیمار و معذور ہو جائے تو بھی آقا آقارہ کر

اس کے حوائج زندگی کی تکمیل سے ایک دن بھی کیسے سبکدوش رہ سکتا ہے
غرض اسلام نے خدا و بندہ میں جو تعلق قرار دیا ہے اس کے تحت جس طرح بندہ کی ذمہ داری بے چون وچرا بندگی و فرمانبرداری ہے اسی طرح خدا کی ذمہ داری ہر حال میں بندہ پروری و روزی رسانی ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے کہ خود بندہ پروری ہی کی کسی حکمت و مصلحت سے فاقہ کشی بھی کرا دے جیسے طبیب مریض کو کرا دیتا ہے یا بندگی ہی کے درجات بلند کرنے اور وفاداری کی آزمائش کے لئے بھٹی میں ڈال دے کہ سونا کھرا اور کندن ہو جائے کما قال وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ، یعنی ہم تم کو خوف فقر و فاقہ اور جان و مال کی کچھ نہ کچھ آزمائش میں ضرور ڈالیں گے ۔

ذوالقوۃ المتین کی بے خطا رزاقی معمولی سے معمولی آدمی بھی جب کسی دوسرے آدمی کیا جانور تک کو اپنی کسی ہمہ وقتی خدمت میں لگاتا ہے تو اس کے تن پیٹ یا دانے چارے کی ذمہ داری پہلے سے لینا پڑتی ہے ، کاشتکار بیل کے کندھوں پر اگر ہل کا بوجھ رکھتا ہے تو اس کے کھانے پینے کی پوری خبر گیری کا بوجھ خود اٹھاتا ہے چاہے خود اس بیل کے جوتے ہوئے کھیت کی پیداوار سے کھلائے یا بازار سے خرید کر ، کسی نہ کسی طرح بیل کا پیٹ بھرنا اپنے ہی ذمہ جانتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ پوری کائنات کے پالنے والے رب العالمین نے ایک طرف تو انسان کے کندھوں پر زمین و آسمان اور پہاڑوں کی برداشت سے باہر اختیاری عبدیت کا جوا رکھا ہو اور دوسری طرف اس کے معاشی مسئلہ یا رزق کی پوری پوری ذمہ داری اور قطعی ضمانت خود نہ فرمالی ہو جہاں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ

وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ٥ انسان کی پیدائش کی غرض وغایت کو بالکلیہ عبدیت وبندگی میں منحصر فرمادیا وہیں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کس قوت کے ساتھ واضح فرمادیا کہ اس پر ہیں نے معاشی مسائل ومشکلات کے حل کی ذمہ داری قطعاً نہیں ڈالی ہے - مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ - معاشی مسائل ومشکلات انفرادی واجتماعی سب کا پورا پورا ضامن تو خود خدا ہے هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ - ذوالقوۃ المتین کی صفت کا اضافہ فرماکر اس سے بھی مطمئن کردیا کہ خدا کی رزق رسانی کی قوت وقدرت نہایت درجہ مضبوط ومحکم اور بے خطا ہے

مدعیان رزاقیت کی پھس پھسی رزاقی آج کل کے مدعیان رزاقیت کی طرح پھس پھسی نہیں، مثلاً ۵-۶ سال مسلسل خود ہمارے ہندوستان میں مرکز اور ریاستوں کی ساری حکومتیں اپنی پوری قوتوں کے ساتھ زیادہ اگاؤ زیادہ اگاؤ " کے شور وغل اور تدبیروں میں لگی رہیں اربوں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا غذا کی وزارتوں پہ وزارتیں بدلتی رہیں خدا خدا کرکے نئے وزیر غذا[1] جو ماشاء اللہ سیاسیات حاضرہ کے خاموش مگر بڑے عملی ماہر وشاطر ہیں غذائی وزارت کا قلمدان کہنا چاہئے کہ سنبھالتے ہی پیداوار کے بہتر اور اطمینان بخش ہونے کا اعلان شروع کردیا اور تازہ خبر یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کی خریف کی پیداوار میں

---

[1] رفیع احمد صاحب قدوائی، مدعیان رزاقیت کی تدابیر پھس پھسی نہیں خود غریب وزیر باتدبیر کی زندگی بھی کیسی پھس پھسی کہ اس بیضہ کی نظر ثانی کے وقت وفات ہوچکی اور وہ بھی ایسی آناً فاناً کہ ڈاکٹروں کو اپنی تدابیر کی مہلت تک نہ ملی (انا للہ وانا الیہ راجعون) بس نام رہے اللہ کا۔

سرکاری اعداد و شمار کی رو سے چالیس لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا ہے

اس رزاقی کا تماشہ ساتھ ہی دوسری طرف حکمران جماعت ۔ کانگریس ۔ کا ایک مؤقر روزنامہ ۔ لکھنؤ کا نیشنل ہیرلڈ، اس خوشخبری پر رائے زنی کرتے ہوتے لکھتا ہے کہ غذائی مسئلہ کے ختم ہونے کی یہ ایک خوش آئند علامت ہے ، آگے سننے سنانے کے لائق یہ "لیکن" ہے کہ

"لیکن یہ نازک سوال بدستور اپنی جگہ بدستور باقی رہتا ہے کہ پھر بھی ملک کے مختلف حصوں میں قلت یا کمی کا رونا کیوں برابر چلا جا رہا ہے کہا یہ جاتا ہے حال کے گذشتہ برسوں کے مقابلہ میں اناج تو واقعتاً اب ملک میں زیادہ ہے یعنی غلہ فی الواقع اتنا موجود ہے جو لوگوں کی معمولی ضرورت کو پورا کر سکے مگر لوگوں کے پاس خریدنے کو پیسہ نہیں ، یہ تو وہی پرانی کتھا ہے ، دیکھنا یہ ہے کہ ضرورت بھر کا غلہ ہو مگر خریدنے کیلئے پیسہ نہ ہو یا پیسہ ہو اور غلہ نہ ہو نتیجہ تو دونوں صورتوں میں ایک رہا ۔

یہ پیسہ یا قوت خرید کی کمی کی معاشی سے زیادہ سیاسی منطق بھی خوب ہے ایسا تو شاید ہزاروں میں ایک آدھ ہی نکلے جس کے پاس سرے سے پیسہ نہ ہو اصلی سوال تو غلہ کی گرانی کا ہی رہتا ہے پہلے آدمی کے پاس اگر دو پیسے بھی ہوتے تھے تو موٹے جھوٹے اناج سے ایک دو وقت پیٹ بھر لیتا تھا ۔ اب دو چار آنے میں بھی ایک وقت پیٹ کی آگ بجھانا دشوار ہے لہٰذا بڑا مسئلہ تو وہی واقعی یا مصنوعی کمی و گرانی ہی کا رہا ، ورنہ پھر اناج سیر دو سیر فی روپیہ کی جگہ چھٹانک دو چھٹانک یا تولہ دو تولہ ہی ملنے لگے تو بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ اناج کی کمی نہیں قوت خرید کی

کمی ہے یعنی خریدار کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ دس بیس یا سو پچاس روپیہ کے حساب سے روزانہ سیر دو سیر خرید کر خود اپنے اور بال بچوں کی قبرِ شکم کو پاٹ سکے۔

الفاظ کی بازی گری درحقیقت موجودہ سیاسیات خصوصاً سیاسی معاشیات نام ہی اس طرح کی عوام فریب لفاظیوں یا الفاظ کی بازی گریوں کا رہ گیا ہے ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے یہ بازی گر یا لیڈر و منسٹر اتنے بھولے ہیں کہ اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے ہاں عوام کو احمق بنا بنا کر اپنی منسٹری، لیڈری کی خیر منانے رہنے کی بات اور ہے، اور کیا عجب ہے کہ اسی خاطر اب سرکاری پروپیگنڈہ کی منطق یا اعداد و شمار کی زبان بدل گئی ہو۔ مصلحتِ خویش خسرواں دانند
کچھ اسی زبان کی ایک اور روایت اخباروں ہیں یہ آئی کہ اس مئی (۵۳ء) کے مہینہ میں خلاف توقع بیکاروں کی تعداد میں اور اضافہ ہوا ہے یعنی گذشتہ مہینہ کے مقابلہ میں گیارہ ہزار سے زائد کا، حالانکہ اپریل کے مقابلہ میں سات سو مزید بے روزگاروں کو روزگار دلایا گیا۔ اس سے بڑھ کر سنئے کہ یہ غیر اطمینان بخش حالت اس امر کے باوجود ہے کہ ملک میں دفتروں اور فرموں میں جگہیں کچھ زیادہ خالی ہو رہی ہیں اور زیادہ تر لوگ اب امپلائمنٹ ایکسچینج (محکمہ فراہمی روزگار) سے رجوع نہیں کرتے،

ہمارے وزیر اعظم ہند بھی اپنی تقریر و خطاب کے ہر موقع پر بار بار اسی سے ڈراتے رہے کہ ملک میں بڑھتی ہوئی بیکاری اس وقت سب سے بڑا خطرہ ہے" کانگریس کمیٹی کے اجلاس آگرہ میں بھی سب سے زیادہ زور اسی خطرہ کے دور کرنے پر رہا۔ اسی کا رزولیوشن سب سے پہلے رکھا گیا غرض غلہ کی کمی کچھ کم ہوتی تو اب پیسہ کی کمی یا بیکاری و بیروزگاری کا رونا ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۵۴ء کے وسط تک آتے آتے غذائی وزارت کے اور سرکاری بیانوں میں جہاں ایک طرف مسلسل یہ خوشخبریاں دی جارہی ہیں کہ غلہ کی پیداوار اب اتنی بڑھ گئی ہے نہ صرف یہ کہ ہم باہر سے درآمد کرنے کے محتاج نہیں رہے ہیں بلکہ برآمد کرسکتے ہیں وہیں دوسری طرف کچھ دکھ کچھ ہنسی کا تماشہ یہ دیکھئے کہ اناج کا بازار چند دن سے ذرا مندا پڑ گیا ہے یعنی جس ملک میں زیادہ نہیں ابھی دس بارہ سال پہلے تک مثلاً گیہوں روپیہ کا ۱۵-۱۶ سیر ملتا تھا اب بجائے سوا دو ڈھائی سیر کے تین ساڑھے تین سیر کا ہو گیا تو کیا شور اٹھا ہے کہ کاشتکار تباہ و برباد ہو جائے گا، کونسلوں میں سوالات پر سوالات ہو رہے ہیں کہ حکومت غلہ کی اس ارزانی کو روکنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کر رہی ہے جواب دیا جارہا ہے کہ حکومت خطرہ سے پوری طرح ہوشیار ہے اور نرخ اب زیادہ نہ گرنے دیا جائے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انسان کی معاشی تدبیروں کا عبرتناک سبق انسان کی بھس بھسی معاشی تدبیروں کا یہ کیسا عبرت آموز سبق ہے کہ جس ملک میں ابھی زیادہ نہیں کل دس بارہ سال پہلے یہی گیہوں گلی گلی ۱۵-۱۶ سیر کا بکتا پھرتا تھا وہ اگر دو ڈھائی سیر کی جگہ تین ساڑھے تین سیر کا ہو گیا تو یہ نام نہاد ارزانی کا رجحان خداوندانِ تدبیر کے لئے ایک نیا مسئلہ بن گیا ہے، اہل تدبیر کی یہ دانشمندگیاں دیکھ کر ہر تو ششدر ہی رہ گیا کہ کل تک جو چیز عین مطلوب تھی اور جس کے لئے حکومت اربوں روپیہ خرچ کر رہی تھی کہ غلہ کچھ سستا ہو جاتے وہی عین مصیبت بتائی جارہی ہے ایک پرزہ درست ہوا تو دوسرا بگڑ گیا دوسرا ٹھیک ہوا تو تیسرا ڈھیلا ہو گیا

غلہ کی پیداوار کچھ بڑھی، پیسہ کی کمی یا بیکاری یا بیروزگاری کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اس کا حل ابھی نکلا نہ تھا کہ غلہ کی گرانی کے بجائے اس کی نام نہاد ارزانی کا شور مصیبت کانوں میں گونجنے لگا۔[1]

---

[1] ارزانی کی اس مصیبت یا مسرت پر ابھی چند ہفتے ہی گذرے ہوں گے کہ سال رواں ۵۳ء کی برسات نے ہندوستان و پاکستان دونوں کی رزاقیت کے خدائی دعووں پر خدا نے ایسی کاری ضرب لگائی کہ خالی شمالی ہندوستان کے متعلق اخباری خبر یہ ہے کہ چالیس کروڑ کی فصلیں تباہ ہو گئیں ۲۵۶۵۰ مربع میل زمین زیر آب ہے اور سیلابوں کو روکنے کے لئے ایک ارب روپیہ کی لاگت کا تخمینہ ہے" ۱۔ ریجئے ابھی مسودہ کی نظر ثانی ہی ہو رہی ہے اور اوپر کی سطروں کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوئی کہ یو۔ پی۔ کے سرکاری اخبار (نیشنل ہیرلڈ ۶ ار جنوری ۵۵ء) میں بڑی موٹی سرخی یہ ہے کہ پیداوار کی زیادتی نے سرکار اور کاشتکار دونوں کے سامنے ایک مصیبت لا کھڑی کی ہے"۔ خلاصہ اس نئی مصیبت کا یہ بتایا گیا ہے کہ ربیع کی پیداوار پچھلے چند سالوں کے دیکھتے اس فصل میں اتنی زیادہ ہوئی ہے کہ غلہ کی قیمت گر جانے کا سخت اندیشہ ہے جو مرکزی و ریاستی سب حکومتوں کے لئے خوفناک پریشانی کا باعث ہو رہا ہے وجہ پیداوار کی زیادتی کی یہ ہے کہ اس مرتبہ اکتوبر نومبر کی بارش بہت موقعہ سے اور پیداوار کے حق میں بہت مفید رہی .... ماہرین کا کہنا ہے کہ اس بارش نے ژالہ باری اور پالے کے امکان کو بھی دور کر دیا ہے اور ریاستی حکومت کو کاشتکاروں کی مدد کے لئے اعلان کر دینا پڑا ہے کہ گیہوں کی قیمت اگر دس روپیہ من (یعنی روپیہ کے چار سیر) سے زیادہ نہ گرنے دی جائے گی اس اعلان سے غلہ کا بازار اگرچہ چڑھ گیا ہے لیکن گذشتہ دو دن کی بارش سرما اور افراط پیداوار کی توقعات بڑھ جانے کا اثر یقیناً بازار پر پڑے گا اور حکومت کو لامحالہ مداخلت کرنا پڑے گی۔

دیکھا آپ نے انسان کی معاشی تدابیر اور منصوبہ بازیوں کی یہ قلابازیاں کہ ارضی و سماوی سیلاب

(برصفحہ آئندہ)

گھر کے بعد ذرا پڑوس کا حال بھی پیش نظر ہے کہا اور سنا جاتا تھا کہ ہندوستان کے غلہ کی جو کٹھاریا گودام (گرہ سیزری) تھا وہ تو تقسیم کی بدولت پاکستان کے حصہ میں پڑ گیا اور واقعی دو برس قبل (۵۱ء میں) اپنی آنکھوں سے راقم ہذا دیکھ کر آیا تھا کہ کمی کا کوئی دکھ دکھڑا نہ تھا۔ کہ اب اچانک وہاں بھی کمی و گرانی کا واویلا مچ گیا حقیقت حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن اتنا ہر اخبار بیں جانتا ہے کہ نئی دنیا (امریکہ) کے ناخداؤں اور غریب پرسدوں کو پاکستان کے حال زار پر مہربانی اور توجہ فرمائی کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس واویلا نے بہترین موقع فراہم کر دیا ہے

ہوئے تم دوست جس کے — دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ایمان کے دل و دماغ سے سوچا جائے تو رزق و معاش ہی کا مسئلہ روزانہ کی زندگی کا ایسا مسئلہ ہے جس کی بدولت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت یا پروردگاری کی

بقیہ حاشیہ صہ ۴۶۲) اور پالے وغیرہ کی آفات تو آفات ہی ہیں لیکن قدرت اگر ایک طرف ان آفات سے حفاظت کے ساتھ دوسری طرف حسب موقع بارش سے پیداوار اور کاشتکار کو نہال اور مالا مال بھی کر دے تو گرانی کے بجائے ارزانی کی نئی مصیبت آ کھڑی ہوتی ہے، غرض کاشتکار کے ووٹوں پر توجہ چونکہ سرکار کے دربار کی رونق کا مدار ہے اس لئے اس کو تو ہر حال میں راضی رکھنا جمہوری سرکار کا مقدم فرض ہے ہی۔ رہا غلہ کا غریب صارف یا خریدار کو اس کو پیداوار کی فراوانی سے متمتع ہونے کا حق ہی کیا۔ لیجئے جمہوری سرکار اور اس کے ووٹر کاشتکار دونوں کو مبارک ہو کہ کتاب کے پروف آتے آتے ۵۵ء کی جولائی ہی میں گیہوں کی قیمت پھر وہی روپیہ کے ڈھائی پونے تین سیر تک چڑھ گئی۔ کس قدر مضحکہ خیز بلکہ غصہ انگیز یہ معاشی منصوبہ بازیاں یا سیاسی چال بازیاں بھی ہیں "

شان پر اس کے بندوں کی نظر سب سے زیادہ پڑ سکتی ہے اور عبد و رب یا بندہ و خدا کا تعلق زیادہ بیدار و استوار ہو سکتا ہے ایک تازہ تجربہ سنئے۔

ایک تازہ تجربہ لکھنؤ کے جس محلہ میں ۲۵ سال سے آباد ہوں یہاں سواریوں یکوں، تانگوں، رکشوں، کا قریب اڈہ ڈالی گنج ہے جہاں سوار ہونے یا گذرنے کی نوبت ہزاروں مرتبہ آئی ہو گی اور شاذ و نادر ہی کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہو گا کہ اڈہ پر ہر قسم کی سواریاں افراط سے کھڑی اور خالی نہ ملتی رہتی ہوں بہت کم ایسا ہوا ہو گا کہ اگر خود سواری پوری نہیں کرنا ہے تو باقی دوسری تیسری چوتھی سواری کے لئے کافی دیر انتظار نہ کرنا پڑے کبھی کبھی ۱۵، ۲۰ منٹ تک لگ جائیں گے، کچھ مدت ہوئی کہ اس اڈہ سے امین آباد کی طرف سرکاری بسیں چلنے لگی ہیں خیال ہوا کہ یہاں سے کچھ چوک کی ورنہ امین آباد ہی کی سواریاں زیادہ چلتی ہیں اور وہ اتنی کہاں سے آجائیں گی کہ ہر پندرہ بیس منٹ پر بس بھی آتی جاتی ہے اور یکہ وغیرہ جن کا کرایہ بس سے زیادہ ہے ان کو بھی سواریاں ملتی رہیں یا تو بس ہی بند ہو جائے گی یا دوسری سواریاں اگر ختم نہیں تو کم بہت ہو جائیں گی۔ خود اب بھولے بسرے ہی کبھی بس کے سوا کسی دوسری سواری پر جاتا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ شام کے وقت خصوصاً بسیں اتنی کھچا کھچ بھری ہوئی آتی جاتی ہیں کہ اگر اڈہ کے سوا جہاں سے بس چلتی ہے بیچ کے کسی ٹھہراؤ پر سوار ہونا چاہو تو بعض مرتبہ کھڑے ہونے کی جگہ بھی مشکل سے ملتی یا سرے سے نہیں ملتی، اولاً تو خدا جانے ہر ۱۵/۲۰ منٹ کے بعد یہ ۵۰، ۶۰ سواریاں کہاں سے ابل پڑتی ہیں بس نکلنے سے پہلے اتنی سواریاں کہاں غائب تھیں کہ بجائے یکہ تانگہ والوں کو تین چار سواریاں کے ملنے میں بھی بارہا گھنٹوں لگ جاتے تھے پھر یکوں تانگوں کا کرایہ بس سے ایسا زیادہ نہیں کہ سستے کرایہ کی وجہ سے لوگ بس پر زیادہ چڑھنے لگے صرف دو پیسے کا فرق یعنی

بس کا کرایہ ڈیڑھ آنہ اور یکے تانگے والے اب بھی دو آنے سواری سے کم نہیں لیتے

زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ یکوں تانگوں رکشاؤں کی تعداد میں کوئی نمایاں کمی نظر آتی ہے اور نہ انہوں نے بس کے مقابلہ میں آکر اپنا کرایہ کم کیا اس کے برابر کرنا ہی گوارا کیا بدستور دو آنے ہی لے رہے ہیں، حیرت پر حیرت سب سے بڑھ کر یہ کہ میں نے خاصکر کئی یکہ تانگہ والوں سے بہت ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا کہ میاں بس چلنے کے بعد اب تمہارا کام کیا چلتا ہوگا تو یہ تو ایک نے بھی نہیں کہا کہ اب فاقہ ہوتا ہے اور بعضوں نے بلا مبالغہ یہ جواب دیئے کہ یہ (حکومت والے) تو ہم کو مار ہی ڈالنا چاہتے ہیں ساتھ ہی ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا لیکن جس نے پیدا کیا ہے اس نے تو پالنے کا ذمہ لے رکھا ہے" ایک تانگہ والے نے تو یہاں تک کہا کہ حضور جس دن سے بس چلی ہے مجھ کو تو کبھی کبھی پہلے سے کچھ پیسے زیادہ ہی مالک دلا رہا ہے

بہ ناداں چناں روزی رساند مطلب اس بالکل خلاف قیاس اور غیر معمولی تجربہ کے نقل کرنے کا اتنا ہی تھا ہے کہ رزق یا معاش کا نظام اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسا رکھا ہے کہ اگر آدمی زبردستی آنکھیں نہ بند کر لے تو ہر شخص کو خود اپنے اور پرائے بہت سے ایسے تجربات ضرور ملیں گے کہ نکات بعد از وقوع کی اور بات ہے ورنہ محض ظاہری اسباب و تدبیروں سے توجیہ دشوار ہو جاتی ہے بارہا علانیہ دیکھنے میں آتا ہے کہ

بہ ناداں چناں روزی رساند ۔ کہ دانا اندرو حیران بماند

خود اس ناداں کا تو تجربات ہی کی بناء پر یہ وجدان ہو گیا ہے کہ رزق و معاش کے معاملہ میں ظاہری اسباب و تدابیر پر بہت زیادہ زور و اعتماد خدا کو پسند نہیں الا

الّا کہ کسی فرد یا جماعت کے لئے اس میں تمہیل و استدراج ہی کی کوئی حکمت ہو
اور اس کی بغاوت کو اسباب پرستی ہی کی راہ سے ڈھیل دینا منظور ہو، ورنہ معاشی
معاملات میں بہ نادان چناں روزی رساند کا بڑا نفع یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان معاملات
کا چونکہ ہماری دن رات کی احتیاجات سے تعلق ہے اس لئے رب العالمین کی
ربوبیت اور پروردگاری سے ایاک نعبد و ایاک نستعین والی خاص توحیدی
عبادت و استعانت کا تعلق و ربط پیدا کرنے اور اس کو زندہ بیدار رکھنے کا ذریعہ
اس سے بڑھ کر کوئی نہیں کہ معاشی تنگی و کشادگی یا البسط و قدر میں ناگزیر اسباب کے
ساتھ ساتھ مسبب الاسباب کی طرف نظر اٹھتی اور مڑتی ہے

معاشی فسادات کا سب سے بڑا سرچشمہ

اور اسی بناء پر اشتراکیوں کی سی
آج کل کی سرے سے منکر خدا یا عملاً منکر لادینی حکومتوں نے
جس طرح ھو الرزاق ذو القوۃ المتین یا خدا کو درمیان سے نکال کر خود خدا
یا رزاق مطلق بن بیٹھی ہیں وہ نہ صرف قطعاً غیر اسلامی معاشیات ہے بلکہ راقم
احقر کی نظر میں تو معاشی فسادات سب سے بڑا سرچشمہ ہے اگر یہی زراعت و تجارت
صنعت و حرفت وغیرہ ذرائع معاش کو انفرادی و اجتماعی قومی و بین الاقوامی طور
پر زیادہ سے زیادہ آزاد کر دیا جاتے اور پابندیاں کم سے کم بالکل ناگزیر درجہ تک
محدود رکھی جائیں تو انشاء اللہ دو ڈھائی ارب انسانوں کو بھی اسی طرح بے غل
وغش کھانے پینے کو ملتا رہے گا جس طرح اربوں کیا کھربوں بے حد و بیشمار دیگر حیوانی
مخلوقات کو ملتا رہتا ہے زیادہ حساب و کتاب یا اعداد و شمار پر اعتماد و اللہ
یرزق من یشاء بغیر حساب والے رزاق کی معاشی پالیسی (مشیت) کے
قطعاً خلاف معلوم ہوتا ہے۔

دل کی ٹیس

میں قلم ذرا بہک گیا۔ کہا یہ جارہا تھا کہ معاشی مسائل و مشکلات کے اسلام کی نگاہ میں مسائل و مشکلات نہ ہونے کی بڑی وجہ دوسری یہ ہے کہ معاشی ضرورتوں کی تکمیل کا دارومدار انسانوں کی سی انفرادی و اجتماعی پھس پھسی اور کمزور کوششوں پر صرف ظاہری حد تک ہے ورنہ در اصل ان کی ذمہ داری ایسی مضبوط و مستحکم طاقت و قوت والے نے لے رکھی ہے جس میں مجال نہیں کہ کوئی رخنہ و فتور راہ پا سکے "متین" کے معنی ہی ٹھوس کارگر، بالغ القوہ" یعنی اللہ تعالیٰ کی رزق رسانی کی قوت ایسی کارگر ہے جس میں تخلف کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا خود کتاب اسلام کی صریح و منصوص تعلیم کی رو سے معاشی مسائل نفس معاشی اعتبار سے سرے سے حل طلب مسائل ہی نہیں۔

تدابیر معاش کی اجازت عبدیت کی ترقی کے لئے

اور جس درجہ میں ہیں ان کی بھی اساسی نوعیت وہی ہے کہ معاش کے کسب و تحصیل کے اسباب و تدابیر اختیار کرنے کا جو کچھ بھی حکم و اجازت ہے وہ اسی لئے کہ اس راہ سے انسان کی خلافتی فطرت یا اختیاری عبدیت کی ترقی و تکمیل مقصود ہے ورنہ جس طرح دوسری بیشمار انواع و اقسام کی حیوانی مخلوقات بلا اختیاری تدابیر و تجاویز یا منصوبہ بازیوں کے محض جبلی طور پر اپنا پیٹ بھرتی رہتی ہیں اسی طرح انسان کو بھی جس کی تعداد دیگر انواع حیوانات کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے کسب معاش کے اسی عام جبلی راستہ پر لگا دیا گیا ہوتا۔ جس سے تمام دیگر حیوانات اپنی معاشی حاجتوں کو پورا کرتے رہتے ہیں اس کو انفرادی و اجتماعی طور پر اپنی معیشت کے کسب و حصول اور اس کے لئے نت نئی تدابیر و اسباب کے اختیار کرنے یا نئے نئے

نظریات اور دعوتیں (آئیڈیالوجیاں) بناتے بگاڑتے رہنے اور عمر بھر اس ادھیڑ بن میں لگے رہنے کی مصیبت میں آخر ڈالا ہی کیوں گیا؟

جواب ایک ہی ہو سکتا ہے کہ زندگی رکھنے والی بے شمار انواع اور ہر نوع کے اربوں کھربوں افراد کی تعداد کے مقابلہ میں انسانوں کی کل دو ڈھائی ارب جو کچھ بھی مردم شماری ہو اس کے لئے معاش کی یہ بالکل انوکھی اور استثنائی صورت ضرور انسان کی کسی انوکھی یا استثنائی خلقت و فطرت ہی کا نتیجہ ہے جس کو قرآن نے خود انسان کے پیدا کرنے والے خدا کی روحانی (نفخت فیہ من روحی) یا خلافتی و اماناتی فطرت و خلقت سے تعبیر کیا ہے لہٰذا اسلامی معاشیات کا مدعا معاش کی اس غیر حیوانی انوکھی راہ سے بھی دراصل انسان کی انسانیت یا اس کی روحانی و خلافتی فطرت ہی کو آگے بڑھانا ہے نہ کہ جانوروں کی طرح صرف پیٹ بھر دینا۔

اسلامی حکومت کی ذمہ داری البتہ زندہ رہے بغیر چونکہ انسان اپنی زندگی کے مدعا کو بھی کیسے آگے بڑھا سکتا یا خلافت و عبدیت کے مطالبات کی تکمیل ہی کیسے کر سکتا ہے اس لئے معاشی مساوات کے دعوے و دعایت کے بغیر بقدر زیست و کارکردگی سب کی ضروریات زیست کا اہتمام و انتظام یہ اسلامی معاشیات و سیاسیات اور اسلامی حکومت کی بھی ذمہ داری ہے اسی کا لحاظ اسلام نے اپنی معاشی تعلیمات و ہدایات میں بھی رکھا ہے کہ فقر و غنا یا امیری و غریبی کے درجات کو بالکلیہ مٹانے کی غیر فطری کوششوں کے بغیر تا بہ امکان ہر شہری اور ہر فرد کی واقعی و واجبی ضروریات زندگی ـــ نہ کہ فضولیات زندگی ـــ پوری ہوتی رہیں سو رنہ حکومت کا اصل فریضہ بس اتنے امن و امان اور عدل و انصاف کا

قائم رکھنا ہے کہ ہر امیر و غریب شہری کو اپنے محل و مقام کے اعتبار سے زندگی کے دوسرے دائروں کی طرح کسب و انفاق کے معاشی دائرہ میں بھی زیادہ سے زیادہ اختیار اور آزادی کے ساتھ اپنی اختیاری فطرت یا خلافت و عبدیت کی ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں نہ کہ جدید حیوانی معاشیات و سیاسیات کی طرح محض حیوانی و مادی ضرورتوں کے یکساں مواقع بالفاظ دیگر انسان کی اختیاری فطرت پر پابندیاں کم سے کم صرف اتنی ہوں کہ دوسروں کو بھی امن و امان اور عدل و انصاف کی فضا میں رہ کر اپنی اصلی فطرت یا انسانیت کی تربیت و ترقی کے بے روک ٹوک مواقع ملتے رہیں اور کلیت پرست حکومتوں کی طرف سے قدم قدم پر مداخلت کی ٹھوکریں نہ لگتی رہیں۔

امن و امان اور عدل و انصاف کی مقدم شرط دنیا کے کسی سماج کو بھی یہ امن و امان اور عدل و انصاف خالی فوج اور پولیس کی قوت یا عدالتوں پر عدالتوں کی کثرت سے ہرگز نصیب نہیں ہو سکتا نہ ہر ہر شہری کے ساتھ دن رات پولیس کو متعین کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی انسانی عدالت کسی معاملہ و مقدمہ میں پورا پورا حق معلوم کر کے آسانی سے حقدار کو پہنچا سکتی ہے اور نہ خود پولیس اور عدالت کے کارندوں ہی کی امانت و دیانت پر بھروسا کیا جا سکتا ہے خصوصًا لادینی یا نامذہبی حکومت و سیاست کے اس دور دورہ سے پہلے شاید ہی کبھی دنیا کو امن و امان اور عدل و انصاف کے خود محافظوں کی اتنی خیانتوں اور بدعنوانیوں سے سابقہ ہوا ہو، انسانی معاشرہ کو کسی معتدبہ حد تک امن و امان اور عدل و انصاف کی راہ پر چلانے کی مقدم شرط خود اس کے افراد میں نفسی و ذہنی تبدیلی پیدا کرنا یا قانون سازی سے کہیں زیادہ افراد سازی و انسان سازی ہے۔

ذہنی انقلاب زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ایمان اور عمل صالح کی اسلامی تعلیمات کا اصل زور معاشی شعبہ میں بھی افراد کے ذہنی و باطنی انقلاب ہی پر ہے اس انقلاب کا ایمانی عنصر سب سے پہلا تو وہی ہے کہ معاد سے قطع نظر کر کے غیر معادی معاشیات کی طرح نہ معاش یا دنیا بالذات مطلوب ہے نہ اس کا کوئی مسئلہ مسئلہ ہے رزق معاش کے ظاہری اسباب محض ظاہری ہیں اصلی رزاق وہی مسبب الاسباب ذوالقوۃ المتین ذات ہے جس نے انسان ہی نہیں زمین پر چلنے بسنے والے ہر جاندار کی پوری پوری رزقی و معاشی ضمانت لے رکھی ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ آخرت کی ابدی زندگی کے مقابل میں دنیا کی فانی زندگی کے مسائل و مشکلات کی بے بساطی و حقارت ہی کو واضح کرنے کے لئے تو جگہ جگہ کثرت سے خود قرآن میں دنیوی زندگی اور اس کے ساز و سامان کو "متاع قلیل" یا حقیر اور بے بساط ہی کہا گیا ہے۔ اور بعض مقامات پر جس طرح ایک طرف رزق و معاش کی تنگی و کشادگی کا بالکلیہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ہاتھ میں ہونا جتلایا گیا ساتھ ہی دوسری طرف یہ بھی جتلا دیا گیا کہ دنیا کا مال و متاع کم ہو یا زیادہ اس پر اترانے والوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ آخرت کے مقابلہ میں یہ زیادہ سے زیادہ بھی پر بھی نہ ہونے کے برابر ہے اللہ یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر و فرحوا بالحیوۃ الدنیا وما الحیوۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا متاع۔

---

[1] راقم ہذا کے لئے تو خود اپنے اور دوسروں کے کثیر تجربات کی بنا پر الحمد للہ یہ ایک بالکل محسوس و مشاہد حقیقت بن گئی ہے کہ رزق کے معاملہ میں جہاں ظاہری اسباب و تدابیر کہنا چاہیئے کہ صد فی صد فراہم ہوتے ہیں وہاں بار ہا نتیجہ ناکامی ہوتا ہے اور جہاں یہ اسباب نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں وہاں کام بنجاتا ہے اسی طرح رزق کی برکت و بے برکتی کے بھی گھر اور باہر ایسے واقعات مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جن کی عقلی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ کچھ تفصیل ان چیزوں کی تجدید تعلیم و تبلیغ میں گذر چکی۔

خدا کی ایک طرف رزاقیت یا معاشی ضمانت اور دوسری طرف دنیا کی بے بساطی ویے مائگی کے مقابلہ میں آخرت کی زندگی اور اس کی ابدیت ان دونوں پر ایمان جتنا راسخ اور قوی ہوگا انسان اتنا ہی کم دنیا کے مال و دولت کا حریص ہوگا اور لازماً اسی قدر جعل و فریب، چوری ڈاکہ رہزنی، رشوت ستانی وبدعنوانی، ذخیرہ اندوزی و نفع بازی، ظلم و تعدی، قتل وخونریزی وغیرہ کے امن دشمن مفاسد ناپید ہوں گے یہ جرائم زیادہ تر حرص وہوس ہی کی پیداوار ہوتے ہیں جس کی بدولت آدمی مال و معاش کے حصول وکسب میں جائز و ناجائز حلال وحرام کے فرق وتمیز سے بے پرواہ ہوکر ہر بری بھلی راہ سے دوسروں کے مال ہی نہیں جان تک کا لاگو بن جاتا ہے اور معاشرہ کے امن وامان کو غارت کر دیتا ہے۔

معاشی حل کے دو خالص ایمانی عنصر

غرض (۱) جو حقیقی رزق رساں ہے اور رزق رسانی کی اسباب وبلا اسباب تدبیر وبلا تدبیر ہر طرح پوری قوت وقدرت رکھتا ہے اس کی رزاقیت یا رزقی ضمانت پر اعتماد واطمینان اور (۲) اس اطمینان واعتماد کے باوجود اگر انفرادی یا اجتماعی طور پر معاش کی کوئی وقتی تنگی وترشی یا مشکل ومصیبت پیش آئے تو اس کو معاد کی ابدی زندگی کے مقابل میں نہ صرف حقیر وبے بساط بلکہ بصیر بالعباد کی بندہ پروری کی عین حکمت ومصلحت پر مبنی جاننا یعنی خدا کی پوری پوری رزقی ومعاشی ضمانت کا اطمینان اور معاشی خوشحالی وبدحالی کے ہر حال میں معاش سے زیادہ معاد کی مصلحت ومفاد پر نظر یہ تو معاشی مسائل ومشکلات کے اسلامی حل کے دو خالص ایمانی عنصر تھے اب معاش کے مقابلہ میں معاد یا آخرت کے ابدی فوز وفلاح کی اہمیت اور خدا کی طرف سے رزقی ضمانت کے اس دوگونہ ایمانی حل ہی پر مبنی وہ تدبیری حل لیجئے ہزاروں تدبیروں کی ایک تدبیر اور سارے معاشی وسائل

واسباب سے بڑا وسیلہ وسبب خود مسبب الاسباب کی رضاجوئی وخوشنودی کی فکر وسعی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ اسی فکر وسعی کا نام قرآن کی زبان میں تقویٰ یا پرہیزگاری کی زندگی ہے اور اسی خداپرستانہ سعی وتدبیر پر نہ کہ خدا چھوڑی منصوبہ بازیوں پر رزق ومعاش کی وسعت وخوشحالی کا وعدہ ہے انفرادی بھی اور اجتماعی بھی

معاشی ودنیوی مشکلات کا حل تقویٰ

یہ تقویٰ جس فرد میں اور جس درجہ میں انفرادی طور پر ہوگا اسی درجہ میں اس کے صرف معاش ہی کا نہیں ہر طرح کی دنیوی مشکلات کا مَخلَص ومخرج یا حل ثابت ہوگا، ظاہری اسباب وتدابیر ناکام وناکافی بھی ہوں گی تو بھی بے نشان وگمان راہوں سے روزی مل کر رہیگی، جو بھی اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی یا پرہیزگاری کی راہ اختیار کرے گا اس کے ہر معاملہ ومشکل میں اللہ تعالیٰ خلاصی کی راہ نکال دیگا اور رزق وروزی ایسی راہوں سے عطا فرمائے گا جو اس کے وہم وگمان میں نہ ہوں گی۔ من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب

یہی تقویٰ

جب اور جس درجہ میں کسی چھوٹے بڑے ملک ومعاشرہ میں پیدا ہوگا اس کے معاش کی اجتماعی مشکلات کو دور کر دے گا اور جب اور جس درجہ میں بجائے تقویٰ وتدین کے کسی فرد وجماعت میں کفر وطغیان، خدا کی نافرمانی وسرکشی یا معاصی کا زور ہوگا۔ اسی قدر معاشی خلل وابتری کا بھی ظہور ہوگا۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کو کسی بستی کی مثال سے اس طرح واضح فرمایا گیا ہے کہ۔

ضرب اللہ مثلاً قریۃ	وہاں کے لوگ بڑے امن واطمینان کی
کانت اٰمنۃ مطمئنۃ	زندگی بسر کر رہے تھے رزق ومعاش کی

يَاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (پ ۱۴ نحل)

ہر طرف سے ریل پیل تھی پھر انہوں نے اللہ کی ان نعمتوں کی ناقدری کر کے کفر و کفران کی راہ اختیار کی تو اُن کی ان حرکتوں ہی کی بدولت ان کو ہر طرف سے قلت و گرانی اور خوف و ہراس کا مزہ چکھانے لگا۔[1]

حالانکہ ایمان و عمل صالح یا تقویٰ و تدین کی زندگی کی تعلیم و تلقین کے لئے

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ

ان کے پاس ان ہی میں سے رسول آ چکا تھا لیکن انہوں نے اس کو جھٹلایا تو لازماً اس کی سزا میں ان کو (اس قحط و گرانی) کے عذاب نے پکڑ لیا (اور کیوں نہ پکڑتا کہ انہوں نے ظلم پر بالکل ہی کمر باندھ لی تھی۔

معاً اس کے ساتھ ہی اس معاشی مصیبت کا حل یہ تبلایا گیا ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح رزق و معاش کے معاملات میں بھی رسول ہی کی لائی ہوئی تعلیم پر عمل کرو یعنی ان کے ذریعہ حصول رزق یا کسب معاش کے جو حلال اور پاک پاکیزہ

---

[1] راقم ہذا کی آنکھوں میں تو یہ آیات پڑھ کر جنگ سے پہلے اور بعد کے ہندوستان و پاکستان کا نقشہ پھر جاتا ہے کہ جس ملک میں اناج کیا دودھ گھی کی نہریں بہتی تھیں اسی ملک میں آج مستقل کال ہے اور خالص دودھ گھی کا تو گنے چگنے داموں پر بھی ملنا محال ہو رہا ہے اور ہر طرف کا تو یہ حال کہ اناج کی کمی کا رونا کچھ کم ہوتا ہے تو پیسہ کی کمی یا بیکاری کا رونا شروع ہو جاتا ہے حد یہ کہ گرانی کی مصیبت روپیہ میں دو چار آنے گئی تو الٹے اب روپیہ کا ڈھائی سیر کے بجائے صرف ساڑھے تین چار سیر گیہوں ہونا ارزانی بن گئی ہے۔

ذرائع تعلیم کئے ہیں ان کو اختیار کرو اور ان ذرائع سے جو کچھ ملے اس کو اللہ کی نعمت جان کر شکر کرو اور یہ جب ہی ہوگا کہ تم معاشیات میں بھی مارکس وغیرہ (غیر اللہ کو معبود بنانے کے بجائے) اللہ ہی کی عبادت وعبدیت یا اس کے رسولوں کے لائے ہوئے احکام وتعلیمات کی فرمانبرداری وطاعت کو اپنا شعار بنالو، فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (نحل ع ۱۴)

معاشی خوشحالی کا ایمان وتقویٰ پر وعدہ اور بھی قرآن میں جا بجا معاشی خوشحالی وفارغ البالی یا رزق برکتوں کا ایمان وتقویٰ کی زندگی ہی پر وعدہ فرمایا گیا ہے سورہ اعراف میں ہے کہ

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ع ۱۲

ان بستیوں والے اگر ایمان وتقویٰ کی راہ چلتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے ایمان یا ماننے کی جگہ جھٹلانے یا تکذیب کی راہ اختیار کی نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کی کرتوتوں کی سزا میں ان کو پکڑ لیا۔

ایک جگہ اہل کتاب کے بارے میں خصوصیت سے ارشاد ہے کہ

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ

اگر یہ لوگ توریت اور انجیل اور جو کچھ خدا کی طرف سے اترا اسکی پوری پابندی کرتے تو اوپر اور نیچے (ہر طرف سے) خوب کھانے پینے کا سامان پاتے

سورۂ ہود کے شروع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ارشاد و وعدہ ہے کہ :۔

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط

تم لوگ اپنے پروردگار سے (اپنی گذشتہ نافرمانیوں کی) معافی چاہ کر پھر سے اس کی طرف پلٹ آؤ (یا اس کی اطاعت وفرمانبرداری کا از سر نو عہد کرلو) تو وہ دنیا میں بھی تم کو مرنے تک خوشحالی عطا فرمائے گا۔

پھر یہی دوسرے عنوان سے ہود علیہ السلام کی زبان سے ارشاد ہوا کہ

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ ،

اے میری قوم والو تم اپنے پروردگار سے (اپنی گذشتہ نافرمانیوں کی) معافی مانگ کر پھر اس کی طرف پلٹ آؤ (از سر نو اس کی فرمانبرداری کا عہد کرلو) تو وہ تم پر خوب پانی برسائے گا (جس سے تمہاری کھیتی باڑی کی پیداوار خوب بڑھے گی) اور اللہ تعالیٰ تم کو قوت پر قوت زیادہ دے گا۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (نوح ع ۱)

کہ اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی چاہ لو، وہ بڑا معاف کرنے والا ہے، (کہ معاف کر دینے کے بعد) تم پر خوب پانی برسائے گا اور تمہارے اموال و اولاد میں ترقی دے گا، اور تمہارے لئے باغ لگادے گا اور نہریں جاری کر دے گا (یعنی دنیوی یا معاشی راحت و

فراغت عطا فرمائے گا۔

خدا سے روگردانی میں معاشی تنگی

جس طرح تقویٰ و تدین یا خدا پرستی کی زندگی آدمی کی دنیوی زندگی کو بھی پاک و پاکیزہ و آسان و خوشگوار بنا دیتی ہے اس طرح حرص و ہوس اور دنیا پرستی کا بھوت یا خدا سے روگردانی دنیا کا سازوسامان اور جاہ و مال کی بہتات ہونے پر بھی آخرت سے پہلے خود دنیا ہی کی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ ع ۶) سورۃ واللیل میں ہے کہ جس نے داد و دہش عطا و بخشش (وہی انفاق یا انفاقی ذہنیت) اور تقویٰ و نیکی کی راہ اختیار کی اس پر جلد ہی ہم آرام و آسانی کی زندگی آسان کر دیں گے فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى، بخلاف اس کے جس نے بخل و تنگی سے کام لیا اور خدا کو چھوڑا، نیکی کے خلاف راستہ چلا تو اس کے لئے ہم سختی و دشواری کا سامان آسان کر دیں گے [1] اور اس کا مال و متاع (جو بخل کر کے اس نے جمع کیا تھا) ہلاکت و بربادی سے اس کو نہ بچا سکے گا۔ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى۔

دین ہی میں دنیا کا بھی لطف ورنہ دنیا عذاب ہی عذاب ہے

خلاصہ یہ کہ اسلامی تعلیمات بلکہ خود کتاب اسلام کی کھلی کھلی آیات کی رو سے

---

[1] یعنی جو چیزیں فی الواقع سختی کی ہیں اپنی ابلہی سے ان کو ہی آرام و آسانی کی سمجھ کر ان ہی میں منہمک و ہلکان رہیگا۔

تقویٰ وپرہیزگاری یا ایمان وعمل صالح کی زندگی صرف آخرت ومعاد ہی کی فوز وفلاح
یا دنیا میں صرف معاش ورزق ہی کے مسائل ومشکلات کے حل کی ضامن ہی نہیں
بلکہ مرد وعورت سب کی پوری زندگی کو پاک وپاکیزہ وپرلطف وبامزہ بنا دینے
کی ضمانت دیتی ہے ۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى
فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔ اس کے برعکس بے دینی وبددینی کی راہیں
مال ودولت کی کثرت ہوتے ہوتے بھی اخروی ومعادی ہلاکت وبربادی
سے پہلے خود دنیا ہی کی معاشی وغیر معاشی ہر طرح کی زندگی کو عذاب بنا دیتی ہے
وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ
بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ دنیا ودین سب تباہ ہو کر رہتا ہے بقول عارف رومؒ
نے صفائے ماندش نے لطف وفر نے بسوئے آسماں راہ سفر

سامان راحت اور چیز ہے اور راحت اور چیز

مجدد وقت حکیم الامتؒ نے حرف حرف صحیح فرمایا کہ "سامان راحت اور چیز ہے اور راحت اور چیز ہے"
یہ ضروری نہیں کہ جس کے پاس سامانِ راحت ہو اس کو راحت بھی حاصل ہو اور نہ
یہ ضرور ہے کہ جس کے پاس سامان راحت نہ ہو اس کو راحت حاصل نہ ہو"
آگے قسم پر قسم کھا کر چیلنج کرتے ہیں کہ راحت اور سامانِ راحت کا لازم ملزوم نہ
ہونا صرف دلائل ہی سے ثابت نہیں بلکہ جس کا جی بیدین مالدار اور بے مال
دیندار کی زندگیوں کو ذرا قریب سے دیکھ کر خود اس حقیقت کا مشاہدہ کرلے کہ

واللہ ثم واللہ آپ ایک کامل دیندار شخص کو لیں، مگر ہم جیسا دیندار نہیں
بلکہ واقعی میں کامل دیندار ہو اور ایک نواب ورئیس کو لیں پھر ان کی نجی حالت کا

اندازہ کریں تو واللہ ثم واللہ وہ دیندار آپ کو سلطنت میں نظر آئیگا اور بہ نواب و رئیس مصیبت میں گرفتار نظر آئے گا۔ اس مشاہدہ کے بعد تو آپ مانیں گے کہ راحت کا مدار سامان پر نہیں (تجدید تصوف صفحہ ۳۸)

دین کم زیادہ جتنا بھی ہو دنیا اتنی ہی اچھی ہوگی

حضرت حکیم الامت نے تو کامل دیندار ہونے کی شرط لگائی ہے لیکن راقم احقر کا تجربہ و مشاہدہ تو بلا ادنیٰ شک و شائبہ یہ رہا ہے کہ دیندار میں تھوڑا بہت جتنا بھی دین ہوگا بیدین مالدار کے مقابلہ میں اس کی دنیا بھی یقیناً اتنی ہی زیادہ مزے دار ہوگی جس دنیادار کا جی چاہے دین کو اپنی زندگی میں تھوڑا بہت شریک کر کے دیکھ لے کہ اسی نسبت سے اس کو دل کا سکھ چین پہلے سے زیادہ نصیب ہے یا نہیں بشرطیکہ یہ تھوڑا بہت دین جو کچھ بھی ہو دل کے اندر اترا ہوا ہو، محض رسمی و ظاہری، نسلی و نمائشی نہ ہو، ایک طرف دل کو اللہ سے کچھ نہ کچھ ایمانی تعلق اور آخرت پر نظر ہو اور دوسری طرف اسی کے مناسب عملی زندگی پر اثر ہو

اس کا تو گھر باہر آدمی اپنوں پرایوں سب کی انفرادی زندگیوں میں تجربہ و مشاہدہ کر سکتا ہے اور اجتماعی یا قومی و اقوامی زندگی میں روزانہ ایسی ہی خبریں اخباروں اور ریڈیو میں پڑھی اور سنی جاتی رہتی ہیں کہ بیدینی یا لادینی (سیکولر) معیشت و سیاست کی راہوں سے دنیا کے معاشی و سیاسی مسائل و مشکلات بھی سلجھنے کم اور الجھتے زیادہ رہتے ہیں۔ ایک مصیبت ٹلی نہیں کہ دوسری اس سے بڑی جھانکنے لگتی ہے معیشت میں تو اس کی مثالیں اوپر گذر چکیں سیاست میں بھی یہ رنگ کہ ابھی کوریا اور ہند چین کی جنگ میں سالہا سال مسلسل کروڑوں اربوں کی جانی و مالی قربانیاں لے کر نام نہاد مصالحت کی روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی

کہ فارموسا اور اموائے میں جھڑپ کی اطلاعیں آنے لگی ہیں اور کہا جانے لگا کہ شاید یہی تیسری جہانگیر کا پیش خیمہ ثابت ہو۔[1]

خدا کا حکیمانہ قانون معاشی مساوات کی اندھی لاٹھی نہیں

اللہ تعالیٰ کی اکثریتی عادت یا عام قانون و انتظام تو یہی ہے کہ ایمان و عمل صالح یا تقویٰ و طاعت کی ذہنیت و برکت سے دنیا کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں بھی راحت و فراغت اور امن و عافیت عطا ہوتی ہے، اور کفر و طغیان یا فسق و عصیان کی بدولت دنیا میں بھی مصیبت و عسرت یا پریشانی و بدامنی ہی کا سامنا رہتا ہے لیکن خدائی قانون و انتظام سب کو مساوات کی ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکتا وہ حاکم کے ساتھ حکیم بھی ہے اس کی رزقی تقسیم یا معاشی انتظام بھی مساوات سے کہیں زیادہ ہر فرد و جماعت ہر ملک و ملت کی زیادہ اہم و اعلیٰ تکوینی و تشریعی یا تربیتی حکمتوں پر مبنی ہوتا ہے، بلکہ عسرت و فراغت کے مختلف درجات مثلاً کہ عام طور سے سب کو رزقی وسعت و فراخی عطا فرما دی جاتی تو اس سے زمین میں بغاوت و شرارت اور پھیل جاتی۔ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ نہ کوئی کسی کا محتاج و تابع ہوتا نہ کوئی حکومت و سیاست چل سکتی، ہر طرف بدامنی

---

[1] اور آج ہی (۲۵ جنوری ۵۵ء) اس مبیضہ کی تصحیح کر کے اخبار جو کھولا تو اس میں یہ خبر درج ہے کہ امریکی ساتویں بحری بیڑے کے وائس ریڈ مرل نے اعلان کیا ہے کہ آیندہ صرف چند ہی دنوں میں کوئی بڑا واقعہ ہو سکتا ہے جس کے لئے ہم کو تیار رہنا چاہئے اور کہا کہ ساتواں بیڑا فارموسا میں اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہے اور اب جولائی میں جب کتاب کے پروف آرہے ہیں، اسی سر پر منڈلانے والی جنگ سے گھبرا کر چار بڑے جنیوا آئیں اس کو کسی نہ کسی ٹالنے کو جمع ہیں۔

اور نراج ہی نراج ہوتا۔

ابتدائی حکمتیں وہ اپنے بڑے بڑے نیک بندوں اولیا وانبیا تک کو امتحانی و ابتلائی حکمتوں سے بظاہر بڑے بڑے جانی ومالی مصائب و مشکلات میں ڈالتا ہے اور اپنے یوسف کو کنویں میں پھینکتا، زندان میں ڈالتا اور پھر اسی راہ سے دنیا میں بھی عزیز مصر کی عزت وشوکت تک پہنچاتا ہے، وہ یعقوبؑ کو نور نظر کے فراق میں رُلا رُلا کر ان کی آنکھوں کو سپید و بے نور کر دیتا ہے ۔ اور ملا کر آنکھوں کو روشن کر دیتا ہے ۔ وہ سلیمان کو جن وانس پر حکومت عطا کر کے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ بنا دیتا ہے اور سب سے بڑے اور پوری اولاد آدم کے فخر و سرتاج سید الانس والجن نبیوں کے نبی خاتم النبیین (صلوات اللہ علیہم اجمعین) کو بادشاہت دیکر خود اختیاری فقر و فاقہ کی شان عبدیت کا تماشا دکھلاتا ہے اور خود زبان نبوت سے مسکنت کی زندگی وموت اور مساکین ہی کے زمرہ میں حشر کے دن اٹھنے کی دعا مانگتا ہے اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین ۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ امتحان وآزمائش جان ومال ہر طرح کی ایمان واسلام کی زندگی کے لوازمات میں داخل ہے۔

ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات ــــ اور کچھ نہ کچھ آزمائش وامتحان کی بھٹی میں پڑے بغیر خالی زبانی اقرار وایمان در اصل ایمان کا نام ہی نام ہوتا ہے ارشاد ہے کہ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض زبان سے ایمان کا اقرار کرکے چھوٹ جائیں گے اور کسی آزمائش میں نہ ڈالے جائیں گے

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ

(عنکبوت)

اسی طرح دوسری جگہ اگلے پیمبروں اور ان کی مثال سے تنبیہ فرما کر ارشاد ہے

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (بقرہ ع ۲۶)	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ (ایمان واسلام کے نام کی محض چھاپ لگا کر) جنت میں پہنچ جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر (امتحان وابتلا کی) کوئی ایسی (معاشی وغیر معاشی) تنگی سختی نہیں آئی جیسی تمہارے پہلوں پر کہ وہ بالکل ہلا ڈالے گئے یہاں تک کہ خود پیمبر اور ان کے ساتھ دوسرے

ایمان والے چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (گھبراؤ مت) یاد رکھو کہ اللہ (کا وعدہ سچا ہے اس) کی مدد (دور نہیں) قریب ہی ہے (آیا ہی چاہتی ہے)

ابتلاء کی حکمتیں اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا کی حد تک جانی ومالی کچھ نہ کچھ ابتلائی مصائب ومشکلات سے گذرنا عوام وخواص فرد وجماعت سب کے لئے دولت ایمان واسلام کے لوازم میں ہے جس سے مقصود کبھی انابت واستغفار کی طرف متوجہ فرمانا ہوتا ہے کبھی معاصی وسیئات کا کفارہ یا تطہیر مد نظر ہوتی ہے کبھی روحانی وقلبی بیماریوں کا علاج یا ہدایت قلب مطلوب[1] ہوتی ہے اور کبھی رفع درجات یعنی بڑے بڑے اولیاء واتقیاء بلکہ حضرات انبیاء تک بظاہر جو طرح طرح کی مصیبتوں اور سختیوں میں مبتلا نظر آتے ہیں اس ابتلاء کا مدعا ان کے درجات قرب ولایت یا مقبولیت کو اور بلند کرنا یا بڑھانا ہوتا ہے۔

---

[1] مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ

ڈھیل کا قدرتی قانون

علیٰ ہٰذا جس طرح ایک طرف دنیوی زندگی کی ظاہری تنگیاں اور سختیاں یا ناکامیاں خدا کی ناراضی کی دلیل یا ایمان و تقویٰ کے منافی نہیں بلکہ بارہا اس کی ترقی و تکمیل کے لئے ہوتی ہیں اسی طرح دوسری طرف دنیا کی ظاہری کامیابیاں و خوشحالیاں یا مال و متاع کی فراوانی نہ خدا کی خوشنودی کا پروانہ ہے اور نہ کفر و عصیان کی زندگی کی سند، بلکہ اکثر جب فرد یا جماعت کا طغیان و عصیان، سرکشی و نافرمانی حد سے گذر جاتی ہے تو رسی ڈھیلی کر دی جاتی ہے اور شیطان کی طرح شیطان کی فدیت کو بھی مہلت دیدی جاتی ہے اور بظاہر جاہ و ثروت، مال و معیشت، حکومت و سیاست، علوم و فنون دنیا کی ہر ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیئے جاتے ہیں جن کا اصطلاحی نام استدراج ہے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم دیکھو کہ کوئی شخص گناہوں اور سرکشیوں میں بے باکی سے مبتلا ہے اور پھر بھی اللہ تعالیٰ دنیا کی مرغوب و محبوب چیزیں جاہ و مال وغیرہ اس کو عطا فرما رہا ہے تو سمجھ لو کہ یہ استدراج ہے اس کے بعد حضورؐ نے سورہ انعام کی وہ آیات تلاوت فرمائیں جن میں خود قرآن نے اس استدراج و تمہیل یا ڈھیل کے خدائی قانون یا عادۃ اللہ کو بیان فرمایا ہے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝

جب (حضرات انبیاء کی لائی ہوئی تعلیم و) تذکیر کو وہ جان بوجھ کر بھلا بیٹھے تو ہم (خدا) نے بھی (رسی ڈھیلی کر دی) اور (دنیوی ساز و سامان کی) ہر شے کے دروازے ان پر کھول دیئے یہانتک کہ

جب وہ اس سازوسامان کے ملنے پر خوب مگن تھے تو ہم نے اچانک ان کو پکڑ لیا جس پر وہ ہکا بکا رہ گئے (اور کچھ بنائے نہ بنی)

نیک و بد ہر راہ میں خدا کی مدد کی حکمت انسان کو اس کی خلافتی خلقت وفطرت کی بناء پر چونکہ ارادہ کی آزادی یا اختیار و اقتدار دے کر پیدا کیا گیا ہے اس لئے قدرۃً پیدا کرنے والا اپنی شان ربوبیت و پروردگاری کے تحت ہمارے ارادہ کی اختیار کردہ ہر راہ میں مدد کرتا ہے وہاں روک اور کمی کس چیز کی ہے کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۔ سورۂ ہود میں اسی حقیقت کا کس وضاحت و قوت کے ساتھ واشگاف اعلان ہے کہ

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝

جو کوئی اس دنیا کی پست زندگی اور اس کی رونق وبہار ہی کا ارادہ کر لیتا ہے تو ہم دنیا کی حد تک اس کے اس ارادہ پر مبنی کاموں کو بھرپور پورا کر دیتے ہیں کوئی کمی وکسر نہیں رہنے دیتے ۔

لیکن ساتھ ہی دوسری طرف دنیا کے ان مریدوں اور پرستاروں کیلئے

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (ع ۲)

آخرت کی ابدی زندگی میں بجز جہنم کی آگ کے اور کچھ نہ ہوگا اور دنیا کے یہ کارنامے (اور کامیابیاں) وہاں سب کی سب اکارت ثابت ہوں گے ۔

فتح ابواب کا نقشہ مطلب وہی ہوا کہ خدا و آخرت کو بھلا کر خالص دنیا کی زندگی میں استغراق اور اس کی ظاہری کامیابیاں اور کامرانیاں اسلام کی نگاہ میں اس زندگی کے جواز و صحت کی دلیل و علامت کسی درجہ میں بھی نہیں آج کل کی خدا بیزار اور آخرت فراموش دنیا کی ظاہری چمک بھڑک، چہل پہل اور نت نئی سائنسی ایجادات و اکتشافات دیکھ کر راقم سطور کی آنکھوں کے سامنے تو بالکل فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ اور هُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۝ کا نقشہ کھینچ جایا کرتا ہے بلکہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی سی ایجادات و تجربات سے تو اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ اچانک پکڑ أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً کا وقت تو کہیں سر ہی پر تو نہیں آگیا

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

آگ سے پیاس بجھانے کی ضد لیکن یہاں خصوصیت سے معاشی مسائل و مشکلات کے ذیل میں زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ظاہر میں اس لادینی یا خدا چھوڑی اس زندگی پر ہر چیز کے دروازے کھلے ہونے کے باوجود ظاہر و باطن دونوں کے اعتبار سے ماڈرن دنیا کو معاشی سکھ چین کتنا ہی نصیب ہے؟ باطن کی راحت یا دل کی طمانیت کو خالی معاشی معیار کی بلندی یا ظاہری اسباب و مال اور دولت کی حرص و ہوس میں تلاش کرنا پیاس کو آگ سے بجھانے کی ضد اور دانشمندی کے سوا کیا ہے؟ اس کی تو ایک ہی راہ جیسا کہ ابھی اوپر ہی معلوم ہو چکا ایمان و عمل صالح کی زندگی یا خدا کی

یاد و تعلق ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ رہی ظاہر کی معاشی فراغت و وسعت تو تاریخ کے تاریک سے تاریک زمانوں نے بھی وہ ہمہ گیر مہیب گرانی کیوں دیکھی ہوگی جو ماڈرن دنیا کی روشن ترین بیسوی صدی کے عین وسط میں قریب ساری دنیا نے دیکھی کہ آدھا تہائی پیٹ بھرنے اور ستر عورت ڈھکنے بھر کے محلّے کپڑے کیلئے بھی ہاتھ میں راشن کارڈ لئے گھنٹوں بھوکوں ننگوں کو قطاریں بناتے دو کانوں پر کھڑے رہنا پڑتا ہو، غلے کپڑے کا ذکر ہی کیا نمک تک کے راشن بندی سے ملنے کی نوبت آگئی، اور نت نئے ماڈرن منصوبوں (پلانوں) اور کروڑوں اربوں روپیہ پانی کی طرح بہا دینے والی تدبیروں کے باوجود خود ہمارا ہندوستان اور پاکستان کھانے پینے کی اس فراغت کو ترس رہا ہے جو اپنی سائنسی و سیاسی ہر طرح کی پسماندگی کے باوجود ابھی دس بارہ سال قبل تک نصیب تھی۔

معاشی اسباب سے زیادہ مُسَبِّبُ الاسباب کی رضا طلبی

معاشی مسائل و مشکلات کے حل کے سلسلہ میں ذکر اسلام کے دو ایمانی حلوں کے بعد اس کے تیسرے عملی و کلیدی حل تقوے کا چل رہا تھا۔ رزق و معاش کے سلسلہ میں تقویٰ نام ہے طلب رزق کے ذرائع و اسباب سے زیادہ مسبب الاسباب کی رضا طلبی و فرمانبرداری کے اہتمام کا جس کے ہاتھ میں سارے معاملات معاشی و غیر معاشی بلکہ ساری زمین و آسمان کی کائنات کی کنجیاں ہیں وہی اپنے علم کے مطابق کم یا زیادہ جس کو جتنا چاہتا ہے رزق عطا فرماتا ہے لَہٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ بالفاظ دیگر جس کے قبضۂ قدرت میں ہر طرح کے اسباب و وسائل ہیں بلکہ جس کی انتظامی

حکمت وقدرت ہی نے کنجیوں کو کنجیاں یا اسباب کو اسباب بنا رکھا ہے جب وہ ہماری اطاعت وتقویٰ کی بنا پر ہم سے راضی ہو تو اسباب وبلا اسباب اپنی حکمت کے موافق جس کو جو کچھ اور جتنا چاہے دیتا اور دے سکتا ہے اور اگر اسباب ہی کی راہ سے دینا چاہے جیسا کہ عام عادت اللہ ہے تو اسباب کا پیدا کر دینا یا کمزور اسباب کو قوی کر دینا بھی تو تمام تر اسی کے اختیار میں ہے

اسلامی توحید کی ابجد لہٰذا اسباب کی راہ سے بھی معاشی مسائل ومشکلات کا اسلامی حل نفس ظاہری اسباب وتدابیر پر جان دینا یا بھروسہ کرنا نہیں بلکہ تمام انفرادی واجتماعی تدبیروں اور منصوبوں میں بھی قدم قدم پر اللہ تعالیٰ ہی کے احکام ومرضیات کو مقدم رکھنا ہے کہ ان کو کامیاب وکارگر بنانا بھی بالکلیہ اسی کی مشیت ومرضی پر موقوف ہے، اسلام کی توحیدی تعلیم کی تو یہ بالکل ابجد ہے کہ اسباب ہی نہیں اسباب کے نتائج کا پیدا کرنے والا بھی صرف اللہ ہی ہے۔

تقوے کی حقیقت اور اس لئے لازماً رزق ومعاش کے معاملہ میں بھی جن لازم وغیر لازم ظاہری اسباب وتدابیر یا تشریعی اوامر ونواہی مثلاً زکوٰۃ وانفاق کا امر وحکم اور سود وغیرہ حرصی کسب کی مختلف صورتوں کی نہی وممانعت سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کو متعلق فرما دیا ہے وہی ظاہری طور پر معاشی مسائل ومشکلات کے حل میں کارگر وبابرکت ثابت ہوں گے، اس طرح اسبابی نقطۂ نظر سے بھی تقویٰ یا پرہیزگاری کی زندگی پر غور کیجئے تو چونکہ تقویٰ کی معنوی واصطلاحی حقیقت ہی اللہ تعالیٰ کے ڈر سے اس کی ناخوشی ونافرمانی کی ہر چھوٹی

بڑی چیز سے حتی الامکان پرہیز واحتیاط ہے، لہذا مال و معاش کے کسب و حصول اور خرچ و انفاق دونوں میں بھی ہر طرح کی دانستہ یا اختیاری بے عنوانیوں سے مقدور بھر بچنے کی فکر اس کا لازمہ ہوگا۔

متقی آدمی ایک طرف کسب میں حیل و فریب، رشوت و خیانت، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، اعزہ پروری وغیرہ کی تمام ایسی ناجائز و نامناسب راہوں سے دور رہیگا جن سے دوسروں کو کوئی چھوٹا بڑا معاشی ضرر و نقصان پہنچتا ہو۔

دوسری طرف خود اپنے مال و متاع کے انفاق میں شراب خوری و حرام کاری کے کھلے سے کھلے معاصی و محرمات ہی سے احتراز نہ کریگا بلکہ بیڑی سگریٹ وغیرہ کے مکروہات تک سے اجتناب کو پسند کرے گا، مباحات میں بھی تن پروری عیش کوشی اور نمود و نمائش وغیرہ کی فضول خرچیوں یا اسراف و تبذیر کے قریب نہ جائیگا جس کی بدولت آپ سے آپ کم و بیش ہر چھوٹی بڑی آمدنی یا ادنیٰ و اعلیٰ ہر معاشی سطح والے افراد و طبقات سب کے مصارف معتدبہ حد تک گھٹ کر نہ صرف خود اپنی غذا و لباس وغیرہ کے حقیقی معاشی ضروریات کے لئے تھوڑی بہت وسعت و فراغت نصیب ہو جاتے گی، بلکہ بہتیروں کی آمدنی میں اتنی برکت ہوگی کہ اپنے پرائے حاجتمندوں کی معاشی مشکلات کو اعانت و قرض وغیرہ کی انفاقی ذہنیت والی ہمدردانہ صورتوں سے کچھ نہ کچھ حل کر سکیں نہ کہ بنیوں، مہاجنوں یا کسبی حرص والوں کی طرح دوسروں کو خالی پیٹ پا کر الٹے ان ہی سے اپنی تجوریوں کا پیٹ بھرنے کی فکر میں لگ جائیں۔

معاشی مشکلات کا عملی حل اسی لئے خدا اور اس کی رزق ضمانت

نیز دنیا کی فانی زندگی پر نظر سے زیادہ آخرت کی باقی و ابدی زندگی پر ایمان اور اسی ایمان پر مبنی عمل صالح یا تقوے کی زندگی کی راہ سے معاشی مسائل و مشکلات کے جس عملی حل پر اسلام اور کتاب اسلام کا سب سے زیادہ زور ہے وہ معاشرہ کے افراد و طبقات سب میں زیادہ سے زیادہ انفاقی ذہنیت پیدا کرنے کا کام ہے اسی سے آدمی اپنے اور اپنے زیر پرستوں کی واقعی و حقیقی معاشی حقوق کو پورا کر کے جس کے پاس کم زیادہ جو کچھ بچے گا حسب گنجائش دوسروں کی معاشی مشکلات کو دور کرنے اور اپنے پس انداز سرمایہ کو سرمایۂ آخرت بنانے اور خوشی خوشی خدا کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگاتا ہے۔

جہاں تک معاشی مسائل و مشکلات کا تعلق معاشیات کے دو مشاغل یا سرگرمیوں کسب و انفاق سے ہے پوری کتاب اسلام کا کہنا چاہئے کہ سارا زور کسب کے بجائے انفاق یا لینے کے بجائے دینے کی ترغیب و تحریص پر ہے اس کا بڑا راز یہی ہے کہ معاشی مفاسد و امراض زیادہ تر کسب و حصول ہی کی حرصی ذہنیت سے پیدا ہوتے ہیں اور وبار کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ لہذا جو ملک و معاشرہ خدا و آخرت کے ایمان اور تقوی کی زندگی پر مبنی اتنا ترقی یافتہ ہوگا کہ اس کے افراد و طبقات سب کی نظر دوسروں سے لینے پر کم سے کم (صرف بقدر واجب و جائز ہو) اور خود اپنی خوشی و اختیار سے دینے پر زیادہ سے زیادہ ہو تو غیر اسلامی یا لادینی معاشرہ کی گوناگوں معاشی خرابیوں اور بیماریوں کا حل و علاج حکومتوں عدالتوں یا قانون کا نام لے کر زبردستیوں اور دست اندازیوں کے بغیر خود ہی نکل آئے گا۔

اسلامی حکومت کا کام قوانین بنانے کی جگہ ذہنیت بنانا ہے۔

معاشی صلاح و فلاح کے لئے روز روز نئے نئے قوانین بنانے بگاڑنے

اور خود وضعِ قوانین کی مجلسوں اور محکموں پر کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہاتے رہنے کی جگہ اسلامی حکومت کا اصلی کام بگڑی ہوئی ذہنیتوں کا بنانا ہے اور اینٹ پتھر کے کونسل گھروں اور عدالتوں کی اونچی اونچی عمارتوں پر عمارتیں کھڑی کرتے جانے سے زیادہ خود انسانوں یا شہریوں میں خدا و آخرت میں ایمان پیدا کر کے ان کو حرصی کسب اور نفس پروری کے جذبات اور محرکات سے اونچا کرنا ہے، اسلام ماڈرن معاشیات یا معاشی سیاسیات والی لطنی یا کسبی حرص و ہوس کو تیز کرتے رہنے کا ہرگز ہرگز روادار نہیں جس کی بدولت آدمی دوسروں کی مدد کرنے یا ان کو دینے سے زیادہ اُن سے لینے اور چھیننے یا انفاق سے زیادہ جائز و ناجائز ہر راہ سے کسب و استحصال ہی پر تلا اور اس کسب کا بڑا حصہ ضروریات سے زیادہ فضولیات و لغویات میں اڑاتے یا اسراف و تبذیر کی نذر کرنے میں لگا رہتا ہے۔

تطفیفی ذہنیت قرآن مجید (سورۃ تطفیف) میں اسی غیر انفاقی کسبی و حرصی ذہنیت کی ناپ تول کے معاملہ میں مثال دے کر ارشاد ہے کہ

> بڑی ہی خرابی و تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے کہ جب لوگوں سے کچھ لینا ہو تو پورا پورا (بلکہ زیادہ سے زیادہ) لیتے ہیں اور ناپ تول کر جب دینا ہو تو کم (بلکہ کم سے کم) دیتے ہیں [1]

---

[1] یہ تو سنا سنایا غلامی کے ایک دوکاندار کا ماجرا تھا پروف بینی کے دوران میں ابھی ابھی ۲۶ ستمبر ۱۹۵۵ء اپنے ہی شہر لکھنؤ کے صرف ایک محلہ قیصر باغ کے وہ بھی صرف پھل ترکاری کے ۵۰ دوکانداروں کی دورِ آزادی کی تطفیفی آزادی و ترقی کی خبر پڑھی تھی کہ کم تولنے ہی کے الزام میں ان کے ۲۸ افراد گرفتار ہوئے ایک محلہ کے اس ایک ہی گلستان سے پورے ملک کی بہار آزادی و نا مذہبی کا قیاس فرمائیں یہ کنجڑے کبڑے تو خیر بیچارے جاہل و ذلیل ادنیٰ طبقہ کے خیال کئے جاتے ہیں کل کی ہماری معزز ترین کروڑپتی کی شاید اب بتی تعلیم یافتہ مشہور

(باقی بر صفحہ آئندہ)

نام کے ایک مولوی صاحب دکاندار کا مدت ہوئی یہ معاملہ سنا تھا کہ دو قسم کے باٹ رکھے تھے ایک کچھ زیادہ وزن کے اور دوسرے کم، ظالم نے پہلی قسم کا نام بسم اللہ رکھا تھا اور دوسری کا اعوذ باللہ، جب کوئی چیز لینا ہوتی تو بسم اللہ کا استعمال ہوتا اور جب دینا ہوتی تو اعوذ باللہ کا۔ نعوذ باللہ من ذلک

ماڈرن معاشیات وسیاسیات کی آج ساری انفرادی واجتماعی قومی اور بین الاقوامی دنیا کے معاملات میں کیا دن کیا رات انہی بسم اللہ واعوذ باللہ والے باٹوں کے سوا کسی اور چیز کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے، ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم، دوسرے ہر فرد ہر جماعت ہر قوم سے لینے پر زیادہ سے زیادہ حریص اور دینے میں زیادہ سے زیادہ بخیل، ہندوستان وپاکستان کی نام نہاد آزادی کے بعد خصوصاً معاشی معیار کو بلند کرنے کے نعروں کا شور جیسے جیسے بلند ہوتا جا رہا ہے غور کیجئے تو روزمرہ کے معمولی معاملات میں یہی تجربہ ہوگا کہ کام کم سے کم اور دام زیادہ سے زیادہ یا دام کم سے کم اور کام زیادہ سے زیادہ کی رسہ کشی بڑھتی چلی جا رہی ہے کوئی مزدور لگائیے یا نوکر رکھئے تو ایک طرف کام چوری وحرام خوری کی، اور دوسری طرف مزدوری وآمدنی کی فکر میں زیادہ سے زیادہ رہیگا اور مالک یا آجر زیادہ سے زیادہ کام لینے اور کم سے کم اجرت وتنخواہ دینے کی تدبیریں۔

یہ تو تطفیف کی روز افزوں عام انفرادی ذہنیت ہے باقی جماعتوں اور قوموں میں جس زور شور سے یہی ذہنیت کارفرما ہے اس کے گوناگوں واقعات ہر اخبار پڑھنے والا روزنہی اخباروں میں پڑھتا رہتا ہے[1]

(بقیہ از صفحہ گذشتہ) ڈالمیا کے متعلق ہوشربا خبر یہ تھی کہ دو کروڑ کے سرکاری تمسکات کے غبن کے الزام میں دہلی کی عین راجدھانی میں گرفتار کئے گئے ۱۲

حاشیہ صفحہ ہذا[1] آج ہی ۱۸ر اکتوبر ۱۹۵۵ء کے ایک اخبار میں صرف ایک

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

آئے دن کارخانوں یا ملوں اور ان کے مزدوروں وغیرہ حد یہ کہ خود حکومتوں اور ان کے مختلف محکموں کے کارندوں کے درمیان جو کشمکش و آویزش کی خبریں آتی رہتی ہیں ان کا خلاصہ لے دے کر یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف کارخانہ دار اجرت یا دام کم دینا اور کام زیادہ لینا چاہتا ہے تو دوسری طرف مزدور کام کم اور دام زیادہ چاہتا ہے، کاشتکار و ذخیرہ دار غلہ و شکر وغیرہ کو زیادہ سے زیادہ گراں ہونے کے انتظار میں روکے رہتا ہے اور تو اور تعلیم گاہوں اور طالبعلموں میں فیس گھٹانے بڑھانے کی لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ حکومتیں جن کا سب سے بڑا کام ہی کہنا چاہئیے کہ مزدوروں کاشتکاروں اور ننگوں بھوکوں کے درد کا دکھڑا ہی رہ گیا ہے ان کی بھی خود اپنے مختلف محکموں کے ساتھ ہمدردی و انصاف پسندی کا عالم یہ ہے کہ جن محکموں والوں سے حکومت جتنا ڈراتی ہے کہ ان کی ہڑتال سے حکومت ہی کی مشین فیل ہونے لگے گی ان سے اتنا ہی دبتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لندن کی چار چار ہڑتالوں کی خبر ان الفاظ میں ہے کہ گودی کے مزدوروں کی ہڑتال نے جس کا آج چودھواں روز ہے پھیل کر بندرگاہ کو مفلوج کر دیا ہے کیونکہ ملاحوں اور کشتی بانوں کی یونین کے ۴۰۰۰ ہزار کارکنوں نے بھی ہڑتال کر دی چھبیس ہزار آٹھ سو مزدوروں نے دریا کے ٹیمس پر کشتیوں پر مال چڑھانا اتارنا بالکل بند کر دیا ہے لندن کی بسوں کی ہڑتال بھی جاری ہے خیال کیا جاتا ہے کہ لندن میں ہڑتال کی صورت حال کل اور بدتر ہو جائے گی، آج ہی کے اخبار کی دوسری خبر یہ ہے کہ نیویارک میں تنخواہوں کے اضافہ کا مطالبہ کرتے ہوئے تقریباً ۲۴۰۰ ہزار لاری ڈرائیوروں نے ہڑتال کر دی ہے جس سے دودھ اور گوشت کی فراہمی بند ہو گئی ہے، میئر نے کہا ہے کہ اگر جلد ہی یہ ہڑتال ختم نہ کی گئی تو شہر میں غذا کی فراہمی پر بہت بڑا اثر پڑے گا۔

اور ان کے مطالبات پر زیادہ توجہ کرتی ہے مثلاً ریل، ڈاک، فوج، پولیس وغیرہ کے مطالبات پر جس طرح کان دھرے جاتے ہیں اس کے بجائے مثلاً چھوٹے چھوٹے ابتدائی مدرسوں کے چھوٹے چھوٹے استاذوں کی چھوٹی چھوٹی تنخواہوں میں اضافہ ورعایت کا معاملہ ہو تو یہی حکومت ان غریبوں کے مقابلہ رستم وقت بنجاتی ہے۔

بین الاقوامی تطفیفی دراز دستیاں

جو انفرادی وجماعتی اور قومی وحکومتی معاشی مسائل ومصائب کی سب سے بڑی جڑ ہے، اسی نے اقوام میں پہنچ کر بڑی سے بڑی بین الاقوامی جنگوں کی صورت اختیار کر کے ساری دنیا کو تہ وبالا کر رکھا ہے جس کو جو کچھ پیٹ آدھا پیٹ روٹی مل رہی تھی اس بین الاقوامی تطفیفی حرص وآز کی چیرہ دستیوں نے انہیں کو بھی امن وعافیت کے ساتھ پیٹ تک پہنچانا دشوار کر رکھا ہے جنگ عظیم و جنگ اعظم کے بعد کوریا میں سالہا سال تک جو جنگ جاری رہی کون کہہ سکتا ہے کہ جنوبی وشمالی کوریا کے شہریوں کے پاس پورے یا آدھے پیٹ کیلئے جو کچھ موجود تھا اس کو بھی سکھ چین کے ساتھ پیٹ تک پہونچانا نصیب ہوتا ہوگا، پھر بھی امریکہ کے مطفف درندوں کی اس درندگی کی کچھ حد ہے کہ کہا جاتا ہے جنگ اس لئے ختم کرنا نہیں چاہتے کہ کروڑوں اربوں کا جو جان لیوا سامان جنگ وہاں کے کارخانے تیار کرتے رہتے ہیں ان کی کھپت میدان جنگ کے باہر کس بازار میں ہوگی، دوسری طرف روس کے جنگ باز نام نہاد معاشی مسائل ومشکلات کا جو حل لے کر اٹھے ہیں اس نے بھی ساری دنیا کا امن واماں اس طرح غارت کر رکھا ہے کہ پوری روٹی دلانے کے بہانے آدھی کا بھی سکون وراحت سے کھا لینا اجیرن ہو رہا ہے گرم جنگ ختم بھی ہوئی تو سرد ختم نہیں ہو رہی ہے بڑھتی ہی جا رہی ہے پھر ہر ملک میں روس کے خفیہ، علانیہ ایجنٹوں کا جال اتنا پھیل گیا ہے کہ سرمایہ داروں، زمینداروں اور کاشتکاروں بالفاظ دیگر ہر طرح کے

زاروں اور ناداروں کی خانہ جنگیاں تو گویا اب گھر گھر پھیل گئی ہے اور توڑ پھوڑ کی تکینک کی بدولت بیگناہوں کی جان و مال پر ڈاکہ تو اشتراکیت کی شریعت میں ثیر مادر ہے

انسان صورت جانور

باقی خود روس کی اشتراکی جنت میں آہنی پردہ کے پیچھے کیا ہو رہا ہے! اس کی اصل حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے البتہ جو شعاعیں کبھی کبھی چھن کر اس پردہ سے باہر آجاتی ہے ان سے اتنا موافق مخالف سب ہی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کی اصل انسانیت یا اختیاری فطرت کا گلا گھونٹ کر اس کو پورا پورا کولھو کا بیل بنا دیا گیا ہے کہ بندھا ٹکا چارہ تو شاید ہر انسان صورت جانور کو فراہم کر دیا جاتا ہے لیکن انسانی آزادی و اختیار کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی روزمرہ کی معمولی زندگی میں اس طرح ذبح کر دیا گیا ہے کہ کولھو کے دائرہ سے باہر حرکت کا اختیار بالکلیہ مسلوب ہے اور معاشی کسب و انفاق کے تمام مشاغل حکومت کے قوانین و ضوابط کی آہنی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیئے گئے ہیں کہ مذبوحی حرکات یا پھڑ پھڑانے کی بھی اجازت نہیں، ہاں اگر کسی انسان میں انسانیت کا کچھ دم رہ گیا ہو اور اس سے پوچھا جائے کہ تجھ کو زنجیروں میں جکڑا رہ کر پلاؤ قورمہ کھاتے رہنا پسند ہے یا انفرادی آزادی و ارادہ کی فضا میں چل پھر کر اور سانس لے کر دال روٹی بلکہ آدھا پیٹ کھانا قبول؟ تو جس آدمی میں آدمیت کی کچھ بھی رمق زندہ رہنے دی گئی ہو گی وہ چیخ پڑے گی کہ ایسے قورمہ پلاؤ پر خدا کی مار!

اسلام کی انسانی معاشیات

حیوانی نہیں کہ مقدم ہر جانور کو کسی نہ کسی طرح دانہ چارہ مل جاتا ہو بلکہ کسب و انفاق کے تمام مشاغل میں مقدم انسان کو انسان بنانا یا اس کی اختیاری شخصیت کی حفاظت و تربیت کو رکھا گیا ہے یعنی

اس پر حکومت و قانون یا خارجی دباؤ کی بندشیں کم سے کم اور صرف اتنی رکھی گئی ہیں جتنی دوسرے انسانی افراد کی اسی انسانیت یا آزادانہ و اختیاری شخصیت کے نشو و نما کے لئے ناگزیر ہوں اور اس میں خلل نہ پڑنے پائے، دوسرے لفظوں میں اسلام آدمی کو نہ سانڈ بنا کر اتنا آزاد کر دیتا ہے کہ اپنے پرائے جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر جب اور جس کے کھیت میں جی چاہے گھس کر منہ مارنے لگے اور نہ خارجی و قانونی ضابطوں میں جکڑ کر کولھو کا بیل بنا دیتا ہے کہ معاشی سرگرمیوں میں حکومت کے مقرر کئے ہوئے دائرہ سے کوئی قدم باہر نکال پائے جیسا کہ آج کل کی نام نہاد جمہوری حکومتیں روز بروز بالشوزم یا اشتراکیت ہی کی نقالی میں کلیت پرستی
کے رجحانات میں شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہیں خصوصاً معاشی معاملات میں کہ زراعت و تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ تمام معاشی ذرائع کی انفرادی آزادیوں کو چھین چھین کر ان کو بظاہر قومیانے کے نام سے در اصل
شہریوں کے بجائے خود حکومتیں بلکہ ان کے چھوٹے بڑے گنے چنے کارندے قابض ہوتے جاتے ہیں اور جو کچھ بالعموم معمولی چھوٹے بڑے معاشی وسائل شہریوں کے اختیار و تصرف میں رہ بھی جاتے ہیں ان میں بھی قدم قدم پر براہ راست یا بواسطہ جائز و ناجائز طور پر حکومت کے وہی کسبی ذہنیت والے خائن اور راشی کارندوں کی جا و بیجا دست اندازیوں کی بدولت غریب شہری کے معاشی اختیار و آزادی کا بس نام ہی نام رہتا جا رہا ہے بلکہ سیاسی آزادی اب نام ہی ہوتا جا رہا ہے معاشی آزادی کے سلب کا۔

اس کے بالکل برعکس اسلام ایک طرف تو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بشر کے بھی اختیار و آزادی پر کسی دوسرے فرد یا جماعت (کونسل و اسمبلی وغیرہ) کے

خود ساختہ من مانے اصول و قوانین کو عائد کرنے کرانے یا ان کی اطاعت و وفاداری کا جواز رکھنے کی سرے سے نفی و انکار کا نام ہے اور انسان طبعاً و فطرتاً جس اختیار و آزادی کا بھوکا ہے وہ یہی ہے کہ اپنے جیسے کسی دوسرے انسانی فرد یا جماعت کی غلامی و اطاعت سے زیادہ سے زیادہ آزاد و خود مختار ہو، دوسری طرف انفرادی و اجتماعی طور پر اسلام جس دستور کی اصول و فروع میں پابندی و فرمانبرداری کا مطالبہ کرتا ہے وہ کسی انسانی فرد و جماعت کی نہیں بالکلیہ سارے بنی نوعِ انسان بلکہ ساری کائنات کے سراپا عدل و انصاف خالق و مالک کی ہے۔

لیکن یہ بنیادی مطالبہ بھی چونکہ دراصل ایک ذہنی و فکری انقلاب کا مطالبہ ہے اس لئے اس کے رد و قبول میں بھی کوئی زور و جبر یا اکراہ جائز نہیں جو چاہے مانے مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ البتہ اس فکری انقلاب کو رضا و رغبت سے قبول و پسند کر لینے کے بعد اس کے مطابق عمل کا مطالبہ بالکل منطقی و فطرتی ہے اس عملی دائرہ و شعبہ میں بھی خارجی و قانونی پابندیوں کی مقدار کم سے کم اور آزادی و اختیار کا میدان زیادہ سے زیادہ کھلا رکھا گیا ہے

معاش کے معاملہ میں اسلام کا اصل مطالبہ

معاش ہی کے معاملہ کو لیجئے کہ اصل مطالبہ تو اسلام کی طرف سے اس ذہنی انقلاب یا ایمان کا ہے کہ حقیقی روزی رساں یا رزق و معاش کا ضامن اور اس میں اپنی حکمت و مشیت اور مرزوق کی تربیت و مصلحت کے مطابق قبض و بسط یا تنگی و وسعت عطا کرنے والا صرف اللہ ہے جس کی مرضی و مشیت کے بغیر کسی فرد و جماعت یا حکومت کی سعی و تدبیر جد و جہد سے نہ ایک دانہ کی بھی کسی جاندار کے رزق و روزی میں زیادتی کا امکان ہے نہ کمی کا اندیشہ۔

اسلام کے معاشی ضوابط کا مقصد بھی انسانیت کی تکمیل ہی ہے

کتاب وسنت نے کسب وانفاق کے احکام کا جو عملی ضابطہ اور دستور العمل عطا کیا ہے اس کا مقصد بھی معاشی تنگی وفراخی کی ہر صورت میں دراصل امتحان وابتلا کی مناسب راہوں سے انسان کی اختیاری فطرت یا انسانیت ہی کی تکمیل و تربیت ہے اس لئے ان احکام میں ایک طرف افراد کی اختیاری فطرت کو اتنا آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ظاہری سعی وتدبیر کے جائز اسباب و ذرائع سے بڑے سے بڑا سرمایہ دار و ملک التجار یا زمیندار و جاگیر دار بنجانا بھی اسلام کی نظر میں حرام قطعاً نہیں، اور دوسری طرف قانونی یا جبری طور پر سرمایہ یا اموال کے ایک معتدبہ نصاب یا مقدار و تعداد کے مقابلہ میں بہت قلیل لازمی ٹیکس زکات وعشر وغیرہ کا عائد کیا گیا ہے نیز تقسیم وراثت کو بھی قانونی صورت دیدی گئی ہے باقی ترغیب و ترہیب کا سارا زور انفاقی ذہنیت پیدا کرنے اور رضا و رغبت سے زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے پر ہے تاکہ ایک طرف کسب کی اختیاری و فطری حوصلہ مندیوں کا خون نہ ہونے پائے اور دوسری طرف جتنا زیادہ سے زیادہ آدمی کمائے اتنا ہی زیادہ دوسروں پر خود اپنی خوشی وطیب خاطر سے خرچ کرتا رہے۔

اسلامی معاشیات کا بڑا اہم امتیازی پہلو

یہی بڑا اہم امتیازی پہلو جدید لادینی کسبی معاشیات کے مقابلہ میں اسلام کی دینی انفاقی معاشیات کا ہے کہ امیروں کو زبردستی غریب بنانے کے بجائے خوشی خوشی سرمایہ داروں کی کمائی ناداروں کو پہونچا دیجائے جس میں نہ صرف غریب و نادار کی چند روزہ

زندگی یا دنیا بنتی ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر خود امیر و سرمایہ دار کی ابدی زندگی اور دین بنتا ہے جو اسلام اور اسلام کی تمام تعلیمات کا اصل مبدأ و منتہا ہے اسی طرح اگر امیر یا سرمایہ دار اپنی دولت و ثروت کو صرف اپنے یا اپنے متعلقین کی عیش کوشیوں اور فضول خرچیوں میں اڑاتا اور اس طرح غریبوں اور ناداروں کا حق مارتا ہے تو ان غریبوں کی دُنیا بگاڑنے سے کہیں بڑھ کر خود اپنی آخرت کو بگاڑتا اور اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں ڈالتا ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے حکم کے ساتھ ساتھ ہی ڈرایا گیا ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو، وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ یعنی تمہارا اپنے مال و دولت کو خدا کی راہ میں نہ خرچ کرنا خود اپنی ہی ہلاکت کو دعوت دینا ہے دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی، پھر غریب اگر اپنی غربت کے ساتھ ایمان کی دولت رکھتا ہے تو اس پر صبر و رضا توکل و قناعت وغیرہ کتنے روحانی و اخلاقی فضائل و کمالات کے دروازے کھل جاتے ہیں لیکن جدید معاشیات یا معاشی تحریکات نے غریبوں کو ہیٹ پیٹ کی چیخ و پکار میں مبتلا کر کے دنیا کے امن و امان کے ساتھ خود ان کے سکون و اطمینان کو جس طرح غارت کر رکھا ہے ان کے مقابلہ میں معاش کا دامن معاد سے باندھ لینے والے غریب غرباء اپنی تنگی و ترشی میں بھی دل کا چین سکھ زیادہ اور بہت زیادہ حاصل کر لیتے ہیں ''

معادی و فسادی معاشیات کا تضاد اس لئے سچ یہ ہے کہ اسلام کی معادی معاشیات کا جدید فسادی معاشیات سے اصول و فروع نظریہ و عمل کسی چیز میں کوئی مقابلہ و موازنہ ہو سکتا ہے تو وہ توافق کا نہیں تضاد کا۔ سوا اس کے جسمانی و ظاہری تشابہ و مماثلت سے جس طرح انسان کو حیوانات ہی کی صرف ایک ترقی یافتہ

یا ارتقائی نوع سمجھ لیا گیا ہے اسی طرح بعض ظاہری و خارجی باتوں میں اشتراک و تشابہ کی بناء پر اسلام کی معادی و ایمانی یا انسانی معاشیات کا جوڑ اسلام کے بہت سے نادان دوست آج کل کی اشتراکیت و اشتمالیت وغیرہ کی سراسر غیر معادی و الحادی یا حیوانی معاشیات سے ملانے لگے ہیں حالانکہ دونوں کی منزل و مقصد بالکل الگ الگ ہونے سے لازماً دونوں کے راستے بھی قطعاً جُدا جُدا ہیں جو چیز ایک نقطۂ نظر سے خیر و فلاح ہو سکتی ہے بعینہٖ وہی دوسرے نقطۂ نظر سے شر و فساد

معشوق من است آنچہ بہ نزدیک تو زشت است

اسلامی معاشیات کی مقدم شرط

زندگی کے تمام شعبوں کی سرگرمیوں میں اس حقیقت کو مسلسل اور بار بار ذہن کے سامنے رکھنا اور لاتے رہنا چاہیئے کہ اسلام نے انسان کے انسانی کمالات یا اس کی انسانیت و خلافت کی تکمیل و تربیت کا دار و مدار خارجی پابندیوں یا قانونی جبر و اکراہ کے بجائے زیادہ تر اس کی باطنی نیت و ارادہ یا اختیار و آزادی پر رکھا ہے اس کی نگاہ میں اس عمل کا کوئی وزن و اعتبار نہیں جو کسی بیرونی قوت نے ہاتھ پکڑ کر کرا دیا ہو، وہ قیمت اسی عمل کی لگاتا ہے جو کرنے والے نے اپنے اندرونی و قلبی داعیہ و نیت کے تحت آزادانہ اختیار و ارادہ سے کیا ہو، اعمال کے حسن و قبح صحت و سقم، رد و قبول کا دار و مدار ان اعمال کی خارجی و ظاہری شکل و صورت پر بھی اسی قدر اور اسی درجہ میں ہے جس قدر اور جس درجہ میں ان کا منشا باطنی و داخلی نیت ہو اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ

اس لئے معاشیات کو اسلامی معاشیات بنانے کے لئے اصل و مقدم شرط یہ اسلامی و ایمانی نیت و ذہنیت پیدا کرنا ہے کہ دولتمند بجائے اپنی اور اپنوں کی تن پروری و عیش کوشی کے خود اپنی خوشی و نیک نیتی سے زیادہ سے زیادہ دوسروں پر خرچ کرتا اور

حاجتمندوں کی حاجت روائی میں لگا رہے۔

فساد کی جڑ معاشرہ میں اس اختیاری و فرض شناسانہ انفاقی نیت و ذہنیت کے کارفرما ہونے سے انسان اپنی اختیاری فطرت پر مبنی زیادہ سے زیادہ انسانی کمالات کے تحقق وتکمیل میں ترقی کریگا
دوسری طرف جدید معاشیات کی حقوق طلب کسبی ذہنیت نے ساری دنیا کو جن انفرادی و اجتماعی قومی و بین الاقوامی فسادات سے بھر دیا ہے ان سے نجات ملیگی۔
فساد کی جڑ یہی ہے کہ افراد و طبقات، جماعتوں اور قوموں سب میں ادائے فرائض سے زیادہ مطالبہ حقوق کی حرصی یا تطفیفی آگ کو بھڑکا دیا گیا ہے اور یہ ماڈرن سیاسیات و معاشیات دونوں کا ماحصل یہی رہ گیا ہے کہ جس طرح بن پڑے دوسروں سے تو اپنا حق کیا حق سے زیادہ وصول کر لیا جائے اور ان کا واجبی حق بھی خوشی خوشی نہ ادا کیا جائے یہی فرض ناشناسی اور حقوق طلبی کا دور دورہ آج کل سارے انفرادی و اجتماعی قومی و اقوامی جھگڑوں اور جنگوں کا سرچشمہ ہے

اس کے بجائے اگر لوگوں میں حق طلبی سے زیادہ فرض شناسی اور لینے سے زیادہ دینے یا وہی کسب سے زیادہ انفاق کی نیت و ذہنیت کارفرما ہو کہ دعویٰ و مطالبہ کے بغیر ہی دوسروں کے حقوق بلکہ حقوق سے زیادہ ادا کرنے ہی میں آدمی اپنی آدمیت کا کمال اور اپنی ابدی زندگی کی لازوال خیر و فلاح جاننے لگے، جیسا کہ اسلام چاہتا اور اسلامی ایمان اور عمل صالح کی زندگی کا لازمہ ہے تو پھر ایسے معاشرہ میں نہ امیروں کو زبردستی غریب بنانے کی ضرورت رہیگی نہ کسی کے بڑے سے بڑا سرمایہ دار و جاگیردار بنجانے سے کوئی معاشی شر و فساد سر اٹھا

سکے گا۔ اور نہ کاشتکار و زمیندار یا مزدور و کارخانہ دار وغیرہ مختلف و مقابل طبقات میں کسبی و حرصی معاشیات کی پروردہ روز روز کی امن سوز کشمکش کا امکان ہو گا رہا ملک و معاشرہ کا معمولی امن و امان اور عدل و انصاف تو اس کی حفاظت کے لئے حکومت کے معمولی قوانین و انتظامات بالکل کافی ہوں گے اور آج کل کی قانون ساز مجالس کی طرح روز روز قوانین بنانے بگاڑنے کے مستقل تماشوں اور تماشہ گاہوں پر مفلس سے مفلس ملکوں کا لاکھوں کروڑوں روپیہ آتش بازی کی طرح نہ پھنکتا رہیگا، جس سے خود ان کے ملکوں کے ہزاروں لاکھوں شہریوں کے معاشی مسائل و مشکلات کا حل کیا جا سکتا تھا۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم

کچھ مزید اجمال و تفصیل الحمد للہ کتاب کے آخری باب (معاشی مسائل و مشکلات کے حل) پر بھی اصول و فروع دونوں کی اہم اہم باتیں اوپر کے صفحات میں آگئیں، تاہم دور حاضر کے معاشی و سیاسی غوغائیوں نے جس طرح بندگانِ خدا کو بندگانِ شکم بنا ڈالنے پر کمر باندھ رکھی ہے اس کے دیکھتے ان باتوں کو بھی جتنا زیادہ دہرایا جاتے کم ہی ہے۔ کم از کم اپنا جی چند مزید صفحات نذر کئے بغیر نہیں مان رہا ہے، معاش کے انفرادی و اجتماعی دونوں طرح کے مسائل و مشکلات کا حل کھلے دل و دماغ سے تلاش کرنے والوں کے لئے پیٹ کی اس لذیذ حکایت پر کچھ مزید دراز تر اجمالی و تفصیلی گفتگو انشاء اللہ مزید لذت و منفعت سے خالی نہ ہو گی۔

اسلام کی ساری تعلیمات کا جوہر واساس توحید ہے اس توحید سے مراد
خالی توحید ذات نہیں اس کے قائل تو عرب وعجم کی مشرک سے مشرک قومیں بھی رہی
ہیں خود ہمارے ملک ہندوستان کی لاکھوں کروڑوں ان گنت دیبی دیوتاؤں، شجر
وحجر انسان وحیوان جن وملک سب کی پوجنے والی قوم کی کتابوں میں توحید وجود وذات
کے بڑے بڑے فلسفے بھرے پڑے ہیں اسلام کا اصلی مطالبہ توحید صفات کا ہے اس
کے کلمہ کی دعوت لا الٰہ الا اللہ میں بھی ذات اللہ کے واحد ہونے کی دعوت نہیں
بلکہ صرف اللہ کے الٰہ ہونے کا مطالبہ ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔
نبی الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے پہلے بھی تمام انبیاء علیہم السلام کی بنیادی دعوت
یہی رہی ہے کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوسرا الٰہ قطعاً نہیں مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
غَيْرُهٗ " عبدیت وعبادت بندگی وطاعت پوجا اور پرستش کے سارے تعلقات
کا منشاء ومرجع صفت الٰہ یا الٰہیت والوہیت ہی کی صفت ہے جس کی اسلامی و
قرآنی دعوت میں غیر اللہ سے قطعاً نفی کی گئی ہے کہ کیا خدا کے سوا تم ایسوں کی پوجا
و پرستش کرتے ہو جو ذرہ بھر بھی تم کو نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، تف ہے
تم پر اور تمہارے ان معبودوں سب پر اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا
يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
قرآن مجید میں تمام اسماء یا صفاتِ کمال کو اصلاً و اصولاً صرف اللہ تعالیٰ ہی کی
ذات کے ساتھ مخصوص اور اسی میں منحصر ہونے کا قدم قدم پر جو دعویٰ و دعوت ہے
اس کا بڑا مدعا یہی تو ہے کہ نفع وضرر کی کسی امید وخوف یا عبادت و استعانت کا کوئی
تعلق بالذات اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے سوا کسی اور سے مطلق نہ رکھا جائے،
کتاب اسلام کے دیباچہ ومقدمہ، فاتحۃ الکتاب ہی میں اور اس کے پہلے ہی فقرہ میں

ذات کے بعد تمام صفات کی جامع صفت ربوبیت[1] کی طرف متوجہ فرمایا گیا وہ اس لئے کہ آگے عبادت و استعانت کا رُخ ہر جہت و نسبت سے انحصار کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے۔ کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے اور صرف تجھی سے ہر معاملہ میں مدد چاہتے ہیں۔ نماز جو اسلامی اعمال و عبادات کا دن رات کی زندگی میں ایک نہیں پانچ پانچ وقت کا ایسا فریضہ ہے کہ ہوش و حواس رکھنے والا کوئی مسلمان کسی حال میں اس سے مستثنیٰ نہیں وہ بلا ایاک نعبد و ایاک نستعین کے اس اقرار کے درست ہی نہیں ہوتی لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب باقی پوری سورہ فاتحہ میں اس آیت کے قبل و بعد جو کچھ ہے سب اس کی تمہید و تتمہ

رب کی صفت تمام صفات کو اتنی جامع و محیط ہے کہ پورے قرآن مجید میں اسم ذات اللہ کے بعد صفات میں سب سے زیادہ تذکیر و تکرار صفت رب ہی کی ہے، جس طرح عبد کے معنیٰ سراپا عجز و احتیاج یا سائل اور بھکاری کے ہیں اسی طرح رب کی حقیقت سراپا داد و دہش یا داتا اور حاجت روا ہے یعنی ہر مخلوق کی ہر حاجت و طلب کو پورا کرنے کی وسعت و قدرت رکھنے والا، رزاقیت اس جامع الصفات ربوبیت کی ایک ماتحتی صفت ہے اور جاندار مخلوق کے حق میں اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا سب سے اہم و نمایاں مظہر رزق رسانی یا بقائے

---

[1] رحمانیت، رحیمیت، وہابیت، رزاقیت، جباریت و قہاریت وغیرہ تمام جمالی و جلالی اسماء و صفات، صفت ربوبیت ہی کے توابع و لوازم ہیں، خلاقیت تک اسی ربوبیت کے ظہور کے لئے ہے مخلوق ہی نہ ہو تو مربوب کون ہو گا۔

حیات کے اسباب اور ضروریات زندگی کی فراہمی ہے۔

معاشی مسائل کا توحیدی حل

اسلامی توحید کی اس تھوڑی سی تمہید و تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح الوہیت و ربوبیت کی صفت میں غیر اللہ کو شریک جاننا اسلام کی نگاہ میں شرک ہے اسی طرح ان کی ماتحتی صفت رزاقیت میں کسی غیر کو شریک اور ساجھی جاننا یا رزق و معاشی تدابیر و اسباب کو بالذات مؤثر و فاعل جاننا بھی توحید کے منافی اور شرک ہی ہے۔ لہٰذا اسلامی معاشیات کی رُو سے معاشی مسائل و مشکلات کا سب سے بنیادی و توحیدی حل اسباب کے اختیار کرنے کے ساتھ نظر و اعتماد تمامتر مسبب الاسباب اور اس کی رزقی ضمانت پر رکھنا اور یہ سمجھنا ہے کہ جس طرح اللہ رب بلا شرکت غیرے وُہی اور تمامتر وہی ہے ھو الرزاق ذو القوۃ المتین اور اس نے اکیلے انسان ہی کی نہیں ہر جاندار کے رزق کی ضمانت بذات خود لے رکھی ہے۔ وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔

۲۔ اس کی کارگر تدبیر

اور اس لئے طلب رزق کے تمامتر انفرادی و اجتماعی وسائل و تدابیر میں اصل کارگر تدبیر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی یعنی اس کے اوامر و نواہی یا احکام کی زیادہ سے زیادہ پیروی ہے اسی کا نام تقویٰ کی زندگی ہے جس پر معاشی ہی نہیں معاشی و غیر معاشی انسان کے تمام مسائل و مشکلات کا حل موجود ہے۔ کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تقویٰ یا طاعت و خشیت کا تعلق رکھے گا اس کے لئے ہر مشکل سے نکلنے کا وہ راستہ پیدا فرما دے گا اور بے نشان و گمان راہوں سے رزق عطا فرمائیگا ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا

وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ

۳- اندھی اشتراکیت کی ایک ہی لاٹھی

البتہ زندگی چونکہ صرف یہی زندگی نہیں بلکہ اصل زندگی آخرت کی ابدی زندگی ہے جس کے مقابل میں دنیا کی حقیر و فانی زندگی محض بے لبساط و بے مایہ ہی نہیں بلکہ آخرت سے کاٹ کر دنیا کی زندگی اسلام کی نگاہ میں قطعاً عبث یا سرے سے بے مقصد و بے معنیٰ لہو و لعب ہو کر رہ جاتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی رزق رسانی اور رزقی ضمانت کا قانون سب کو خالص اسی دنیوی زندگی کے مدنظر اندھی اشتراکیت و اشتمالیت کی ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا یا معاشی مساوات کا ڈھنڈورا پیٹنا قطعاً نہیں وہ اپنی رزقی ضمانت و تقسیم میں اہل ایمان و تقویٰ کی اخروی زندگی کے منافع و مضار کی زیادہ سے زیادہ رعایت فرماتا ہے اور بندہ کے خدا و آخرت پر ایمان و تقویٰ کی شان کا لازمی تقاضا بھی یہی ہے کہ آخرت کی خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی زندگی کی صلاح و فلاح کی زیادہ سے زیادہ اور اس کے مقابلہ میں دنیا کے عیش و آرام کی پرواہ کم سے کم کرے۔

فقر و فاقہ کی تمنا کا نبوی اسوہ

اسی حقیقت و اسوہ کو تو حدیث کی مشہور روایت میں اس طرح واضح فرمایا ہے کہ حضورؐ کو اختیار دیا گیا کہ آپ چاہیں تو آپ کے لئے مکہ کی پوری وادی کو سونا ہی سونا کر دیا جائے، اس پر بھی آپ نے درخواست کی کہ اے میرے پروردگار میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن کھانے کو ملے اور ایک دن نہ ملے۔

اللہ اکبر! سوچنے کی بات ہے کہ جب تک آخرت کی غیبی زندگی

پر ایمان وایقان، آنکھ کے سامنے کی اس محسوس ومشاہد دنیوی زندگی سے بھی زیادہ نہ ہو کوئی احمق سے احمق بھی فقر وفاقہ کو مجبوراً گوارہ ہی نہیں، اس کی خوشی خوشی تمنا ودرخواست کرسکتا ہے، صحیحین یعنی بخاری ومسلم دونوں کی ایک روایت میں اسی حقیقت کا اور زیادہ قوت سے بیان ہے جس کا ذکر خفیف تفاوت کے ساتھ پہلے بھی کہیں آچکا ہے، ایک دن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آستانۂ اقدس پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ کوئی بستر نہیں صرف چمڑے کا تکیہ ہے اور کھجور کے پٹھوں کی چٹائی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے ہیں جس کے گہرے نشانات تک جسم مبارک پر پڑ گئے ہیں۔

حضرت عمرؓ اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ غایت ادب سے یوں عرض کیا کہ حضور دعا فرمائیں کہ امت کو وسعت وفراخی عطا ہو، روم وایران والوں تک کو اللہ نے وسعت وفراغت بخشی ہے، حالانکہ وہ خدا پرست بھی نہیں (بت پرست ہیں) اب سنئے کہ حضورؐ کا کیا جواب تھا؟ فرمایا "اے فرزندِ خطاب کیا تم ابھی تک شک (یا مغالطہ میں) ہو ان لوگوں کو تو جو کچھ لطف ولذت ملنا تھا اسی دنیوی یا پست زندگی میں مل گیا، دوسری روایت میں اور صاف ہے کہ "کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لئے آخرت مطلب وہی کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کا عیش وآرام اتنا بے بساط ہے کہ اس کو بذاتِ خود کسی درجہ میں بھی مطلوب بنانا مومن کی شانِ ایمان سے بعید ہے"

ذہنی وایمانی انقلاب اس طرح معاش کے معاملہ میں امیر وغریب فرد وجماعت، راعی ورعایا سب کی نہ ختم ہونے والی ذہنی ودماغی الجھنوں اور پریشانیوں، مسائل ومشکلات کا اسلامی حل وعلاج بھی ذہنی وایمانی انقلاب ہے،

کہ ایک طرف خدا کی رزقی ضمانت پر اعتماد ہو اور دوسری طرف دنیا کی انتہائی سے انتہائی تنگی کے حالات میں بھی یہ حقیقت ذہن سے اوجھل نہ ہونے پائے کہ یہ زیادہ سے زیادہ چند روزہ مسافرانہ زندگی کا جھگڑا ہے وہ بھی ایسی کہ یقین ایک دن کا بھی نہیں، انسان کا اصلی وطن اور عیش و آرام کا گھر تو آخرت کا گھر ہے لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَۃِ ط گھر کے اس باغ کی ایک پھول پتی بھی مقدور بھر مرجھانے نہ پاتے ؂

گر نہ باغے دل قلاحے کم بود ۔۔۔۔ بر دلِ زاہد ہزاراں غم بود

کسب کے امر و اجازت کا اصل مقصود

اس کے بعد حصولِ رزق یا معاشی کسب و طلب کی تدابیر و اسباب کی نوعیت صرف یہ رہ جاتی ہے کہ اُن کے اختیار کرنے کا امر و اجازت جو کچھ اور جس درجہ میں بھی ہے اس لئے نہیں کہ جو خدا لاکھوں کروڑوں دیگر حیوانی انواع کی اربوں کھربوں تعداد کی بلا ان کو معاشی مسائل و مشکلات کے حل کی ذہنی کوفت میں ڈالے پرورش فرماتا رہتا ہے وہ دو ڈھائی ارب انسانوں ہی کے حق میں معاذ اللہ اپنی رزقی ضمانت کے واجبات ادا کرنے سے عاجز ہے، بلکہ کسب و رزق کی سعی و تدبیر کے امر و اجازت اور اُن کے احکام سے بھی اصل مقصود انسان کی خصوصی و امتیازی فطرت، اس کی خلافت و عبدیت کی پرورش و تکمیل ہی ہے

عبدیت کی تکمیل

اور یہ تربیت و تکمیل موقوف ہے دیگر حیوانات کے مقابلہ میں ہماری صفت اختیار یا ارادہ کی زیادہ سے زیادہ آزادی اور کم سے کم پابندی پر یعنی کسب معاش کے مشاغل کی دوڑ میں افراد کے اختیار و ارادہ

پر پابندیاں کم سے کم ہوں اور انفرادی پسند و خواہش کی ایسی آزادیاں زیادہ سے زیادہ جن سے دوسرے افراد کی آزادیوں میں بیجا خلل و مداخلت نہ ہو نہ کہ انفرادی صلاحیتوں میں قدرت نے جو عظیم تفاوت رکھا ہے اس کے استعمال سے معاشی میدان میں باہمی مسابقت اور ایک دوسرے سے بڑھنے کے مواقع پر قدم قدم پر بریک لگایا جائے اور معاشی برابری کے نام سے فوجی پریڈ کی طرح سب کو قدم ملا ملا کر برابر چلنے پر مجبور کیا جائے

انفاقی ذہنیت و عادت معاشیات کی کسبی سرگرمیوں میں حلال و حرام کی حدوں کے اندر رہ کر مسابقت کی اس پوری آزادی کے ساتھ اسلامی و قرآنی تعلیمات کا اصلی زور کسب معاش کی حرصی یا تطفیفی ذہنیت کے بجائے زیادہ سے زیادہ انفاقی ذہنیت و عادت پیدا کرنے پر ہے کہ جس فرد کے پاس اپنے اور اپنے زیر کفالت متعلقین کے حقیقی واجبی مصارف سے جو کچھ بھی بچے وہ زیادہ سے زیادہ معاشرہ کے دوسرے حاجتمند و حقدار افراد کی مناسب خدمت و اعانت میں صرف کرتا ہے بلکہ خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلائے وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔

قانون و حکومت کے جبر و خوف سے نہیں تمام تر خود اپنی خوشی و اختیار سے اور خود اپنی ہی خلافتی یا انسانی فطرت کی تربیت و تکمیل یا آخرت کی فوز و فلاح جان کر،

اسلامی سرمایہ داری کے معنی اس طرح اسلامی معاشرہ میں سرمایہ داری و جاگیرداری کے معنی بھی یہ ہوں گے کہ جو افراد دوسروں کے مقابلہ

میں معاش کے کسب و حصول کی بہتر صلاحیتیں رکھتے ہیں ایک طرف ان کو پوری طرح
بروئے کار آنے کا موقع ملے اور دوسری طرف جو کچھ زیادہ ان کے پاس اپنی حاجات
اصلیہ سے بچے اس کو دوسرے کم تر صلاحیت والوں پر خوشی خوشی خرچ کر دیں جس
کے لئے نہ ان کو ٹریڈ یونین بنانی پڑے نہ ہڑتالیں کرنا پڑیں نہ دھرنا دینا پڑے
اور نہ سرن برت کی دھمکیوں سے کام لینے کی ضرورت ہو اور نہ آئے دن کی
طرح طرح کی اجتماعی شورشوں سے شہریوں کا امن و امان غارت ہوتا ہے جس
کی بدولت پولیس و فوج کو کہیں لاٹھی چارج کرنا پڑے کہیں گولیاں چلانا پڑیں اور
جان و مال سب کی بربادی ہی بربادی ہوتی رہے ،

معاشی عدم مساوات ہی ضروری ہے

ان اصول و مبادی پر عمل کے
بعد نہ سرمایہ داری کے مفاسد رہتے ہیں نہ ان کو مٹانے کی ضرورت اور اشتراکیت
کے مفاسد کو پھیلانے کی حاجت نہ ہر فرد کا معاشی معیار بلند و برابر ہونا ضروری
رہتا ہے بلکہ انسان کی انسانی یا اختیاری خلقت و فطرت کی ترقی و تکمیل کے لئے نابرابری
و عدم مساوات ہی ضروری ہے تاکہ شاہ و گدا، غنی و محتاج، سرمایہ دار و نادار، جاگیر دار
و کاشتکار، کارخانہ دار و کامگار سب ہی اپنے اپنے محل و مقام کے لحاظ سے صبر و
شکر، انفاق و توکل، رضا و قناعت وغیرہ کی مختلف راہوں سے اعلیٰ سے اعلیٰ
روحانی و اخروی کمالات و درجات حاصل کر سکیں، بعضوں کو ان کمالات میں
ترقی کے لئے اگر جاہ و مال کی وسعت اور خوشحالی سازگار ہوتی ہے تو اکثروں
کو متوسط الحالی بہتوں کو تنگ حالی اور کسی کو فقر و فاقہ ہی راس آتا ہے، ایک
حدیث کا خلاصہ بھی یہ ہے کہ بعضوں کے دین و ایمان کی حفاظت فقر میں ہے
اور بعضوں کی غنا میں (او کما قال) بس مسلمان اسی کا نام ہے جس کو دین و آخرت

کی فکر دنیا سے زیادہ اور بہت زیادہ ہو، پھر اس کا رب یا پروردگار اس کی روحانی واخروی پرورش تربیت و ترقی کے لئے قبض وبسط، کشادگی و تنگی جس معاشی حال و معیار کو اس کے حق میں بہتر جانے گا اس میں رکھے گا۔ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا اھ

مومن کی شان یہ تو دنیا پرستوں اور عجلت پسندوں کی بے صبری و کم ظرفی ہے کہ وہ آخرت کو چھوڑ کر دنیا ہی کی زندگی کو زندگی کا حاصل جانتے ہیں بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۔ مومن کی شانِ ایمان یہ نہیں کہ وہ آخرت کی خَيْرٌ وَّاَبْقٰى زندگی کے اعلیٰ و ابدی درجات و مراتب یا نعمتوں کے بجائے دنیا کے عیش و آرام یا اجر و مزد کو مقصود بالذات بنالے اور بس ۔

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مزد مکن کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

ایمان کا سودا مومن کے لئے دنیا کی حیثیت بالکل تجارتی جد و جہد کے بازار کی ہے، جہاں محنت و مشقت مال و دولت کا سرمایہ لگاتے ہی نفع نہیں ملنے لگتا، بارہا سالہا سال انتظار کرنا پڑتا اور پھر بھی کبھی کبھی سراسر خسارہ ہی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، مومن نام ہی اس کا ہے جو ایمان لاتے ہی جان و مال کی اپنی ساری پونجی کا سودا جنت و آخرت کے بدلہ میں اپنے مالک و مولیٰ کے ہاتھ کر چکتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ اگر ایمان کی حقیقت کا کچھ بھی شعور و ادراک ہو تو اس سودے میں تن من دھن سب کی بازی لگا کر بھی مومن کی زبان پر یہی ہوگا ع

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

غرض معاشی مسائل و مشکلات کے اصل اسلامی حل کا خلاصہ یہی ہے کہ ملک و معاشرہ میں خدا سے خصوصاً اس کی غیر مشرکانہ رزاقی توحید، اور آخرت پر ایمان اور اسی ایمان پر مبنی اختیاری انفاق و تقوے کی ذہنیت و زندگی کو زیادہ سے زیادہ کمیت و کیفیت ہر اعتبار سے ابھارا اور بڑھایا جاتے، اسلامی حکومت کا اصلی کام بھی ایمان و عمل صالح کے ایسے ہی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل ہے جس میں اختیاری اعمال صالحہ زیادہ سے زیادہ پروان چڑھ سکیں۔

اختیار کی حد بندی لیکن انسان کی اختیاری و خلافتی خلقت ہی کا دوسرا لازمہ ہے کہ اپنے اختیار و ارادہ کی حد تک جس طرح وہ خیر کی طرف جانے کیلئے مختار و آزاد ہے اسی طرح شر کی طرف، اور یہ شر پسندی معاشرہ کے دوسرے افراد کے لئے چونکہ شر انگیزی یا خیر کی راہوں میں مزاحمت کا موجب ہوتی ہے اس لئے معاشی آزادی و اختیار کو حدود میں رکھنے کے لئے کسب و انفاق دونوں کے معاشی مشاغل میں کچھ نہ کچھ جبری یا قانونی پابندیاں بھی لابد ہیں، مثلاً سود کی تمام جلی و خفی، بواسطہ و بلاواسطہ صورتوں کی بندش، شراب و قمار اور عصمت فروشی وغیرہ منکرات کے استعمال و ارتکاب ہی کی نہیں ان کے کاروبار اور محرکات کی بھی ممانعت، نیز خرید و فروخت وغیرہ کے معاملات میں ایسی شکلوں پر پابندیاں جن سے فریقین معاملہ میں سے کسی ایک یا دونوں کی کسبی حرص و نفع بازی کی ہمت افزائی یا معاشی ضرر و خسارہ کا پہلو نکلتا ہو، تفصیل اوپر اپنی جگہ گذر چکی

زکوٰۃ اسی طرح انفاق کے باب میں اصل انفاقی تعلیم تو افراد و معاشرہ میں ایسی عادت و ذہنیت پیدا کرنا ہے کہ اپنی حقیقی و واجبی حاجتوں سے جو کچھ

جس کے پاس فاضل (عفو) ہو، مناسب طور پر بلا کسی جبر و قانون، خوش خوش خود ہی حاجتمند افراد و ادارت کی خدمت اور نفع رسانی میں خرچ کرتا ہے مگر کسب کی اختیاری راہوں اور آزادی ہی کی بدولت انسان یہودی شائلاکوں اور مہاجنی سود خواروں کی حرص کسب تک جا پہنچتا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ واجبی و معقول ضروریات سے جس کے پاس کچھ بچ جائے اور ایک معتدبہ مدت (سال بھر) تک بچا رہے جو واجبی ضرورتوں سے فاضل ہونے کی کھلی دلیل، تو اس بچت کا کچھ حصہ قانونی طور پر وصول کر کے معاشی مدد کے مستحقوں، یا تنگ دستوں کو انتظام کے ساتھ پہنچا دیا جائے توخذ من اغنیائھم وترد الیٰ فقرائھم، یہی اسلام کا قانونی و جبری ٹیکس یا زکات ہے یہ قانونی اخذ ورد صرف چاندی سونے یا روپیہ پیسہ کی حد تک محدود نہیں اموال تجارت و زراعت وغیرہ سب میں اس کے منضبط قواعد شریعت نے رکھے ہیں۔

قانونِ وراثت پس انداز مال و دولت کے پھیلتے اور تقسیم ہوتے رہنے کی یہی غرض و غایت بڑے متوازن و حکیمانہ طریقے سے اور بالکل قدرتی طور پر اسلام کے قانون وراثت سے پوری ہوتی ہے آدمی قدرتاً چاہتا ہے کہ اس کی محنت و مشقت کے منافع و ثمرات سے خود اس کے اہل و عیال اعزہ و اقرباء حسب قرب و قرابت زیادہ متمتع ہوں جس کے لئے ایک طرف وہ زراعت و تجارت صنعت و حرفت وغیرہ معاشی ذرائع کسب میں زیادہ سے زیادہ سرگرمی و دلچسپی ہی سے کام نہیں لیتا جو ان ذرائع کی ترقی کا سبب ہوتی ہے بلکہ اسی داعیہ و جذبہ کے تحت کفایت شعاری و حسنِ انتظام سے

کام لے کر حسب وسعت تھوڑا بہت متعلقین و پس ماندگان کے لئے پس انداز کرنے کی بھی فکر کرتا ہے اسی طرح یہ فطری رجحان نہ صرف کمال سرگرمی کے ساتھ دولت کی پیدائش، اس کی حفاظت اور کفایت کے ساتھ خرچ کرنے میں ممد و معاون ہوتا ہے بلکہ شرعی قانون وراثت کی برکت سے ہر شخص کی پس انداز دولت بے تکلف اور خوش خوش ورثاء در ورثا میں تقسیم در تقسیم کے ذریعہ معاشرہ میں از خود بلا جبر و اکراہ پھیلتی جاتی ہے،

مضر و مسرفانہ عادت تقسیم دولت کے ان دو گونہ قوانین، زکوٰۃ و وراثت پر آگے قانونی و نیم قانونی اسلام کی کچھ اور تعلیمات کے معاشی فوائد و نتائج کا اضافہ کر لیں۔

(۱) ایک تو اسلامی معاشرہ میں یہی نہیں کہ بڑے بڑے منکرات و فواحش، شراب خواری، قمار بازی، حرام کاری وغیرہ اور ان کی ترغیب و دعوت دینے والے فسق و فجور کے کھلے ہوئے اڈوں۔ شراب خانوں، قمار خانوں، رقص خانوں، ہیکلوں سینما گھروں، فحش تصویروں، کتابوں وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی، بلکہ سگرٹ بیڑی کی سی مضر و مسرفانہ عادتوں، آتش بازی کے سے لایعنی کھیل تماشوں کا شمار بھی منکرات یا مکروہات و فضولیات یعنی ناشائستہ و ناپسندیدہ افعال و حرکات ہی میں ہے

سگرٹ اور بیڑی ان افعال و عادات میں خالی ایک سگرٹ اور بیڑی کی جانی و مالی برکات کہاں تک پہنچتی ہیں اسی ہفتہ (۹ر نومبر ۵۴ء) کے اخبار میں یہ خبر نظر پڑی کہ برطانیہ کے وزیر صحت نے کسی سوال کے جواب میں تبلایا کہ تمباکو ہی

نہیں سگریٹ کے کاغذ سے جو دھواں پیدا ہوتا ہے اس سے بھی سرطان جیسے موذی مرض کا اندیشہ رہتا ہے ورنہ نفس نمبا کو تو پرانے نئے جس حکیم و ڈاکٹر سے چاہیں پوچھ دیکھیں سینہ اور دل و دماغ کے اعضائے رئیسہ تک کے حق میں زہر ہی بتائیگا۔

یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اور جمہور کی خیر خواہی کا دن رات کلمہ پڑھتے ہوئے نام نہاد جمہوری حکومتوں کی طرف سے اسی جان و مال دونوں کی دشمن عادتوں کی اجازت ہی نہیں کیسی کیسی تاکید ہوتی ہے کہ گذشتہ نومبر ۵۳ء کے آخری ہفتہ میں برطانیہ ہی کے ایک دوسرے وزیر خزانہ نے برطانوی عوام سے اپیل فرمائی کہ "خدا کے لئے سگریٹ نوشی چھوڑ دیجئے گا نہیں اس سے حکومت کو چھ کھرب سالانہ ٹیکس ملتا ہے جل جلالہٗ" ! یہ اعداد یقیناً طباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے تاہم غالباً ایک آدھ ارب پونڈ یا اربوں روپیہ کی تعداد تو ہو گی ہی۔ اور یہ صرف وہ ٹیکس ہے جو کہ برطانوی عوام کی جیبوں سے نکل کر برطانوی وزیر خزانہ کے خزانہ میں چلا جاتا ہے تو خود سگریٹ پینے والوں وہ بھی صرف برطانیہ والوں کی کتنی دولت دھویں میں اڑ جاتی ہو گی اور پھر اسی سے اگر پوری دنیا کے محض اس ایک ہی مکروہ و منکر کی خیر و برکت کا حساب لگایا جائے تو کھربوں پونڈ نہ سہی کھربوں روپیہ تک میزان کا پہنچ جانا کیا تعجب کی بات ہو گی؟

اگر پوری دنیا کے تمام ایسے عوامی مصارف و اخراجات کا دروازہ قانوناً بند کر دیا جائے جو اسلامی تعلیمات کی رو سے قطعاً محرمات یا منکرات کی فہرست میں داخل ہیں تو معاشی منصوبہ بازیوں کے بغیر اربوں کھربوں کیا شاید سنکھوں کی دولت دنیا کی کل دو ڈھائی ارب انسانی بستی کے معاشی مسائل و مشکلات کو حل کر دینے کے لئے بے تکلف بچ اور بچائی جا سکتی ہے بلکہ یہ مسائل و مشکلات

معمولی حالات میں کوئی سنگین صورت اختیار ہی مشکل سے کر سکتے ہیں

افسوس کہ ہندوستان و پاکستان دونوں کے بعض احباب کو زحمت دینے کے باوجود پوری دنیا کیا کم از کم ان دونوں ملکوں کے بھی ان محرمات و مکروہات پر مصارف کے اعداد فراہم نہ ہو سکے، تاہم بالکل حسن اتفاق کہ کتاب جب پریس میں ہے تو خود اپنے گھر (ہندوستان) کے اور سگریٹ بیڑی ہی سے متعلق کچھ سرکاری اعداد ہاتھ آگئے جو انشاء اللہ وہ قیاس کن زگلستان من بہار مرا، کا کام تو دے ہی جائیں گے۔ اسی ۲۰ اپریل کی نئی دہلی سے نکلی ہوئی سرکاری اطلاع ہے کہ

ہندوستان میں تمباکو نوشی کی ترقی روز افزوں ہے ۵۳ء میں خود ہندوستان کے بنے ہوئے سگریٹ اٹھارہ ارب باون کروڑ ستر لاکھ استعمال ہوئے تھے ۵۴ء میں ترقی کر کے یہ تعداد انیس ارب ستر کروڑ ساٹھ لاکھ تک جا پہنچی اور بیرونی سگریٹوں کی تعداد تین کروڑ چالیس لاکھ سے بڑھ کر پانچ کروڑ چالیس لاکھ تک گئی دیہاتوں میں خالی بیڑی کا خرچ ۵۴ء میں گیارہ کروڑ چھہتر لاکھ اکیاسی ہزار (عدد نہیں) پاؤنڈ تک پہنچا،،

معلوم ہوا کہ ایک پاؤنڈ تمباکو میں پانسو بیڑیاں بنتی ہیں جن کی قیمت ڈھائی روپیہ ہوتی ہے اس حساب سے فقط دیہات اور خالی بیڑی کی صورت میں ساڑھے انتیس کروڑ کی تمباکو پی ڈالی جاتی ہے اس کے علاوہ حقے میں جو تمباکو خرچ ہوتی ہے اس کا وزن اسی سرکاری اطلاع میں ۲۶ کروڑ ۶۴ لاکھ ۴۳ ہزار پونڈ بتلایا گیا ہے یعنی بیڑیوں کے مقابلہ میں تگنے سے بھی زیادہ۔

پان پھر پان کے سلسلہ میں تمباکو پر خود پان اور اس کے لوازم چونے، کتھے

ڈلی، الائچی وغیرہ مسالوں کی مد کا مزید اضافہ بھول جائیں اور اس کا اندازہ ان مسالوں کو چھوڑ کر صرف پان کے پتوں اور وہ بھی صرف ایک شہر بنارس کی تعداد سے فرمانے چلیں جہاں ہر سال قریبًا سولہ لاکھ روپیہ کے پان استعمال ہو جاتے ہیں[1] یعنی ماہوار ایک لاکھ سوا تینتیس ہزار سے زیادہ اور روزانہ ساڑھے چار ہزار کے قریب جس کا مطلب یہ ہوا کہ محض ایک پان اور اس کے سازو سامان کی مد فضول پر کچھ نہیں تو ہندوستان و پاکستان دونوں میں سالانہ وماہانہ نہیں روزانہ لاکھوں کے وارے نیارے ہوتے رہتے ہوں گے

ستم ظریفی بات میں بات ماڈرن سیکولر حکومتوں کی ستم ظریفیاں بھی کس بلا کی ہوتی ہیں اسی ۲۱ر جون کے ۵۵ء کے اخبار میں پڑھا کہ مرکزی حکومت نے تمام صوبائی حکومتوں کو ایک مراسلہ کے ذریعہ بچوں میں تمباکو نوشی کے بڑھتے ہوئے شوق کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس کے خلاف اقدامات کی ہدایت کی ہے ساتھ ہی مرکزی سرکار نے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ ان اقدامات میں محکمہ صحت عامہ اور تعلیمات کا تعاون واشتراک حاصل کیا جائے، سبحان اللہ! کیسی قابل داد اور ستم ظریفانہ ہدایت ہے کہ خود یہ اقدامات فرمانے والے محکمہ صحت کے افسرو ڈاکٹر اور تعلیمات کے ٹیچرو پروفیسر علانیہ مریضوں اور شاگردوں کے سامنے دھواں اڑاتے اور زبان مبارک سے یہ وعظ سناتے رہیں کہ

من نہ کردم شما حذر بکنید

غریب ان ماتحت در ماتحت محکموں والوں کا ذکر ہی کیا جبکہ خود مرکزی حکومت کے اعیان ووزراء بھرے مجمعوں اور کونسلوں میں دھواں دھار تقریروں کے ساتھ ساتھ سگار وسگریٹ کا دھواں اڑانے میں کوئی کمی نہ فرماتے ہوں، اپریل

---

[1] روزنامہ قومی آواز، ۷ر اپریل ۵۵ء

سن رواں (۱۹۵۵ء) اور نئی دہلی کی خبر ہے کہ کانگریس کے سابق صدر ہمارے مشہور نیک نام راج رشی ٹنڈن جی نے کہیں اور نہیں لوک سبھا کے عین اجلاس میں وزراء جو جنتا (عوام) کے نمائندے اور نیتا (لیڈر) ہیں ان کو کسی طرح روا و زیبا نہیں کہ خود اپنے عمل سے اس عادتِ بد کی ہمت بڑھائیں، ان کو سگرٹ نوشی بالکل ترک کر کے عوام کو اپنی مثال سے سبق دینا چاہیئے، احتجاج کا نتیجہ ظاہر ہے بس تھوڑی دیر کے لئے لوک سبھا میں غل غپ کا سامان ہو گیا ورنہ کس وزیر نے اس احتجاج و نصیحت کا اتنا اثر بھی لیا ہوگا کہ اپنے معمول کی ایک سگرٹ ہی روزانہ کم فرما دی ہو!

شراب وغیرہ مسکرات لیجئے چلتے چلاتے جب کتاب کے پروف ہاتھ میں ہیں ۲ر جولائی (۱۹۵۵ء) کے اخبار میں ایک اور عددی حقیقت شراب وغیرہ کے مسکرات کے متعلق ہاتھ آگئی جو اسلامی شریعت کی رو سے تمباکو کی طرح خالی مکروہ ہی نہیں قطعاً حرام ہیں لکھا ہے کہ آبکاری سے حکومت کو جو صرف ٹیکس وصول ہوتا ہے وہ ۴۲ کروڑ ہے اور عوام کے متعلق اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کا چوگنا یعنی پونے دو ارب کے قریب نشہ بازی کی مدہوشیوں میں اڑا دیتے ہیں

تفریحات ان اسلامی قطعی محرمات اور نیم محرمات یا مکروہات دونوں کی جامع وہ مد مدید ہے جس کو آج نہایت معصومانہ سادگی سے تفریحات کہا جاتا ہے مراد سینما و ریس وغیرہ یوپی حکومت کی ایک رپورٹ کے حوالہ سے ۱۹ر اپریل ۱۹۵۵ء کے اخبار میں تھا کہ صوبہ کی حکومت کو تفریحی ٹیکسوں سے ساڑھے سات لاکھ روپیہ ماہوار آمدنی ہوتی ہے بالفاظ دیگر نوّے لاکھ سالانہ، ساتھ ہی عین توقع کے مطابق یہ خوشخبری درج ہے کہ عوام میں سینما اور ریس کا شوق دن بہ دن بڑھ رہا ہے۔

اور اسی اوسط سے تفریحی ٹیکس میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے "۔ رہا حکومت کی اس آمدنی سے غریب عوام کی جیب پر ڈاکہ کا سوال ؟ تو اس کا اندازہ اگر ٹیکس کا چوگنا پنچ گنا ہی رکھا جائے تو سالانہ چار پانچ کروڑ ہوا۔ اور ماشاء اللہ بھارت کے غالباً ۲۷ صوبوں میں یہ صرف ایک صوبہ کی تفریحی ترقی کی رفتار ہے جو ابھی ۵۳-۱۹۵۲ء تک ساڑھے سات لاکھ ماہوار ٹیکس کے بجائے صرف ساڑھے سات ہزار سے کچھ ہی زیادہ ہوتا تھا باقی صوبے کچھ چھوٹے ہی سہی ان کا اوسط کچھ کم رکھ لیں تو بھی سالانہ محض ان تفریحات کی نذر ایک ارب کے لگ بھگ ہو جاتا ہوگا اور یہ جب ہے کہ ابھی ہندوستان اتنا پسماندہ اور ترقی سے اتنا بیگانہ ہے کہ اس کی سب سے بڑی اسی فیصد سے بھی زائد آبادی کے دیہات ان تفریحات سے محروم ہیں بس جو تھوڑے بہت ان میں چھوٹے بڑے شہروں تک آجا سکتے ہیں وہی ان تفریحات وترقیات سے مستفید ہو پاتے ہیں۔

مباحات وماموراتؔ محرمات ومکروہات کے بعد تیسرا درجہ ان واقعی تفریحات کھیل کود، سیر وشکار، زینت وآرائش وغیرہ کے مباحات کا ہے جو اسلام کی نظر میں نہ صرف جائز بلکہ حدود کے اندر پسندیدہ ہیں ان میں بھی بلکہ کھانے پینے میں لباس ومکان شادی بیاہ وغیرہ ضروریات تک میں اسلامی زندگی کی خاص امتیازی شان حدود شناسی اور میانہ روی ہے اعتدال سے تجاوز اسراف اور فضول خرچی کا روادار شریعت کا مزاج، جب ضروری سے ضروری ضروریات تک میں نہیں تو غیر ضروری تفریحات ومباحات کا ذکر ہی کیا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ جائز ومباح یا مامور ضروری مصارف میں بھی کہیں اگر نام ونمود، شان وشوکت، کبر وریاء یا اپنی بڑائی اور برتری دکھلانے جتلانے کا کوئی جذبہ

وشائبہ، نیت وارادہ کام کر رہا ہو تو وہ بھی جواز واباحت یا ضرورت کے دائرہ سے نکل کر سرے سے حرام ہو جاتا ہے

ایک شادی بیاہ کے ضروری معاملہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کے اصل واجبات کو پورا کرنے کے لئے کتنے کم خرچ کی ضرورت ہے اور غیر اسلامی رواج و رسموں اور جہیز وغیرہ کی نمود و نمائش کے مصارف کی بدولت ہر چھوٹا بڑا اپنی حیثیت کے دیکھتے کتنا زیادہ زیر بار ملکہ دیوالیہ ہوتا رہتا ہے مہینوں کیا برسوں پہلے تیاریاں ہوتی رہتی ہیں، کھانے پینے کی واجبی ضروریات تک کا پیٹ کاٹ کر رسمی فضولیات کے لئے روپیہ جمع کیا جاتا ہے پھر بھی بہتوں کو قرض دوام سے چارہ نہیں رہتا جس کی ادائی کے لئے تقریبات ختم ہو جانے پر بھی کتنوں کو سالہا سال تک روزمرہ کا تن پیٹ کاٹتے ہی بن پڑتا ہے، بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اچھے اچھے خوشحال علماء و صلحاء تک کو دیکھا کہ ان تقریباتی رسمی و نمائشی اخراجات ہی کی بدولت ہزاروں کی آمدنی رکھ کر بھی بیماری آزاری کی کوئی ہنگامی مصیبت آپڑی تو قرض تک پر مضطر ہو جاتے ہیں۔ حساب لگایا جاتے تو چھوٹے بڑے ملکوں کا ہزاروں لاکھوں نہیں، کروڑوں اربوں کا سرمایہ طرح طرح کی تقریبات کی محض رسمی و رواجی حماقتوں میں نکل جاتا ہوگا۔

میک اپ قیود و حدود کے اندر عورت کو زیب و زینت کی اجازت ہی نہیں شوہر کی کشش و محبت حاصل کرنے کے لئے اسلام نے ترغیب بھی دی ہے لیکن آج کل کی شمع انجمن بیویاں اور لڑکیاں، انجمنوں کانفرنسوں، جلسوں، جلوسوں، بازاروں، سڑکوں، گلیوں، سینما گھروں، ہر جگہ اپنی حیثیت و وسعت سے بڑھ چڑھ کر اور شوہروں سے زیادہ غیروں کو دعوت نظارہ دینے کے لئے بناؤ

سنگار یا میک اپ کے ماڈرن سامانوں لپ اسٹک پوڈر کریم وغیرہ پر ہندوستان و پاکستان جیسے مفلس ملکوں کا کروڑوں روپیہ وہ بھی زیادہ تر ان سامانوں کی درآمد کے ذریعہ دوسرے ملکوں کی جیبوں میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ روپیہ کی اس بیشمار بربادی پر وقت و قوت کی اس دولت کا بھی اضافہ کرلیں جو ترقی یافتہ مائیں بہنیں بال بچوں کی پرورش اور گھر بار کی دیکھ بھال کی جگہ میک اپ کی نذر کردیتی ہیں جس کا کچھ اندازہ دن رات کی ان پروگرامی ہدایات سے ہوا جو ایک اخبار میں میک اپ کی معلمہ ایک مسلمان خاتون کے قلم سے نظر پڑی تھیں مضمون کوئی دو کالم کا لمبا تھا اور پروگرام دن رات کا ملاکر گھنٹوں تک جاتا ہوگا۔

بیچاری چراغ خانہ

کا اسراف جو کچھ تھا وہ زیادہ تر زیور کپڑے تک محدود تھا۔ زیور بھی عموماً سونے چاندی کے جو پرانے ہوتے پر بھی قیمت قریب قریب نئے ہی کی دے جاتے تھے کپڑوں تک کا سچا کام اپنے کچھ نہ کچھ دام ادا کر جاتا تھا پھر یہ کپڑے اور زیور پشتہا پشت منتقل ہوتے اور اولاد در اولاد کی شادی بیاہ میں کام آتے رہتے تھے بخلاف نئے فیشن کی مسرفانہ چیزوں کے کہ وہ فیشن پرستوں کی زندگی ہی میں آئے دن پرانی یا خارج از فیشن (آؤٹ آف فیشن) ہوتی رہتی ہیں اور بازار میں مشکل ہی سے ان کی کوئی قیمت رہتی ہے۔

ماڈرن کھیل

یہی حال ماڈرن کھیلوں کا ہے کہ ان کے صرف سامان ہی

گراں و مسرفانہ نہیں ہوتے بلکہ ان کے میچوں، مقابلوں دیکھنے دکھلانے کے انتظاموں اور سفروں کے مصارف ان کے مسرفانہ سامانوں سے بھی بڑھ جاتے ہوں گے ان سفروں نے اتنی ترقی کی ہے کہ شہر بہ شہر ہی نہیں ملک بہ ملک تک ہوتے رہتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان کو لیجئے کہ ایک طرف اپنے عوام کی فاقہ کشی کا رونا روتے رہتے ہیں اور دوسری طرف ان ہی فاقہ کشوں کو روتا چھوڑ کر ہزاروں لاکھوں خرچ کر کے اپنے کھلاڑیوں کو ولایت تک بھیجتے رہتے ہیں حساب لگایا جاتے تو ان غریب مفلس ملکوں کی قومی آمدنی کا کچھ نہیں تو کروڑوں ہی کی تعداد میں قومی سرمایہ گوناگوں مسرفانہ کھیلوں ہی کے گوناگوں مسرفانہ سامانوں انتظاموں اور سیر سپاٹوں میں پانی کی طرح بہہ جاتا ہے

دین کے نام پر بے دینی اور تو اور خود دین اسلام کا ٹھپہ لگا لگا کر جو طرح طرح کی بیدینی کی مدوں میں وہ بھی بہت زیادہ غیروں کی نقالی میں فضول خرچیاں ہوتی رہتی ہیں ان کی فہرست کیا کم لمبی چوڑی ہے، شب برات، محرم چہلم، میلاد بارہ وفات، رجبی شریف، گیارہویں شریف اور بیشمار سیکڑوں ہزاروں عرس اور عرسی میلے ٹھیلے سب اسی فہرست میں تو شامل ہیں پھر ان پرانی فرسودہ و مشرکانہ عادتوں پر جب تہذیب و تمدن، بلکہ ثقافت شریف کی نئی ترقیوں کا رنگ و روغن چڑھ جاتا تو پھر کہنا ہی کیا نور ؐ علی نور،

اگر پہلے صرف مولود شریف تھا وہ بھی زیادہ تر انفرادی اور نجی نوعیت کا محدود پیمانہ پر تو اب میلاد ڈے یا یوم میلاد یا جشن میلاد، شہر شہر بڑے بڑے شہری پیمانوں پر منایا جانے لگا ہے بلکہ دیوالی کی طرح شہر بھر میں گھر گھر چراغاں و روشنی تک کی جانے لگی ہے باقی خود ان میلادی جلسوں کے پنڈالوں، روشنیوں اور دور

دُور سے کرایہ پر مدعو مہمانوں، مقرروں شاعروں وغیرہ پر کون بتا سکتا ہے کہ کتنا روپیہ آتش بازی کی طرح پھک جاتا ہوگا۔ پھر کبھی کبھی تو اس کی بدولت نہایت دردناک حادثے ہو جاتے ہیں گذشتہ سال (۱۹۵۳ء) میں اسی لکھنؤ میں ہزاروں کا پنڈال اور سامان آگ لگ کر راکھ کا ڈھیر لگ گیا، اس سال عین ان سطروں کی تحریر کے وقت بیروت میں ایک جشن میلاد ہی کے حادثہ کی (۸ر نومبر ۱۹۵۴ء) کی خبر آئی ہے جس سے فقط مالی ہی نہیں جانی نقصان اتنا ہوا کہ چھ آدمی تو مر ہی گئے اور زخمیوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچا بھگدڑ میں چھوٹے بچے کچل کچل کر نیم جان ہو گئے اس پر بھی ان جشن بازوں کو نہ عبرت نہ سبق[۱]

جشن باز تو بالعموم عوام ہی ہوتے ہیں ان کو کیا سبق ہوتا جب خود علماء تک ان جشنوں میں بے تکلف شرکت اور ان کی سرپرستی فرماتے ہوں نمود و نمائش وغیرہ کے گوناگوں دینی و اخلاقی مفاسد کے علاوہ ایک کھلا ہوا معاشی مفسدہ اسراف و تبذیر ہی کا کتنا بڑا ہے جس کو اسلام کا خدا صرف ناپسند ہی نہیں فرماتا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ

---

[۱] حالانکہ جشن میلاد ڈے کے جدید جشنوں کا سبق سیکھا گیا ہے خود ان کے گھر سے ابھی ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۴ء عین مسودہ کی نظر ثانی کا وقت نیویارک کے کرسمس یا مسیح کے جشن میلاد ہی کی یہ عبرتناک خبر آئی ہے کہ اس جشن مبارک میں کم سے کم ۲۷۳ نفوس نوجوان ہی سے گئے جن میں ۲۱۱ تو ٹریفک کے حادثوں اور باقی آتش زنی وغیرہ سے اور یہ صرف اس سال کے جشن میلاد کا جانی نذرانہ نہیں کم و بیش ہر سال ہی پیش کرنا پڑتا ہے اسی بناء پر ماہرین اعداد کی پیشگوئی تو اس سال کے لئے بھی یہ تھی کہ صرف ۱۰۲ گھنٹوں کی میلادی تعطیل میں ۷۰۰ آدمی ہلاک ہوں گے، اس پر بھی جب خود استادوں ہی کو عبرت نہیں تو ہم شاگردوں کو کیا ہوا۔

الْمُسْرِفِیْنَ، بلکہ فضول خرچی کرنے والوں کو صاف صاف شیطان کا بھائی ٹھہرایا ہے۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ یعنی مال و دولت روپیہ پیسہ کا بے محل وبے موقع اڑادینا دینی کیا سراسر شیطانی کام ہے اس کے باوجود ان جشنوں کی رونق بڑھانے والے ہمارے علم و دین والے واعظوں نہیں نہیں، مقرروں (کہ واعظ تو اب علماء بھی اپنے کو کہلانا پسند نہیں فرماتے) شاید ہی کوئی بندۂ خدا ہوتا ہو جو ان اسرافی و تبذیری منکرات پر خود کتاب اسلام کی طرح دو ٹوک نکیر کرنا الگ رہا ضمناً و اشارتاً ہی کچھ تفہیم و تنبیہ کر دیتا ہو اور بہتیروں کے ذہن سے تو شاید ان کا منکر ہونا سرے سے محو ہو گیا ہو گا۔ اِنَّا لِلّٰہِ ثم اِنَّا لِلّٰہِ!

بے شبہ شریک ہونے والوں میں ایسے مخلص اہل فہم بھی ہوتے ہیں جو اسلام اور شریعت کے ماشاء اللہ پورے مزاج شناس ہیں اور ان منکرات و خرافات کو سراسر اسلامی مزاج و روح کے منافی ہی یقین کرتے ہوں گے مگر غلبہ حال کی بنا پر شاید اسی کو غنیمت جانتے ہیں کہ ان خرافات کے بہانے سے اپنوں پرایوں کے کانوں میں کچھ نہ کچھ باتیں حق و خیر کی بھی پڑ ہی جاتی ہیں یا اسلام کے کچھ مہمات کی تبلیغ کا موقعہ مل جاتا ہے، اسی نیت سے ریڈیو تک کی دعوت کو رد نہیں فرماتے نیت بخیر ہے انشاء اللہ خطائے اجتہاد کا اجر تو مل ہی جائے گا، مگر اس قسم کے جلسوں جشنوں اور ریڈیو کی اصل وضع پر رنگ چونکہ تفریحی لہو و لعب ہی کا چڑھا ہوتا ہے اور ان میں حصہ لینے والوں اپنوں پرایوں میں نیت شاذ و نادر ہی کسی کی طلب حق یا اصلاح حال کی ہوتی ہے اور ملنا بالکل قدرتی اور نفسیاتی طور پر ہی نہیں عین اسلامی طور پر بھی وہی جس کا ارادہ و نیت ہو۔ لکل امرئ ما نوی زیادہ تر لوگ گویا بس ایک طرح کے مذہبی تماشہ گروں اور ایکٹروں، مقرروں اور خطیبوں کی ایکٹنگ کا لطف اٹھانے آتے ہیں اور اٹھا کر چلے جاتے ہیں یہ کوئی نری قیاسی بات نہیں

ایک بڑے ہی صاحب اخلاص اور صاحب علم و عمل ماشاءاللہ عرب و عجم میں انشأ خطابت کی مسلمہ شہرت کے مالک خود اپنا تجربہ ایسے نمائشی میلادی جلسوں کی نسبت بیان فرماتے تھے کہ تقریر کا نمونہ دیکھنے دکھلانے کے لئے ہم کو بھی کچھ وقت دیدیا جاتا ہے، کیا اس طرح نمونہ دکھلاتے پھرنا دین کی اچھی خاصی رسوائی اور اس کو لہو و لعب بنانے والوں کی ہمت افزائی نہیں؟

اس ناسمجھ کی سمجھ میں تو ایسے ملاہی و ملاعب یا مفاسد کے ضمن و ذیل اور لپیٹ میں اصلاح کی نیت سے بھی جو کام کئے جاتے ہیں قدرتاً اس لپیٹ ہی میں کھو کر رہ جاتے ہیں خود یہی محفل میلاد کی ایجاد ہمارے اگلوں میں بھی کسی نے غالباً نیک نیتی یا تبلیغی حکمت سے غیروں کی جنم اسٹمی وغیرہ کی نقالی میں کی ہوگی کہ اس بہانے اور حضورؐ کی سیرت کے سہارے کچھ تبلیغ و تذکیر کا موقع ہاتھ آتا رہیگا لیکن کیا یہ اجعل لنا الٰھًا کما لھم اٰلھۃ کے جاہلانہ مطالبہ[1] کی تشفی کا سامان اور دین کے ساتھ نادان کی دوستی نہیں! اس دوستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہوتے ہوتے یہی مجالس میلاد سراپا مفاسد کا مجموعہ بن کر رہ گئیں سچ پوچھئے تو مفاسد و معاصی کے جھمیلوں میں یہ تبلیغی حکمت ایسی ہی ہے جیسے جان بوجھ کر ناپاک جسم و لباس کے ساتھ نماز، سب سے بڑا مفسدہ ان طریقوں کا یہ ہے کہ دین کے نام سے ان دینی بگاڑوں یا بد دینیوں ہی کو آدمی رفتہ رفتہ عین دین بلکہ نماز روزہ سے بڑھ کر دین جاننے لگتا ہے اور ان ہی پر قانع ہو جاتا ہے ابھی اسی ہفتہ ۸ر نومبر ۵۴ء کا لکھا ہوا حیدرآباد کے ایک دین کی اچھی سمجھ رکھنے والے دیندار ڈاکٹر دوست کا محبت نامہ ملا جس میں ایک ایسی ہی پُر مفاسد وہاں کے پرانے رنگ کی محفل میلاد کی

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت نے ان ہی سے یہ فرمائش کی تھی کہ جیسے ان مشرکوں کے بہت سے

(بقیہ بر صفحہ آئندہ)

داستان درج ہے

کل ایک مجلس میں میلاد شریف کے نام سے شرکت کے لئے ایک کرم فرمانے باصرار یاد فرمایا، بار بار آپ کی یاد تازہ ہوتی رہی کہ آپ ہوتے تو اس ہنگامہ دف بازی کو کیا کہتے، جس میں آٹھ دس آدمی چیخ چیخ کر غالباً عربی میں شاید قصیدہ بردہ کا خون کر رہے تھے "

آگے یہ پڑھ کر کہ اس مجلس میں تعلیم یافتہ ولایت زدہ مسلمان اساتذہ دیر (پروفیسروں) کے ساتھ چند ہندو اصحاب بھی اس دف بازی جھانجھ نوازی سلام وقیام کو حیرت سے دیکھ رہے تھے، غریب ڈاکٹر صاحب پر عین اس مجلس مبارک میں تو جو کچھ گذری ہو گی گذری ہوگی، یہ نابکار تو ہزار نو سو میل کے فاصلہ سے سن کر بخدا کٹ کر رہ گیا کہ اپنوں کی اس دینی بربادی سے بڑھ کر غیروں کے سامنے اسلام واسلامیت کی رسوا کن نمائندگی کا آخر اسلام کے نادان دوستوں کے پاس کیا جواب ہوگا۔

ان پرانے رنگ کے میلادوں ہی کی طرح اور اغیار ہی کی ریس میں آج جو ماڈرن رنگ کے میلاد ڈے یا جشن میلاد منائے جا رہے ہیں اس کا اثر بھی ان اغیار ــ ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں وغیرہ پر آخر اس کے سوا کیا پڑتا ہوگا کہ جیسے ہمارے کچھ دینی و دنیوی گاندھی جی وغیرہ کے سے بڑے لوگ ہیں جن کی ہم پیدائش کی خوشی مناتے اور ان کی بڑائیاں بیان کرتے ہیں ویسے ہی مسلمان بھی جس کو اپنا بڑا یا پیمبر مانتے ہیں اس کی پیدائش کا جشن وغیرہ منا لیتے ہیں اس میں آخر انوکھی بات کیا ہے جس کے لئے ہم اسلام کی باتوں کو کان لگا کر سنیں یا اس کو حق وصداقت کی کوئی خاص آواز جانیں۔ نمک کی کان میں نمک کے سوا اور رکھا ہی

بقیہ از صفحہ گذشتہ

معبود دیوتا ہیں ویسا ہی ہمارے لئے بھی (اللہ کے علاوہ کچھ نہیں ایک ہی اور) معبود بنا دیں

کیا ہوگا،

آگے اسی خط میں یہ بھی پڑھ لیں کہ عصر و مغرب کی جو مختصر سی جماعت ہوئی اس میں خود یہ دف باز میلاد خواں تک شریک نہ تھے مختصر سی اس لئے کہ سامعین یا اس دینی تماشہ ہی کو دین جانتے والوں میں بھی ظاہر ہے کہ نماز پڑھنے والے کتنے رہے ہوں گے ایسی مشاہدہ ماڈرن میلاد ڈے میں ہوتا ہے کہ تقریروں اور مشاعروں کے وقت تو پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے لیکن اسی پنڈال کے کسی گوشہ سے جب اذان کی آواز آتی ہے تو ادھر کا رُخ کرنے والے سو میں دس پانچ ہی ہوتے ہیں اغیار دن رات کے اس مشاہدہ سے اس کے سوا کیا اثر لے سکتے ہیں کہ اصل دین مسلمانوں کا بھی روزہ نماز نہیں، جنم اشٹمی کی سی دھوم دھام ہی ہے

یہ تو اس خط کا واقعہ ایک شخصی و انفرادی لیکن دین کے نام سے طرح طرح کی بددینیوں یا بدعات و خرافات میں مبتلا ہونے والے عام مسلمانوں کی ذہنیت ہو بالکل یہی گئی ہے، جب ان چیزوں کو بھی وہ نماز روزہ ہی کی طرح بلکہ عملاً اس سے بڑھ کر دین سمجھتے ہیں تو بے نماز روزہ کے بھی آخر وہ اپنے کو مسلمان بلکہ دیندار کیوں نہ جانیں زیادہ سے زیادہ یہ کہ کوئی دین کا ایک کام کرتا ہے کوئی دوسرا، سب کون کرتا ہے، کون نہیں دیکھتا کہ بہتیرے مسلمان نہ سال بھر نماز پڑھتے ہیں نہ کبھی مسجد کو جھانک کر دیکھتے ہیں نہ دن کو روزہ رکھتے نہ رات کو تراویح پڑھتے ہیں لیکن جس دن مسجد میں ختم ہوتا ہے چراغاں کرنے مٹھائی بانٹنے ان چیزوں کے لئے خوش خوش چندہ اور وقت سب کچھ دینے میں سب سے آگے ہوتے ہیں یہ ذہنیت نتیجہ پرانی رسوم و بدعات ہی کو دین جاننے کا نہیں آج بھی پرانی مولود شریف کے بجائے نیا جشن میلاد منانے والوں کی نفسیات بالکل یہی تو ہوتی ہیں ان جشنوں میں دل کھول کر چندہ دینے، جوش و خروش کے ساتھ ان کا انتظام کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں رات

رات بھر تقریریں سننے والے اور نعتیہ مشاعروں میں ڈٹے رہنے والے کتنے ہوتے ہیں جو سال بھر تک گھروں مسجدوں میں کیا سال کے اس ایک دن یوم میلاد میں اور جشن میلاد کے عین پنڈال کے اندر جس کی پیدائش کے نام سے یہ دھوم دھامی ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اسی کی یاد و اتباع میں خدا کے حضور اپنی پیشانی اس ایک ہی موقع پر ٹیک دیتے ہوں،

بات میں بات نکل پڑی دل کی ٹیس زبان پر آ گئی اصل میں عرض یہ ہو رہا تھا کہ اسلامی زندگی کھلی ہوئی عیاشیوں، آوارگیوں، بدمعاشیوں، نفس پرستیوں اور لایعنی کھیل تماشوں ہی میں مال و دولت، وقت و قوت کو اڑانے کی روادار نہیں، میلوں ٹھیلوں، نہانوں، اشنانوں، ہولی، دیوالی، جنم اسٹمی وغیرہ مشرکانہ تہواروں کی دیکھا دیکھی [1] جن کا سلسلہ کم و بیش سال بھر چلتا رہتا ہے نام کے مسلمانوں نے بھی محرم و شب براءت، رجبی و میلاد وغیرہ کے علاوہ دین و مذہب کا نام لے کر سیکڑوں ہزاروں عرس، عرسی میلے، ٹھیلے اور آئے دن کی نذریں اور نیازیں جو ایجاد کر رکھی ہیں دین کو کھیل تماشہ بنانے والے ان تماشوں سے بھی اس اسلام کو کیا سروکار

---

[1] یہ کوئی نری خالص قیاس آرائی نہیں حال ہی میں اعظم گڑھ کی ایک خبر پڑھی کہ وہاں پولیس لائن کے مسلمان سپاہیوں کی طرف سے ۹ سال سے برابر درخواست دی جا رہی تھی کہ جس طرح جنم اسٹمی کا تہوار منایا جاتا ہے عید میلاد النبی کی بھی اجازت دی جائے لیکن نہیں ملتی تھی اس سال ۱۹۶۸ء میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے بخوشی اجازت دی اور خود شریک میلاد و قوالی ہوئے، اور کیوں نہ ہوتے کہ اب تو لامذہبی حکومت کے نام سے ان چیزوں کا شمار بدنام مذہب کے بجائے نیک نام کلچر میں کیا جانے لگا ہے اور خود مسلمان جنم اسٹمی و رام لیلا وغیرہ میں کلچری اتحاد کو پیدا کرنے اور بڑھانے کے لئے شریک ہوتے اور کئے جاتے ہیں! اب ہا جس امت کے سپرد شرک و باطل کے مٹانے کی خدمت تھی وہی اپنی قسمت ان پر بنا رہی ہے اور حضرات علماء ہیں

ہوسکتا ہے جس کی لے دے کر سال بھر میں کل دو عیدیں بھی ہر طرح کی رسمیات ولغویات سے پاک بس بارگاہ پروردگار میں نیازمندی و بندگی کی دو رکعت نمازِ دوگانہ کے ایک سادہ وسنجیدہ اجتماعی عبادت کے مظاہرہ سے زیادہ نہیں

غرض اس طرح دین ومذہب کو بگاڑ کر اسراف وتبذیر کی بے حساب راہوں سے جو معاشی بگاڑ پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کا ذمہ دار خود دین ومذہب کسی درجہ میں بھی نہیں تمام تر عین بددینی وبدمذہبی کا وبال ہے ۔

لادینی اسراف وتبذیر بخلاف اس کے بے خدا کی لادینی ولامذہبی جدید زندگی اپنی دعوت و دعایت سے جس تمدن وتہذیب، معیشت ومعاشرت، آرٹ اور ثقافت (کلچر) اور سب سے بڑھ کر جس سیاست کو عین ترقی پکار پکار کر دن رات ڈھنڈورا پیٹتی ہے اس نے زندگی کی ضروریات سے بھی زیادہ فضولیات کو ضروریات بنا بنا کر اور انفرادی واجتماعی اسراف وتبذیر کے بے شمار دروازے کھول کر جس طرح شخصی وقومی معاشیات کو روز بروز بگاڑتی اور اس کا دیوالیہ نکالتی رہتی ہے ان کا شمار بھی کون لگا سکتا ہے اور سینما وغیرہ نام نہاد خالص تفریحات کی ایک ہی مد میں ہندوستان جیسے پس ماندہ وفاقہ زدہ ملک کے صرف ایک ہی صوبہ کے کروڑوں تک اعداد کا ذکر آچکا، اسی طرح صرف عورتوں کے ماڈرن بناؤ سنگار کے سامانوں لپ اسٹک کریم پوڈر وغیرہ پر بھی غالباً کروڑوں کے اعداد کہیں اس مفلس ہندوستان وپاکستان کے بڑھے ہوئے، جن کے کروڑوں باشندوں کو موسمی سختیوں سے بچنے اور تن ڈھکنے بھر کا لباس تک میسر نہیں اور ابھی تو یہ

(بقیہ از صفحہ گذشتہ)
کہ خاموشی بلکہ لیڈر علماء تو کھلے چھپے کلچری اتحاد کی تائید میں بھی تامل نہیں فرماتے مرعوبیت ومداہنت کی بھی کوئی حد

ترقی یافتہ نسوانی بناؤ سنگار یا میک اپ شاید ایک دو فیصد عورتوں سے آگے نہ بڑھا ہو لیکن نسوانی ترقی کی ترغیب و تشویق جس زور شور سے دونوں جگہ چل رہی ہے اس کے دیکھتے جب عورتوں کی اکثریت کا یہ ترقی یافتہ ذوقِ خود آرائی لازمۂ ترقی بن جائے گا تو ترقی نسواں کی صرف ایک مد ہی کے اعداد و ترقی کہاں تک خبر لیں گے۔

یہ تو کروڑوں اربوں تک کا ایک اچٹتا ہوا اندازہ ان نام نہاد تفریحات و فضولیات کا تھا جن کو عہد حاضر کی نام نہاد متمدن و مہذب ترقی یافتہ حکومتیں روکنے مٹانے کی زندگی کو کافور۔ آرٹ اور کلچر وغیرہ کے خوشنما نام دے دے کر لٹے سرپرستی و ہمت افزائی پر فخر کرتی رہتی ہیں زبان پر تو دین و دیانت، اخلاق و شرافت سب کے بجائے ان سب کا رونا گانا دن رات کا یہی رہ گیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح عوام کے پیٹ، تن، تندرستی و تعلیم کی سی بنیادی ضروریات زندگی ہر ہر فرد اور ہر شہری کی پورا ہونا لازم و مقدم ہیں جو بجائے خود بہت کچھ بجا بھی ہے لیکن عمل یہ ہے کہ ان بنیادی ضروریات کے پورا ہونے سے پہلے ہی راہیں روز بروز فضولیات کو بڑھانے کی اختیار کی جاتی رہتی ہیں۔

لہویات و لغویات ایک طرف زندگی کی مقدم ضروریات و لوازم کی تکمیل و تشفی سے پہلے لہویات و لغویات اور ان کا شوق و حرص پیدا کرنے والے سامانوں کی ہر طرف یہ ریل پیل اور ترغیب و تحریص کہ ننگے بھوکے عوام تک نے ان کو اپنی بنیادی ضروریات سے بڑھ کر ضروری بنا رکھا ہے ایک مزدور طبقہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ ان کے کم سن کچی عمر کے لڑکوں تک کا یہ حال کہ جسم پر گرمی سردی، برسات کی موسمی سختیوں سے بچانے کا کپڑا ندارد، لیکن بیڑی منہ میں دبی ہوتی ہے جو کچھ نہیں

دو چار روپیہ مہینہ کی اوسطاً ہر چھوٹا بڑا مزدور پڑا رہتا ہوگا۔ یعنی سال میں چالیس پچاس روپیہ۔ جس میں ہر موسم کے مناسب تن پوشی کا کچھ نہ کچھ سامان ہو سکتا تھا پھر شہر میں ان ہی مزدوروں میں کتنے ہوں گے جنہوں نے سینما سرکس وغیرہ کی شہری تفریحات کو کھانے پینے کی بنیادی ضروریات پر مقدم نہ بنا رکھا ہو، پھر اس سینما بازی سے جو سبق ملتا ہے اس پر عمل کے لئے گھر باہر پاس پڑوس "عشق بازی" پرتن من دھن سب ہی کی بازی لگانے سے رکا اور کس کس کو روکا جا سکتا ہے اس عشق بازی میں کچھ روک روکاوٹ ہو تو زنان بازاری کی دکانیں ہر چھوٹے بڑے شہر میں خود حکومت نے کھلوا رکھی ہیں جاتے اور نقد کا نقد اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا سودا کیجئے،

مزدوروں کا نام تو مزدوروں کی کلمہ خواں حکومتوں کی رعائیت سے خصوصاً زبان پر آگیا ورنہ عوام و خواص کا کونسا طبقہ ہے جو اپنے اپنے محل و مقام کے لحاظ سے طرح طرح کی لغویات و فضولیات پر ضروریات سے زیادہ نہیں اڑاتا رہتا۔ سب سے بڑھ کر ننگے بھوکے عوام کا سب سے زیادہ غم کھانے والے چھوٹے بڑے لیڈروں اور حکمرانوں ہی کے بلند طبقہ کو دیکھئے کہ اپنے رہنے سہنے اور نمود و نمائش کے ٹھاٹھ باٹھ میں کون مقدور بھر کسر اٹھا رکھتا ہے اور ہر حکومت کے ننگے بھوکے عوام کے گاڑھے پسینہ کا کروڑوں روپیہ خود ان کے یہ غمخوار ہی اپنی نمائشی فضولیات میں اڑا ڈالتے ہیں، حد یہ کہ مرنے کے بعد بھی بھوتوں کی طرح لپٹے رہتے ہیں اور کروڑوں ہی روپیہ آئے دن کی اپنی موت و پیدائش کے سالانہ جلسوں جلوسوں تقریبوں یادگاروں اور یادگاری مجسموں وغیرہ کی راہوں سے برباد کراتے رہتے ہیں۔

یادگاریں بڑوں کی بڑی یادگاری کا پوچھنا ہی کیا چھٹ بھیوں تک

کی ایک تازہ مثال لیں کہ ابھی کچھ ہی دن پہلے اپنی ہی حکومت کے متعلق کہیں پڑھا تھا کہ دو وزیروں کے پندرہ پندرہ ہزار کی لاگت کے یادگاری دو مجسمے یا بت بنوائے جا رہے ہیں اس حکومت کے پورے محروسہ میں کیا عین اس کی راجدھانی میں کتنے ایسے بے روزی روزگار عوام ہوں گے جن کو اگر سو دو سو روپیہ بھی مل جاتے تو کوئی چھوٹا موٹا دھندا کر کے اپنا ہی نہیں اپنے بال بچوں کا تن پیٹ پال سکتے ہیں یعنی تیس ہزار میں دو تین سو بے روزگار روزگار میں لگائے جا سکتے ہیں جن کے اہل و عیال کو ملا کر کم و بیش ایک ہزار افراد کا معاشی مسئلہ حل ہو سکتا ہے یہ تو مشتے نمونہ از خروارے بالکل معمولی درجہ کا یادگاری نمونہ تھا، ورنہ بڑوں بڑوں کی بڑی بڑی تاج محلی یادگاروں کا معاملہ تو لاکھوں کروڑوں ہی تک جا تا رہتا ہے یاد ش بخیر، ثناً پاکستان میں قائد اعظم کے یادگاری مقبرہ کا تخمینہ اسّی لاکھ ہے[1] یہ ایک نو تعمیر تازہ ترین اسلامستان میں اس اسلام کی یادگار ہوگی جس کی شریعت میں پختہ قبر کی بھی اجازت بحث طلب ہے، اور ہندوستان میں غریب ان گاندھی جی کے سمادھی کا تخمینہ تو غالباً کروڑوں ہی کا پڑھا تھا جو مرتے دم تک قوم و ملک کو سادگی اور سادہ زندگی کا سبق ایک لنگوٹی کے لباس، جھونپڑہ کے مکان اور تھرڈ کلاس کے سفر سے دیتے رہے اور حکومت کے وزراء و اعیان کو خود اسلام کے فاروق اعظم رضؓ کی زندگی سے سادگی و حکمرانی کا سبق لینے کا سبق دے گئے۔

---

[1] صدق کے ایک مراسلہ میں پڑھا کہ نہیں آخری تخمینہ تو ایک کروڑ سے بھی اوپر ہوگا لیکن اس میں مقبرہ کے علاوہ جامع مسجد بھی شامل ہے پھر بھی مقبرہ کا حصہ کم و بیش نصف تو اس میں ہو ہی گا۔ یعنی ۸۰ لاکھ نہ سہی ۴۰، ۵۰ لاکھ۔ سوال یہ ہے کہ لاکھ دو لاکھ کا جواز بھی اسلام کا نام لے کر کہاں تک نکالا جا سکتا ہے؟

اور تو اور اسٹالن کی قبری یادگار کا تخمینہ یا لاگت بھی غالباً کہیں کروڑوں ہی کی پہنچی تھی، یہ شاہانہ و سرمایہ دارانہ حوصلہ مندیاں کس کے خون پسینہ کے سرمایہ سے؟ ان ہی مزدوروں اور کاشتکاروں کے، جن کے نام پر وہشت انگیزی وخون ریزی کا ایک مستقل مذہب ایجاد کر دیا گیا اور جس پر لرزہ انگیز شقاوت وقساوت کے ساتھ ہزاروں لاکھوں بدنام سرمایہ داروں جاگیرداروں کو بھینٹ چڑھا دیا گیا اور تازہ بہ تازہ یہ لیجیے کہ اسٹالن تو خیر اس مذہب خونریزی و فساد انگیزی کا ابھی چند ہی دن پہلے کا بہت بڑا زندہ دیوتا تھا۔ اس کی قبر اگر آہنی قید خانہ کے قیدی مزدوروں کاشتکاروں کے پیٹ سے پاٹنے پر اس کے جاں نثار پجاریوں نے دو چار کروڑ بھی لگا دیا تو کچھ تعجب نہیں، کمال تو اس مذہب ستم کے نئے پرجوش پجاری کی اپج نے کر دیا کہ سفاکی و خونریزی کی شہرہ آفاق ضرب المثل والے چنگیز خاں کو سیکڑوں سال پرانی قبر سے کھود نکالا۔ اور کیسی سرمایہ دارانہ اولوالعزمیوں کے ساتھ نئے یادگاری مقبرہ کی تیاریاں ہیں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۵۵ء کی برلن کی اطلاع ہے کہ چین کی مزدور کاشتکار حکومت کے صدر نشین ماوزے تنگ

چنگیز خاں کی یادگار کے طور پر اس کے مقبرہ کو نئے سرے سے بڑے پیمانہ پر بنوانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مشرقی جرمنی کے ۱۲ معماروں اور متعدد انجینیروں اور آرٹسٹوں کو چین مدعو کیا ہے کمیونسٹ حلقوں کے بیان کے مطابق یہ مجوزہ یادگار روس اور بیرونی منگولیا اور سمرقند سے درآمد کیے جانے والے پتھروں سے بنوائی جائے گی!

ابھی ذرا آگے سنئے۔
اس مقبرہ کی دیواروں پر سنہرے حرفوں سے چنگیز خان کے کارنامے
لکھوائے جائیں گے اور اس کی چھت پر ماوزے تنگ کی قیادت
میں چین کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کا نقشہ پیش کیا جائیگا۔
حکومت چین نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ چنگیز خان کے یوم
پیدائش اور یوم وفات کے موقع پر پورے چین میں تعطیل دی
جایا کرے گی۔
آگے اور لیجئے کہ اس تاریخی سفاک اور خونریز کے ساتھ جوشِ عقیدت میں صرف
نئے سرے سے نیا یادگاری مقبرہ ہی تعمیر نہ ہوگا بلکہ
اس عظیم فاتح کی سوانح عمری نئے سرے سے لکھوانے کے لئے حکومت
نے براہ راست اپنی نگرانی میں ممتاز چینی و روسی مصنفین کی ایک
اعلیٰ کمیٹی مقرر کر دی ہے۔
یہاں تک غنیمت تھا لیکن وہ کمیونسٹ حکومت ہی کیا ہوئی جو تعمیر سے بڑھ کر
تخریب کے کارنامے انجام نہ دے، اگر دن زدتی سرمایہ پرست حکومتیں اور
ان کے پرستاران علم و تاریخ جو ایک ایک تاریخی مخطوطہ و دستاویز پر ہزاروں
لاکھوں کا سرمایہ لگا دینا بھی عین علم و دوستی جانتے ہیں وہ خوب جی کڑا کے
سرمایہ دشمن حکمرانوں کی اس تاریخی علمی خونریزی و سفاکی کا نظارہ بھی فرمالیں کہ
اس فاتح پر ملکی (چینی) وغیر ملکی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں جو اب
تک مستند سمجھی جاتی تھیں حکومت کی ہدایت پر چین کے مختلف شہروں
میں ضائع کی جارہی ہیں۔
اور یہ جان بوجھ کر کہ ایک طرف اس علم کشی اور دوسری طرف دروغ بافی کا بظاہر

مقصد چنگیز خاں کی زندگی کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ (امن نہیں[1]) موجودہ امن کے (صرف) پروپیگنڈہ کے درمیان موذوں ہستی معلوم ہو[2]

ضروریات سے بڑھ کر ان لادینی ولااسلامی فضولیات کی کن کن مدوں کو کہاں کہاں تک گنایا جاتے، سچ پوچھیے تو نام نہاد تمدن اور تمدن کی ترقی نام ہی ہو گیا ہے ضروریات سے زیادہ ہی نہیں حقیقی ضروریات کو پس پشت تک ڈال کر نمائشی فضولیات بلکہ لہویات و لغویات تک کی مسرفانہ ترقیوں اور ان پر زر پاشیوں کا

جمہوریت وغیرہ کی معاشی برکات

قارئین خصوصًا ہمارے متمدن و مہذب قارئین نے جہاں اتنا صبر فرمایا، وہاں تھوڑا اور فرماکر داستان ختم ہوتے ہوتے عہد جدید کی متمدن ترین اور مہذب ترین بڑے ناموں والی حکومتوں، جمہوریت وعوامیت وغیرہ کی بھی معاشی برکات کا کچھ بہت ہی سرسری خاکہ پیش نظر فرمالیں سب سے نمایاں و مشترک خصوصیت ان حکومتوں کی حکومتی مشین کی پیچیدگی اور طوالت پسندی ہے جو لازمًا آپ سے آپ ان کو حد سے زیادہ خرچیلا اور مسرفانہ بنا دیتی ہے

ایک انتخابات یا الیکشنوں ہی کے قصوں کو لے لیجیے جن کے بغیر کوئی نئے جمہوری، عوامی، یا اشتراکی واشتمالی حکومت جنم ہی نہیں پا سکتی اور جن کے ہنگامے ملک بھر میں اوپر سے نیچے تک ہر تین چار پانچ سال پر مستقلًا اور کم و بیش سال بھر ہنگامی وضمنی برپا رہتے ہیں۔ اور جن پر چھوٹے بڑے ملکوں کا لاکھوں کروڑوں کا جتنا دیوالیہ نکلتا رہتا ہو گا اس کا اندازہ اپنے ہی ملک (ہندوستان) کے ایک نومولود صوبہ آندھرا کے اور وہ بھی صرف مقامی و ہنگامی انتخابات سے کریں، ۱۶ر دسمبر ۵۴ء کو لوک سبھا میں مرکزی حکومت کے وزیر مالیات نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے

---

[1] قوسین کی جرأت راقم نہ لانے کی ہے [2] قومی آواز ۲۲ر مارچ ۵۵ء

بتلایا کہ آندھرا اسمبلی کے آنے والے انتخابات پر یقین ہے کہ تینتیس لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ یاد رہے کہ ہندوستان کے غالباً ۲۶، ۲۷ صوبوں میں یہ صرف ایک اور شاید سب سے چھوٹا یا بہت ہی چھوٹا صوبہ ہے۔

دوسری خبر اسی فروری ۵۵ء کی خود ہمارے یوپی کے صوبہ یا ریاست کی سن لیں، وہی کچھ وقتی خالی نشستوں کے انتخابات درپیش ہیں ان کے لئے نیچے کے لیڈروں کارکنوں وغیرہ میں تو جیسی دوڑ دھوپ ہے ہی، تازہ اطلاع یہ ہے کہ اسی سلسلہ میں خود آل انڈیا کانگرس کے صدر ۱۱ر ۱۲ر اور ۱۳ر فروری کو سہ روزہ دورہ پر تشریف لا رہے ہیں ان کے علاوہ مرکزی وزیر داخلہ، بمبئی کے وزیر اعلیٰ اور مرکزی وزیر خارجہ حتیٰ کہ مولانا فلاں، نیز دوسرے کانگریسی لیڈروں، منسٹروں مولاناؤں، اور منسٹروں کی دوڑوں اور دوروں میں کیا یوپی کا سب سے بڑا صوبہ آندھرا سے بھی گیا گذرا ہوگا کہ لاکھوں لاکھ کا شاید ایک آدھ کروڑ کا وارا نیارا ہو کر نہ رہے، پھر ان کے علاوہ ملک بھر کے میونسپلٹیوں کارپوریشنوں اور ان سے نیچے ڈسٹرکٹ بورڈوں ٹاؤن ایریا کمیٹیوں وغیرہ کے انتخابات کا اضافہ کر لیں اس اضافہ پر اضافہ ان حکومتی کمیٹیوں کمیشنوں اور کانفرنسوں کا رہا ہی جاتا تھا جو بات بات پر ہر دن ہی بنتی رہتی ہے اور جن کی ملک بھر کی تعداد کا شمار بھی کون لگا سکتا ہے، خدا کی پناہ! آدمی کا عقلی توازن ذرا بھی سلامت ہو تو چیخ اٹھے۔

حکومتیں اور کانفرنسیں وغیرہ ابھی اسی ہفتہ (۶ر دسمبر ۵۴ء) کسی قبائلی معاملات کی کانفرنس کا افتتاح فرماتے ہوئے جمہوریت و اشتمالیت دونوں کے علمبردار ہمارے وزیر اعظم کی زبان سے خدا جانے اس طرح کی کچھ دھیمی سی چیخ کیسے نکل گئی کہ وہ میں ذاتی طور پر ریاستی وزراء کو دہلی کانفرنسوں میں بلانے اور ان کو

باقاعدہ ان کے صدر مقامات اور دہلی کے درمیان دوڑانے کا قائل نہیں ہوں،" اور سوچتا ہوں کہ کانفرنسوں پر کچھ پابندیاں لگا دینی چاہئیں"، جی ہاں گڑ کھاتے جائیے اور گلگلوں سے پرہیز کی سوچتے جائیے پھر یہ کمیٹیاں، کمیشن اور کانفرنسیں جن مقاصد کے لئے بنتی اور منعقد ہوتی ہیں وہ ایسے کھٹائی میں پڑتے ہیں کہ دنوں کا کام ہفتوں میں اور ہفتوں کا مہینوں میں، مہینوں کا برسوں میں پورا ہونا مشکل ہو جاتا ہے باقی ان کے مستقل و عارضی دفتری مصارف اور ان میں شریک ہونے والوں کے سفر خرچ بھتوں وغیرہ وغیرہ کا کچھ نہیں تو کروڑوں ہی تک معاملہ جاتا ہوگا۔ اوپر سے نیچے تک ہونے والے الیکشنوں اور ان سے بننے والی کونسلوں، اسمبلیوں، بلدیات وغیرہ کے جاری وغیر جاری مصارف کی میزان تو اربوں ہی تک جاتی ہوگی، انشاءاللہ تجدید سیاسیات میں معلوم ہوگا کہ شیطان کی آنت اس لادینی جمہوریت میں مال و دولت ہی نہیں وقت و قوت کی جس بیدردی سے اضاعت و بربادی ہوتی ہے اسلام کی دینی جمہوریت یا صحیح خلافتی حکومت کا دامن اس کے ہلکے سے ہلکے داغ دھبوں سے کس طرح پاک وصاف ہے۔

عدلیہ یا عدل وانصاف کا نظام، جو سچ پوچھئے حکومتوں کا سب سے اہم و اقدم فریضہ ہے اس کا حال سب سے ابتر نہ عدالتوں پر عدالتوں اور ان کی طوالت پسندیوں پر طوالت پسندیوں کے حکومتی مصارف کی کوئی تھاہ اور نہ ان عدالتوں کی راہ سے حق وانصاف چاہنے والوں کی جان و مال، وقت و قوت کی ہلاکت کا کوئی ٹھکانا۔ مشہور ہی ہے کہ ہارنے والا تو ہارتا ہی ہے جیتنے والے کا بھی اس عدالتی جال جنجال سے نکلتے نکلتے جان و مال سب کا بھرکس نکل جاتا ہے دس پانچ سال تک ایک مقدمہ کی اپیل در اپیل تک پیروی اور فیصلہ میں لگ جانا تو کوئی بات ہی

نہیں، بارہا باپ کے مقدمات ترکہ میں اولاد تک پہنچ جاتے ہیں اور کیوں نہ پہنچیں
جب ایک ایک عدالت میں خالی تاریخیں بڑھنے بڑھانے میں مہینوں سالوں تک
لگ جاتے ہیں تو پھر اپیل در اپیل کی شیطانی آنت کا پوچھنا ہی کیا۔ اس
کو دیکھ کر اسلامی شریعت کی قدر ہوتی ہے کہ اس نے اپیل بازیوں کی جڑ کاٹ
کر راعی و رعایا دونوں کے مال و دولت وقت و قوت سب پر کتنا احسان کیا
رہا حق و انصاف تو اس کا ان بے خدا و آخرت کی عدالتوں، پیشہ ور وکیلوں کی
قانونی موشگافیوں اور نکتہ نوازیوں، سکھائے پڑھائے مشاق و مزدور گواہوں
کی چرب زبانیوں، اہلکاروں کی رشوت ستانیوں، کاغذات میں جعل سازیوں
تک ہفت خواں کو پار کرتے کرتے ملنا جتنا دشوار ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں
خدا و آخرت سے تھوڑا بہت بھی ڈرنے والے فریقوں، ان کے گواہوں، پیروکاروں
اور عدالتی اہلکاروں اور حاکموں کی ابتدائی عدالت اور اکثر اس کی پہلی ہی بیٹھی
میں مل جانا آسان ہوتا ہے، اور اگر بالفرض عدالت در عدالت اپیل در اپیل کے
جھمیلوں میں سالہا سال تک جان و مال وقت و قوت سب کی بے حساب تباہی
و بربادی کے بعد حق و انصاف ملا بھی تو اس کی قیمت ہی کتنی رہ جاتی ہے، بس چھوٹے
پیمانہ پر وہی قیاس فرمالیں جو اقوام متحدہ کی عدالت میں ۷، ۸ سال سے کشمیر کے
تنازعہ کا حشر ہو رہا ہے کہ فریقین کے کروڑوں اربوں کے ماتھے جا چکنے پر بھی ہنوز
روز اول ہے بلکہ بدتر از روز اول، کشمیر ہی کی ہم عمر ایک چھوٹی سی آپ بیتی سن لیں
جس سال کشمیر کا مقدمہ اقوام متحدہ میں دائر ہوا غالباً اسی سال ایک عنایت فرما
نے بلا کسی اپنے ادنیٰ سے حق و بنیاد کے محض ازراہ عنایت کسٹوڈین کی عدالت
کو ہشکا دیا پھر کیا تھا ضلع کی عدالت سے صوبہ کی عدالت اور وہاں سے مرکز
کی عدالت (دہلی) تک مقدمہ جا کر پھر صوبہ ہی میں واپس آگیا ہے اور قریباً سات

پھر سے یہاں بھی اس طرح پڑا ہے کہ ایک بالکل ابتدائی پیشی کے بعد پھر مہینوں قطعاً عدالت نے سانس ڈکار نہ لی، اب خدا خدا کر کے یکم جولائی (۵۵ء) کو تاریخ مقرر ہوئی وکیل و مختار ۱۰ بجے ہی سے حاضر تھے مگر جج صاحب عدالت کے بالکل آخر وقت ساڑھے تین بجے تشریف لاتے اور پھر تاریخ بڑھ کر ۲۰ اگست مقرر ہوئی اور پھر اب ۲۸ ستمبر ہے۔

اپنا تو آپ بیتی کے صرف دو ایک ہی تجربوں کے بعد یہ حال ہو گیا ہے کہ راستے چلتے بھی کسی عدالت کا میدان حشر سامنے آ جاتا ہے تو بخدا روح لرز جاتی ہے کچھ بھی کسی انسان کی انسانیت زندہ ہو تو اس کے لئے دنیا ہی میں عذاب الیم و مہین (دردناک ذلت انگیز) دونوں ہی کا نمونہ ہے۔

انصاف کا ظلم ۔ انصاف کے نام سے ان عدالتوں میں ایک تاخیر انصاف ہی کا یہ ظلم مسلسل کس سے ڈھکا چھپا ہے خود حکومتیں جانتی اور اقرار کرتی رہتی ہیں ۱۶ ستمبر ۵۵ء کو ہماری یو، پی کونسل کے سامنے خود وزیر انصاف نے اقرار فرمایا تھا کہ :۔

اس وقت ہائی کورٹ الہ آباد کی صرف لکھنؤ بنچ میں ۱۲۷۸ فوجداری اور ۳۶۱۴ دیوانی کے مقدمات کا فیصلہ ہونا باقی ہے ۔۔۔ اور ایک سوال کے جواب میں ارشاد ہوا کہ پہلی دیوانی اپیلیں اور دوسری دیوانی اپیلیں جو تین سال سے زیادہ مدت کی ہیں ان کی تعداد ۱۹۴۷، اور ۲۷۸۵ ہے ،، جل جلالہٗ۔

اس پر کسی نے پوچھا کہ حکومت ان اپیلوں کی جلد سماعت کے لئے کیا انتظام کر رہی ہے ؟ تو وزیر انصاف کی طرف سے جواب باصواب یہ عطا ہوا کہ یہ معاملہ ہائی

کورٹ سے تعلق رکھتا ہے اور حکومت انصاف کے معاملہ میں کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتی "، سبحان اللہ کیا جواب لاجواب ہے! یہ مداخلت انصاف میں ہے یا تاخیر انصاف کے سراسر ظلم مسلسل میں

معاشی مسائل و مشکلات کے سلسلہ میں اس قدر دراز نفسی کا مدعا ایک طرف یہ ہے کہ عدل و انصاف کے اس پیچیدہ و دراز نظام کی بدولت بھی خود حکومتوں اور محکوموں دونوں کی صرف مال ہی کی کروڑوں اربوں نہیں وقت و قوت کی بھی کتنی بے اندازہ دولت رائیگاں چلی جاتی ہوگی جو معاشی مسائل و مشکلات کے حل میں انفرادی و اجتماعی طور پر لگ لگائی جا سکتی تھی اور دوسری طرف جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں دادرسی و دادرسانی کا اسلامی و شرعی راستہ کتنا مختصر و کم خرچ اور صاف و سادہ ہے۔

سو سنار کی ایک لوہار کی

سب سے بڑا پیٹ ماڈرن متمدن حکومتوں کی عسکریت یا نام نہاد محکمہ دفاع کا ہے جو کچھ نہیں کم و بیش آدھی آمدنی ہر ملک و حکومت کی سیدھے ڈکار ہضم کر جاتا ہوگا۔ ۱۹۵۲ء کے ۲۶ ر اپریل ایک دو کالمی جلی اخباری سرخی ہے کہ مغربی یورپ کے دفاع کے لئے دنیا کا سب سے بڑا فوجی بجٹ "، نیچے اس کی تعداد صرف ستر ارب ڈالر دی گئی ہے یعنی پونے دو کھرب روپیہ! اور دنیا کا سب سے بڑا بجٹ سہی پھر بھی دنیا بھر کا بہر حال نہیں ہے صرف مغربی یورپ کا ہے جس پر باقی یورپ اور پرانی دنیا کے باقی پورے تینوں براعظموں ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا کے سیکڑوں ملکوں اور پوری نئی دنیا و امریکہ کے بجٹوں کو اور بڑھا لیں تو نوبت شاید سنکھوں تک ہی جا پہنچتی ہو، کیونکہ انہی میں ابھی پوری دنیا کی سب سے بڑی دولت مند مہاجن حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ داخل ہے جو اربوں کی فوجی مدد پاکستان جیسے

محتاجوں ہی کو دے ڈالتی ہے اور ان ہی میں ہندوستان جیسے مفلسوں کی حکومت کا اربوں کا بجٹ بھی شریک ہے "

ہڑتالیں وغیرہ لیجئے ماڈرن ترقی یافتہ جمہوری و عوامی حکومتوں کے جمہوری حقوق کی پُر فخر برکات آئے دن کی ہڑتالوں مورچوں، دھرنوں وغیرہ کے نامتناہی احتجاجی سلسلوں کی مدتو چھوٹی ہی جاتی ہے ابھی چار ہی دن پہلے مسودہ پر نظر ثانی بلکہ ثالث کے دوران میں ۱۵ جولائی (۵۵ء) کے اخبار میں پڑھا کہ امرتسر میں اکالی سکھ جو مورچہ لگائے ہوئے تھے، اس پر خود مورچہ لگانے والوں ان کے مددگاروں ہمدردوں وغیرہ کے مصارف سے مطلب نہیں، صرف حکومت پنجاب کا دس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ دس ہزار روزانہ تو مورچہ کے قیدیوں ہی پر اور دو لاکھ روزانہ پولیس کے انتظامات پر، غالباً یہ طباعت کی غلطی ہے دو ہزار روزانہ ہوگا، جمہور کے ماڈرن احتجاجی حقوق کا یہ سلسلہ فقط جمہوری حکومت ہی کے مقابل میں نہیں خود آپس میں کارخانوں، مزدوروں، حتی کہ ماڈرن تعلیم گاہوں یونیورسٹیوں وغیرہ تک میں کہیں نہ کہیں مہینہ کے تیس دن چلتا ہی رہتا ہے اور ساتھ ہی عوام اور عوامی حکومتوں کے احتجاجی و انتظامی اخراجات کا بھی، آج کل ہمارے پڑوس کانپور میں چالیس پچاس ہزار مزدوروں کی ہڑتال ملوں کے خلاف اسّی دن پر آج ۲۰ جولائی ۵۵ء کو خدا خدا کر کے ختم ہوئی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس نے تمام پچھلی ہڑتالوں کا ریکارڈ توڑ دیا ہے اور فریقین کے نقصانات کروڑوں تک جا پہنچے ہوں گے ایک کروڑ بتیس لاکھ پونڈ کے قریب سوت اور ساڑھے چار کروڑ گز سے زائد صرف کپڑے کا نقصان ۲۰ جولائی کے اخبار میں چھپا ہے "

کتاب کے ان آخری صفحات میں جدید ترقی یافتہ لادینی و لامعادی زندگی

والے عوام وخواص، حکومتوں اور شہریوں سب کی انفرادی و اجتماعی، سیاسی وسماجی بے شمار قسم کی ضروریات سے فضولیات یا ضروریات میں اعتدال سے زیادہ اسراف کی مدات کے جو چند بہت ہی ناقص ونا تمام بالکل سرسری اعداد اور انداز سے پیش کئے جا سکے اور اس پر بھی جن کا شمار اربوں کھربوں تک جاتا ہے جب اسلام کے دینی و معادی نظام معیشت و معاشرت، حکومت وسیاست میں ان کی کوئی جگہ نہیں تو اسلام کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو قبول و اختیار کر لینے کی صورت میں خود ہی سوچیے کہ معاشی منصوبہ بازیوں پر کروڑوں اربوں خرچ کئے بغیر فضولیات اور فضول خرچیوں کی بچت ہی سے معاشی مسائل و مشکلات کہاں تک از خود حل ہو جاتے ہیں ۔

بالکل آخر میں ایک ہی بات لیکن بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی بات یہ کہ خالص معادی یا مارکسی واشتراکی معاشیات کے تصور کی طرح انسان اگر خالص معاشی حیوان یا نرا تر پیٹ ہی پیٹ نہیں ہے اور خالص اسلام کی دینی وروحانی تعلیمات سے کیا معنی کسی معنی میں بھی کوئی انسان اگر انسانیت یا انسانی شرافت اور روح وروحانیت سے متعلق اس کی ظاہری حیوانیت و بطنیت سے ماورار کوئی تصور اس کی باطنی فطرت کا رکھتا ہے تو وہ بھی اس کی خالص معاشی یا جسمانی ضروریات کو صرف ضروریات محدود رکھنے ہی میں اس کی اصلی و باطنی تشفی و تسلی کا راز جانیگا

گاندھی جی غریب جن کا نام لے کر آزاد ہندوستان اور اس کی ریاستوں یا صوبوں کی حکومتیں اور حکمران سب ہی زیادہ تر کام ان کو بدنام کرنے ہی کے انجام دیتے رہتے ہیں، خود ان کے معاشی فلسفہ ہی کے عنوان سے کیلاش نام کسی صاحب کا ایک مضمون نظر سے گذرا، شروع میں تقابل عہد جدید کی حیوانی

ؔ قومی آواز ۸ر نومبر ۱۹۵۴ء

معاشیات والوں کے بعض اکابر سے ہے کہ انگلستان کے مشہور فلسفی و مفکر معاشیات آدم اسمتھ کے نزدیک کسی ملک کی اقتصادی دولت، اس ملک کی زمین، مکانات اور روزانہ ضروریات کی اشیاء نہیں بلکہ قومی دولت کا انحصار محنت کشوں اور زمین کی پیداوار پر ہے یعنی حیوانی متکلم کی پرواز فکر بس اتنی ہی ہے کہ زمین سے اڑ کر بھی زمین ہی پر گرتا ہے۔

مگر گاندھی جی کا اقتصادی آدرش اس سے بلند تھا کہ معاشیات کا مقصد زندگی کی ضروریات اکٹھا کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ علم وہ ہے جس کے ذریعہ جرام کو اقتصادی سکون و اطمینان حاصل ہو سکے۔

آج کل کانگریس اور کانگریسی نیتا اور وزراء سب میں بھارت کی معاشیات کو سوشلسٹک ڈھنگ یعنی وہی کم و بیش روسی و چینی یا لطنی و حیوانی ڈھنگ کے قالب میں ڈھالنے کا بڑا دعویٰ اور چرچا چل رہا ہے وزیر اعظم خصوصًا اس میدان میں سب سے پیش پیش ہیں، ذرہ اپنے اور بھارت کے باپو کی بے چین روح کی یہ آواز کان لگا کر سن لیں کہ یہ چین یا

سکون و اطمینان (سوشلسٹک ڈھنگ سے) زندگی کی ضروریات کے بڑھنے (یا معاشی معیار کے بلند ہونے) سے نہیں بلکہ ان کی کمی سے حاصل ہو سکتا ہے گاندھی جی کے نزدیک جسمانی تشفی سے کہیں اہم و ضروری روحانی تشفی تھی اگر روح اور دماغی عناصر اپنی ضروری خوراک نہیں پاتے تو چاہے انسان کتنا ہی بڑا سرمایہ دار (حیوان) کیوں نہ ہو جائے اطمینان کی زندگی نہیں بسر کر سکتا [1]

اس اطمینان کی زندگی بسر نہ کر سکنے کا تازہ بتازہ ثبوت ملاحظہ ہو آج کل آخر دسمبر

---

[1] قوسین اور زیر خط راقم الحروف کے ہیں۔

(۱۹۵۵ء) ہمارے لکھنؤ میں کل ہند میڈیکل کانفرنس ہو رہی ہے اس کے خطبۂ صدارت میں بتلایا گیا ہے کہ ملک میں ذہنی و دماغی بیماریوں کی تعداد بڑھ رہی ہے سو میں ایک آدھ نہیں بلکہ ہر تین آدمیوں میں ایک دماغی طور پر کمزور ہے اور بمبئی کے کچھ کالجوں کا جائزہ لینے سے ثابت ہوا ہے کہ قریبًا ۱۳ فی صد طالب علم شدید اعصابی حالت میں مبتلا ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انگلستان میں ہر سال قریبًا چار ہزار طالب علموں میں سے پچاس تو بالکل پاگل ہی ہو جاتے ہیں اور اس پاگل پن کا بڑا سبب احساس کمتری ہے۔

اصل میں غور کرنے کے قابل یہی بڑا سبب ہے، ظاہر ہے کہ اس دین بیزار ترقی کے دور میں یہ احساس کمتری خدانخواستہ کسی دینی و روحانی یا اخلاقی کمتری کا احساس تو کیوں ہونے لگا، دنیاوی یا معاشی و مادی ترقیوں ہی میں آدمی اپنے کو کمتر پا کر پاگل بنا دینے والے احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور دنیاوی ترقیوں کا خلاصہ لے دے کر جاہ و مال اور اس کے ساز و سامان کے سوا کیا ہے لیکن اس محدود ناقص دنیا میں یہ ساز و سامان نہ کبھی اتنا محدود رہا ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے کہ ہر متنفس بلا کسی کمی و کمتری کے احساس کے دل کھول کر حوصلہ نکالتا ہے تو پھر اس راہ ترقی سے کسی اونچے سے اونچے بام ترقی پر پہنچکر بھی بجائے خود یا اوروں کے مقابلہ میں کمی و کمتری کے احساس کو دور ہی کیسے کیا جا سکتا ہے اور نہ اس جنوں خیز مقابلہ سے پیدا ہونے والے لازمی جنون اور پاگل پن ہی کی روز افزوں ترقی کو روکا جا سکتا ہے۔

معاشی اطمینان کی ایک ہی راہ اس پاگل بنانے والے احساس کمتری سے بچنے بچانے یا خود معاشی سکون و اطمینان حاصل ہونے کی راہ بھی ایک اور صرف

ایک ہے کہ معاش کی ہر اونچی نیچی سطح و معیار پر رہ کر نظر معاش سے زیادہ معاد پر ہو اور طلب ظاہر کے مادی ساز و سامان سے زیادہ باطن کے روحانی سکون و اطمینان یا دل کے سکھ چین کی ہو۔ اس سکھ چین کا تیر بہدف نسخہ وہی ہے جو اسلام کی کتاب خود قرآن مجید نے باصرار و بہ تکرار تجویز کیا ہے کہ:

"خوب یاد رکھو دل کا سکون و اطمینان اللہ کی یاد (یا تعلق ہی) سے نصیب ہوسکتا ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ؕ

اور جس نے اس یاد و تعلق سے روگردانی کی یاد رکھئے کہ وہ معاشی معیار کی کتنی ہی بلندی پر چڑھ جاتے اور مالی و جاہی ساز و سامان کی کتنی ہی فراخی و فراوانی حاصل کرلے لیکن دل و دماغ ھل من مزید کی جہنم ہی میں جلتا بھنتا اور تڑپتا ہی رہیگا مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا۔

اور یہ کسی کارل مارکس کے معاشی اشتراکی مساوات کا کبھی نہ پورا ہونے والا کوئی ہوائی و نظری فلسفہ نہیں، شاہ و گدا، سرمایہ دار و نادار جس فرد و متنفس کا جی چاہے اونچے سے اونچے اور نیچے سے نیچے معیار معاش کا رشتہ معاد سے اور اپنے دل کا خدا کی یاد سے تھوڑا بہت جتنا بھی ہوسکے جوڑ کر آزمالے کہ اتنا ہی وہ دل سکھ چین اور سکون و اطمینان سے آباد ہوجاتا ہے یا نہیں، اس دعوے کی سب سے بڑی عملی دلیل تو اس کی آزمائش ہی ہے باقی کچھ علمی و قلمی تفصیل اس سلسلہ تجدید کی دوسری کتاب "تجدید تصوف و سلوک"، خصوصاً اس کے باب حیات طیبہ میں کی جاچکی

اصل یہ ہے کہ ہر طرح کے فساد و شر و عصیان و طغیان آشوب و پریشانی کا سرچشمہ تو کفر و شرک ہے، ایمان و اسلام کی تو لفظی و معنوی حقیقت ہی امن و سلامتی کی راہ و روش ہے۔ آخرت و معاد ہی کا امن و عافیت ہی نہیں دنیا کی بھی معاشی و غیر معاشی، انفرادی و اجتماعی ظاہری و باطنی زندگی کے سکون کی واحد

راہ وضمانت بھی شرک کی گندگی سے پاک ایمانی واسلامی زندگی ہی ہے، مشرک ومومن دونوں جماعتوں میں امن وسلامتی کی زیادہ حقدار وہی جماعت ہے جس کے لوگوں نے ایمان کی زندگی اختیار کی اور اپنے ایمان کو شرک کے ظلم سے آلودہ نہ کیا انہیں کے حق میں امن کی ضمانت ہے اور وہی تو زندگی کی صحیح سیدھی راہ پر ہیں۔

اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ
اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ
اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

خلاصہ یہ کہ دنیا وآخرت میں سکون وسلامتی کی زندگی چاہتے ہو تو اسلام اور اس کی زندگی قبول واختیار کرو"

اَسْلِمْ تَسْلَمْ

تَمَّتْ بِالْخَیْرِ
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ